ماہنامہ

زندگی نو

نئی دہلی ۲



مدیر: سید جلال الدین عمری

معاون: سلطان احمد اصلاحی

ماہنامہ زندگی نو نئی دہلی

جلد ۷ * جولائی ۱۹۸۷ء مطابق ذی قعدہ، ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ * شمارہ ۱

فہرست مضامین

● سالانہ زر تعاون -/۵۵ روپے ● (بیرون ہند) -/۲۲۵ روپے انڈین ● فی شمارہ = 5/ روپے ●

سرخ نشان، علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لئے فوری زر سالانہ ارسال فرمائیں یا اگلا شمارہ کسی اطلاع کے نہ ملنے پر بذریعہ وی۔ پی ارسال کیا جائے گا۔

پرنٹر و پبلشر محمد حبیب اللہ قادری نے دعوت ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی جانب سے جمال پرنٹنگ پریس، جامع مسجد، دہلی ۶ میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ۔ زندگی نو ۱۵۲۵، سوئی والان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا گیا۔ فون: ۲۷۳۳۲۸ * ۲۶۵۳۱۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکمت دعوت[1]

(۲)

سید جلال الدین عمری

حکمت یہ ہے کہ دین کو محض دعویٰ کی شکل میں نہ پیش کیا جائے بلکہ اس کے حق میں معقول دلائل فراہم کئے جائیں اور آدمی کے ذہن وقلب کو مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے۔ دعوت اس طرح دی جائے کہ اللہ کا دین وقت کے افکار کے مقابلہ میں کم تر یا بے وزن نہ محسوس ہو بلکہ اس کی حیثیت ایک ارفع و اعلیٰ نظام فکر کی ہو۔ اس کے مقابلہ میں غیر علمی اور جذباتی رویہ تو اختیار کیا جا سکے لیکن دلائل کے ذریعہ اس کی مخالفت نہ کی جا سکے۔ دین کو یہ مقام اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ اس کی پشت پر دلائل کی زبردست قوت موجود ہو اور وہ اپنے وقت کے ایک بلند تر فکر کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔

قرآن مجید نے یہی طریقہ اختیار کیا۔ اس نے اللہ تعالیٰ کے دین کو علم اور عقل کی بنیاد پر ثابت کیا۔ وہ اس چیلنج کے ساتھ میدان میں آیا کہ حیات وکائنات کے بارے میں وہی تصور صحیح اور برحق ہے جو اس کے پاس ہے، اس کے سوا ہر نظریہ غلط اور باطل ہے۔ اس نے اپنے موقف کے حق میں اتنے مضبوط دلائل فراہم کئے کہ اس کی تردید نہیں کی جا سکتی تھی۔ اسی وجہ سے مخالف افکار کے قدم اکھڑ گئے اور اسلام کے لیے انھیں میدان خالی کرنا پڑا۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر جو مختلف زمانوں میں آتے رہے انھوں نے بھی اپنی قوم کو دلائل کے ذریعہ ہی اللہ کے دین پر مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کے دلائل اتنے مضبوط ہوتے تھے کہ مخالفین دل سے ان کی برتری ماننے پر مجبور ہوتے تھے، چاہے ان کی زبان اس کا اقرار نہ کرتی ہوں۔

قرآن مجید نے جن پیغمبروں کے حالات بیان کئے ہیں، ان میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی دعوتی سرگزشت زیادہ تفصیل سے بیان کی ہے۔ اس سے ان کی دعوت کا انداز، ان کی حکمت اور ان کے دلائل ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ یہاں ہم حضرت موسیٰ کے بعض دلائل کا ذکر یں گے۔

[1] سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو اشارات، زندگی نو، اپریل، مئی ۲۰۰۲ء (ادارہ)

حضرت موسیٰؑ کو منصب رسالت پر سرفراز کرنے کے بعد حکم ہوا کہ فرعون نے خدا سے بغاوت اور سرکشی کی راہ اختیار کر رکھی ہے، اسے اللہ کی طرف بلاؤ اور یہ حقیقت اس پر واضح کرو کہ اس کے لیے امن اور سلامتی کی راہ یہی ہے کہ وہ اللہ کی نازل کردہ ہدایت کو مان کر اپنی اصلاح اور تزکیہ کرلے ورنہ وہ اللہ کے عذاب سے بچ نہیں سکتا۔

حضرت موسیٰؑ نے (ان کے ساتھ ان کی معاونت کے لیے ان کے بھائی حضرت ہارونؑ بھی تھے) یہ باتیں ظاہر ہے بڑی حکمت اور دانائی کے ساتھ رکھی ہوں گی، لیکن یہ باتیں اتنی تلخ تھیں اور اس کے پندار پر ان سے اتنی زبردست چوٹ پڑ رہی تھی کہ اس پر ان کا شدید رد عمل ہوا۔ اس نے جھنجلا کر سوال کیا۔

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى (طٰہٰ: ۴۹) اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟

اسی دعوت کے ذیل میں دوسری جگہ ارشاد ہے۔

فَحَشَرَ فَنَادٰى ۝ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (نازعات: ۲۳-۲۴) اس نے لوگوں کو جمع کیا اور آواز لگائی کہ میں تمہارا رب اعلیٰ ہوں

حضرت موسیٰ سے اس سوال کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ تھا کہ ملک مصر کا رب تو میں ہوں آخر تمہارا وہ رب کون ہے جس کا پیغام پہنچانے تم میرے پاس آئے ہو؟ حضرت موسیٰؑ نے بہت ہی ٹھنڈے انداز میں جواب دیا۔

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (طٰہٰ: ۵۰) ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی اور اسے راستہ دکھایا

حضرت موسیٰ نے رب کی دو نمایاں صفات بیان کیں۔ ایک یہ کہ وہ اس کائنات کا خالق ہے۔ اسی نے ہر چیز کو وجود بخشا ہے۔ پھر یہ کہ اس نے کسی بھی چیز کو پیدا ہی نہیں کیا بلکہ اسے ہدایت بھی دی ہے۔ اس نے ایک ایک چیز کی صورت گری کی، مناسب جسمانی ساخت عطا کی اور اس کی جبلت میں یہ بات رکھ دی کہ اسے اس دنیا میں کس طرح زندگی گذارنی ہے۔ خشکی اور تری کی ہر چھوٹی بڑی مخلوق اسی ہدایت کی پابند ہے۔ اسی سے اس کی زندگی قائم ہے۔ خلق اور ہدایت دونوں میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہے۔ اس سے حضرت موسیٰؑ نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ جس خدا نے کائنات کو پیدا کرنے کے بعد اس کی ہر مخلوق کو ہدایت سے بھی نوازا ہے کیا وہ انسان کی ہدایت کا انتظام نہیں کرے گا اور اسے یوں ہی بھٹکنے کے لیے چھوڑ دے گا؟ یہ بات ناممکن ہے چنانچہ

اس نے اس وقت بھی ہدایت کا انتظام کیا ہے اور یہی ہدایت میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

آدمی جب حق کو قبول کرنا نہیں چاہتا تو عقل کی جگہ جذبات کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے۔ فرعون نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ اس نے پوچھا

فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی (طہٰ ۵۱)　　جو نسلیں پہلے گزر چکی ہیں ان کی پھر کیا حالت تھی؟

یعنی اگر تمہارا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کی ہدایت فرماتا ہے اور نجات اسی کو ملے گی جو اس ہدایت کے مطابق عمل کرے، تو بتاؤ کہ جو لوگ پہلے گزر چکے ہیں ان کا کیا حشر ہوگا؟ کیا وہ سب گمراہ تھے، کیا وہ سب جہنم میں جائیں گے؟

اس سوال کے ذریعہ وہ حضرت موسیٰؑ کو ایک جذباتی مسئلہ میں الجھا کر اپنی قوم اور درباریوں کے جذبات ان کے خلاف بھڑکانا چاہتا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے بڑے حکیمانہ طریقہ سے اس کا جواب دیا۔

عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی (طہٰ ۵۲)　　اس کا علم میرے رب کے پاس ایک کتاب میں محفوظ ہے۔ میرا رب نہ تو غلطی کرتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔

مطلب یہ کہ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کیا معاملہ کرے گا اس کا مجھے علم نہیں ہے۔ میں نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ میں غیب کے حالات سے باخبر ہوں۔ البتہ اتنی بات میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ اس دنیا سے جا چکے ہیں ان کے تمام اعمال کا ریکارڈ اللہ تعالیٰ کے پاس موجود ہے، کسی کی کوئی حرکت اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے، اس سے نہ تو کسی غلطی کا صدور ممکن ہے اور نہ نسیان اور فراموشی اسے لاحق ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ اپنے علم کے مطابق ان کے بارے میں فیصلہ کرے گا۔

یہ سورہ طٰہٰ کی آیات ہیں۔ اس سلسلہ کی بعض تفصیلات سورۂ شعراء میں بھی ملتی ہیں۔ فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے پوچھا۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (شعراء ۲۳)　　اور یہ رب العالمین کیا ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے انتہائی سنجیدگی اور متانت اور پوری بے خوفی کے ساتھ جواب دیا۔

قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ ۝ (شعراء ۲۴)　　آسمانوں اور زمین کا رب اور ان سب چیزوں کا رب جو ان کے درمیان میں ہیں اگر تم یقین کرنے والے ہو۔

یعنی رب العالمین وہ ہے جس نے زمین و آسمان کو وجود دیا اور جو انھیں ایک خاص نظام کے

تحت چلا رہا ہے۔ ذرہ سے لے کر آفتاب تک یہاں کی ہر چیز اس کی پابند ہے۔ یہ اس کی سراسر رحمت ہے کہ وہ اس نظام کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ اس کی رحمت کے مظاہرے پوری کائنات میں ہر طرف دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کی یہ رحمت نہ ہو تو یہ زمین و آسمان باہم ٹکرا کر ختم ہو جائیں۔

اس دلیل کا فرعون کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ خود زمین و آسمان کا رب ہے اور ان کا نظام اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے اس نے آپ کا مذاق اڑانا چاہا گویا کہ آپ نعوذ باللہ، غیر دانشمندانہ بات کر رہے ہیں۔

قَالَ لِمَنْ حَوْلَهُ أَلَا تَسْتَمِعُونَ (شعراء: ۲۵) اس نے اپنے درباریوں سے کہا: سنتے ہو؟

حضرت موسیٰؑ نے اس مذاق کا کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے دعویٰ کی وضاحت کے لیے زیادہ قریب کی مثال پیش کی۔ فرمایا۔

قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ (الشعراء ۲۶) تمہارا رب بھی اور تمہارے ان آباء و اجداد کا رب بھی جو گزر چکے ہیں۔

مطلب یہ کہ اس کائنات ہی کا نہیں بلکہ خود تمہارا اور تمہارے بزرگوں کا وجود بھی اسی کی ربوبیت کا مظہر ہے۔ وہی ہے جس نے تمہیں وجود دیا۔ وہی تمہاری پرورش کرتا ہے، بچپن، جوانی اور بڑھاپے کے مراحل سے گزرتا ہے اور زندگی کے آخری لمحہ تک سامان زیست عطا کرتا ہے۔

فرعون بے دلیل ہوتا چلا گیا، اعتراف شکست کی جگہ بدزبانی کا مظاہرہ کرنے لگا۔ کہا:

قَالَ إِنَّ رَسُولَكُمُ الَّذِي أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ (الشعراء: ۲۷) بے شک تمہارا یہ رسول جو تمہارے پاس بھیجا گیا ہے بالکل ہی پاگل ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے اس بدزبانی کا کوئی نوٹس نہیں لیا بلکہ اپنی دلیل کی مزید وضاحت کی۔ فرمایا۔

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ (الشعراء: ۲۸) مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب اگر تم عقل سے کام لو۔

یعنی رب وہ ہے جس کے قبضہ میں مشرق و مغرب اور پورا نظام شمسی ہے اور یہ سورج اور چاند جس کے حکم کے پابند ہیں۔ یہ فرعون کے اس دعویٰ کی بھی تردید تھی کہ وہ سورج دیوتا کا اوتار ہے مطلب یہ کہ سورج کو بھی رب کا مقام حاصل نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ بھی اسی کی اطاعت کر رہا ہے۔ رب وہ ہے جس کا حکم پوری کائنات پر چل رہا ہے۔

فرعون غصہ سے بے قابو ہو گیا۔ اس نے دھمکی دی۔

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِیْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ (الشعراء: ۲۹)

اگر تم نے میرے سوا کسی کو معبود بنایا تو تجھے بھی ان لوگوں میں شامل کر دوں گا جو قید خانوں میں پڑے سڑ رہے ہیں۔

گویا فرعون کی طرف سے اس بات کا اعلان تھا کہ وہ حضرت موسیٰؑ کے دلائل سے شکست کھا چکا ہے۔ اب وہ ان کا مقابلہ طاقت سے کرے گا اور حضرت موسیٰؑ کو جیل کی چہار دیواری میں بند کرکے ان کی آواز کو بلند ہونے نہ دے گا۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر دلائل کی کتنی زبردست قوت سے مخالف افکار پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ وہ مخالفین کو اس طرح بے دلیل کر دیتے ہیں کہ انھیں اپنے موقف پر جمے رہنے کے لیے کوئی جواز باقی نہیں رہتا اور بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ وہ ذاتی مفادات کے لیے لڑ رہے ہیں اور طاقت کا سہارا لینے پر مجبور ہیں۔

دعوت مستحکم دلائل کے ساتھ دی جاتی ہے۔ اس کے بغیر نہ تو وہ مخاطب کے لیے آسانی سے قابل قبول ہوگی اور نہ اس پر حجت تمام کی جا سکے گی۔

دعوت میں مخاطب کی آمادگی کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ اگر مخاطب ذہنی طور پر بات سننے اور سمجھنے کے لیے آمادہ نہیں ہے تو اس وقت اس سے بات کرنا بے سود ہے۔ اس سلسلے میں قرآن مجید نے ہدایت کی ہے کہ جس مجلس میں دعوت تمسخر اور استہزاء کا موضوع بن جائے اور لوگ سنجیدگی کا دامن چھوڑ چکے ہوں تو داعی کو ان سے الجھنے کی جگہ اس مجلس سے اٹھ جانا چاہئے اور گفتگو کے لئے مناسب موقع تلاش کرنا چاہیے

وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِیْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِیْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ؕ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ (انعام: ۶۸-۶۹)

جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیتوں پر نکتہ چینی کر رہے ہیں تو ان سے کنارہ کشی اختیار کر لو یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں لگ جائیں اور اگر شیطان تمہیں بھلاوے میں ڈال دے تو یاد آنے کے بعد ظالموں کے ساتھ مت بیٹھو۔ اور جو لوگ تقویٰ اختیار کریں ان پر ان کافروں کے حساب میں سے کسی چیز کی ذمہ داری نہیں ہے البتہ ان کے ذمہ نصیحت کرنا ہے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔

اس ہدایت کی یاد دہانی ایک دوسری جگہ ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا (النساء: ۱۴۰)

اللہ تعالیٰ اس کتاب میں پہلے بھی یہ حکم نازل کر چکا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیتوں کے خلاف کفر بکا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو ایسے لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں لگ جائیں ورنہ تم بھی انھیں کی طرح ہو گے بے شک اللہ تعالیٰ منافقوں اور کافروں کو ایک ساتھ جہنم میں داخل کرنے والا ہے۔

ان آیات میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ جو لوگ دین کے مخالف ہیں یا اس کا استہزاء کرتے ہیں انھیں سرے سے دعوت نہ دی جائے بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ جس وقت ان کے اندر استہزا کی کیفیت ہو اور دین کے بارے میں سنجیدگی سے سننے اور سمجھنے کے لیے آمادہ نہ ہوں اس وقت گفتگو سے احتراز کیا جائے لیکن جب مخاطب کے اندر آمادگی محسوس ہو تو داعی کو اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہئے۔ ایک ہوشیار کسان اس وقت کو ضائع نہیں کرے گا جب زمین کاشت کے لیے تیار ہو اور اس میں تخم ریزی کی جا سکے۔ اس کی ایک عمدہ مثال حضرت یوسف علیہ السلام کے اسوہ میں ہمیں ملتی ہے۔ حضرت یوسفؑ کو جب قید خانہ میں رکھا گیا تو ان کے ساتھ دو نوجوان بھی کسی جرم میں گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیئے گئے۔ حضرت یوسف کی سیرت و کردار کو دیکھ کر ان کے اندر یہ حسن ظن پیدا ہو گیا کہ وہ ایک نیک آدمی ہیں۔ اسی اثنا میں وہ خواب دیکھتے ہیں اور ان کی تعبیر ان سے پوچھتے ہیں۔ ان کے اس رجحان سے فائدہ اٹھا کر حضرت یوسف فرماتے ہیں۔

لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا (یوسف: ۳۷)

جو کھانا تمہیں ملا کرتا ہے اس کے آنے سے پہلے تمہیں ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔

اسی ذیل میں توحید اور سلسلۂ رسالت کا اس طرح ذکر کرتے ہیں جیسے بات میں سے بات فطری طور پر نکلتی چلی آئی ہو۔

ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ

یہ ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کئے ہیں۔ میں نے ان لوگوں کا دین چھوڑ دیا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کا انکار کرتے

إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ مَا كَانَ لَنَا أَنْ نُشْرِكَ بِاللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ذَٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ۝

(یوسف: ۳۸۔۳۷)

ہیں۔ اور میں نے پیروی کی باپ دادا ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے دین کی ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر بھی اور سارے انسانوں پر بھی لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

پھر اس کے بعد توحید کا درس دیتے ہیں اور اس کے حق میں بہت ہی موثر دلائل فراہم کرتے ہیں:

يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝

یوسف: ۴۰۔۳۹)

اے قید کے ساتھیو! بتاؤ کیا بہت سے متفرق خدا بہتر ہیں یا اللہ جو اکیلا ہے اور سب پر غالب ہے، اسے چھوڑ کر تم جن کی عبادت کرتے ہو وہ تو چند نام ہیں جو تم نے رکھ لیے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادا نے۔ اللہ نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری۔ فرماں روائی نہیں ہے کسی کی سوائے اللہ کے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ تم صرف اسی کی عبادت کرو۔ یہی سیدھا سچا طریقہ ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

یہ دراصل مخاطب کی آمادگی سے فائدہ اٹھانا ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انبیاء کرام کی گفتگو کتنی جامع ہوتی ہے اور وہ مخاطب کو مطمئن کرنے کی کتنی بلیغ کوشش کرتے ہیں

مقالات:

عالمی سطح پر فکری تبدیلیاں

مولانا انعام الرحمن خاں*

یہ بات ہر سوچنے والا آدمی جانتا ہے کہ انسان کے اور انسانی قافلہ کے سفر کا رخ اس کا فکر متعین کرتا ہے۔ اور انسان کو اور انسانی قافلہ کو چلانے والی حرکت اس کے ارادوں اور جذبہ سے پیدا ہوتی ہے جو اس کے فکر سے پیدا ہوتا ہے یا اس کا تابع ہوتا ہے۔ انسان پہلے سوچتا ہے پھر ارادہ کرتا ہے اس کے بعد چلتا یا عمل کرتا ہے۔ تمثیل کے پیرائے میں اسے یوں سمجھنا چاہیئے کہ فکر کا عمل یہ ہے کہ منزل کا تعین کرے اور سفر کا رخ بتائے۔ علم کا کام جو بالعموم اس فکر کے زیر اثر ہوتا ہے یہ ہے کہ پٹری بچھائے اور انجن تیار کرکے اسے پٹری پر کھڑا کر دے۔ اور جذبہ جو اس فکر و عمل سے پیدا ہوتا ہے اس انجن کو اسی پٹری پر چلاتا ہے۔ یعنی اسٹیم کا کام کرتا ہے۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر زمانہ میں ایک فکر غالب و محیط ہوتا ہے۔ جسے ام الافکار اور ام الاعمال کہنا چاہیے/۔ جو اپنے وقت کے علوم و افکار کو' معیار و اقدار کو' اخلاق و کردار کو غرض یہ کہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو اپنے سایہ میں لے لیتا ہے دوسرے الفاظ میں وقت کا فکری دھارا انسان سے متعلق ہر چیز کو اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔

اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ افکار کی دنیا میں بھی عمل اور ردعمل کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور فکری دھارا اپنا رخ بدلتا رہتا ہے۔ یہاں ہیگل والی افکار و تصورات کی کشمکش کا ذکر نہیں ہے۔ اس وقت تو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ فکری دھارا ادلتا بدلتا رہتا ہے اور انسان کی پوری زندگی وقت کے اس دھارے کے اثر میں آجاتی ہے۔ یہ تبدیلی کیوں کر ہوتی ہے؟ آیا ہیگل کا "خیال مطلق" یا "جان جہاں" خود اپنی ذات کی تکمیل کے لئے افکار و تصورات کے درمیان یہ کشمکش کرا رہا ہے یا کیا بات ہے۔ اور یہ کہ مارکس کے مطابق وقت کے معاشی تقاضے افکار و تصورات کو

• امیر حلقہ مدھیہ پردیش جماعت اسلامی ہند۔

اور معیار و اقدار کو اپنے سانچے میں ڈھاتے رہتے ہیں۔ یا یہ کسی اور طرح پیدا ہونے والے فکر کی طاقت ہے جو دوسری چیزوں کی طرح معاشی سانچے بھی اپنے مزاج کے مطابق ڈھالتی ہی ہے۔ ان بحثوں کی یہاں گنجائش نہیں۔ یہاں تو بس یہ صاف نظر آنے والی چیز دیکھنا ہے کہ ہر زمانے میں ایک فکر غالب ہوتا ہے جس کی قہرمانی انسان کی ہر چیز کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

کسی زمانہ میں یونان کی تہذیب اور اس کے افکار کو غالب کا مقام حاصل تھا۔ اس وقت کی معلوم دنیا پر اس کے فکر و عمل کی چھاپ تھی۔ یونانی فلسفہ کو وہ برتری حاصل تھی کہ دلیل اسی کے فلسفہ سے لائی جاتی تھی اور صحیح کا معیار وہی تھا یہی حال رومی تہذیب کا اس کے عروج کے زمانہ میں رہا۔ جو طریقہ اس کی پیروی کرتے ہوئے اختیار کیا جاتا اسی کو ترقی یافتہ طریقہ سمجھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ مسیحیت جب وہاں پہنچی تو وہ بھی کچھ مخصوص تحفظات کے ساتھ اس رنگ میں رنگ گئی۔

پھر اسلام کا آخری ایڈیشن قرآن کے نام سے اور اس کا عملی نمونہ سنت رسول کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اور اسلام کے اولین خادموں نے سرزمین عرب سے نکل کر دنیا کے بہت بڑے حصہ میں اسے متعارف کرایا۔ اور اس یلغار میں شعوری فکر و کردار کے وہ نمونے دنیا کے سامنے آئے جو عقیدہ توحید اور قرآنی فکر سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس وقت کی دنیا کا اجتماعی ضمیر گویا ان کا منتظر تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دین و اخلاق میں، قانون و انصاف میں، معاشرت و معیشت میں، آئین و سیاست میں اور ایسے ہی دوسرے معاملات میں ان بنیادی تصورات کی چولیں ہل گئیں جن پر اس وقت کی پوری عمارت قائم تھی۔ بعض قومیں اسلام کی مخالف اور مسلمانوں سے برسرپیکار تو رہیں لیکن انہوں نے بھی اسلامی فکر کی عظمت و بلندی کو مانا اور غیر شعوری طور پر ہی سہی اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ عورت کا مقام ہو یا غلامی کا مسئلہ۔ آئین حکمرانی ہو یا ہیئت حاکمہ۔ تجارت کے اصول ہوں یا عدل و انصاف کے تقاضے۔ اخلاقی قدریں ہوں یا معاشرتی ضوابط۔ فکر و ضمیر کی آزادی ہو یا اختلاف رائے کے حدود۔ عبادات کی اہمیت ہو یا ذہن و فکر کا استعمال۔ غرض کہ یہ اور ایسے تمام بنیادی امور میں ذہنوں نے اسلام کی پیش کردہ قدروں کا اثر قبول کیا۔ اور افکار کی گاڑی غیر ارادی طور پر اسی رخ پر چلنے لگی جو رخ اسلام نے دیا تھا۔ اسلام نے کیسا فکری انقلاب پیدا کیا؟ اس بات کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے مذہب اور مذہبی تصور کو دیکھئے۔

"آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دنیا میں مذہب کا عام تصور یہ تھا کہ زندگی

کے بہت سے شعبوں میں سے یہ بھی ایک شعبہ ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ انسان کی دنیوی زندگی کے ساتھ ایک ضمیمہ کی حیثیت رکھتا ہے تاکہ بعد کی زندگی میں نجات کے لئے ایک سرٹیفکٹ کے طور پر کام آئے۔ اس کا تعلق صرف اس رشتہ سے ہے جو انسان اور اس کے معبود کے درمیان ہے۔ جس شخص کو نجات کے بلند مرتبے حاصل کرنے ہوں اس کے لئے تو ضروری ہے کہ دنیوی زندگی کے تمام دوسرے شعبوں سے بے تعلق ہو کر صرف اس ایک شعبہ کا ہو جائے۔ مگر جس کو اتنے بڑے مراتب مطلوب نہ ہوں محض نجات مطلوب ہو اور اس کے ساتھ یہ خواہش بھی ہو کہ معبود ان پر نظر عنایت رکھے اور ان کو دنیوی معاملات میں برکت عطا کرتا رہے اس کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ اپنی دنیوی زندگی کے ساتھ اس ضمیمہ کو بھی لگائے رکھے۔ دنیا کے کام اپنے ڈھنگ پر چلتے رہیں اور ان کے ساتھ چند مذہبی رسول کو ادا کرکے معبود کو بھی خوش کیا جاتا رہے۔ انسان کا تعلق خود اپنے نفس سے، اپنے ابنائے نوع سے اور ساری دنیا سے ایک الگ چیز ہے اور اس کا تعلق اپنے معبود سے ایک دوسری چیز"

مذہب کے اس تصور نے عملی طور پر کیا آفت ڈھائی ہے۔ اس نے بندہ اور خدا کے درمیان کتنے پردے ذریعہ و وسیلہ جیسے ناموں سے ڈال دیے۔ اور اس کے پیٹ سے مذہبی القاب کے ساتھ کتنی جونکیں پیدا ہوئیں جنھوں نے مدتوں انسانوں کا خون چوسا۔ یہ ایک علیحدہ موضوع ہے۔ یہاں تو صرف اتنا جان لیجئے کہ یہ تھا ساتویں صدی عیسوی تک مذہب کا تصور۔ مگر اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عقلی و فکری تصور پیش کیا" آپ نے بتایا کہ مذہب قطعاً بے معنی ہے اگر وہ انسانی زندگی کا محض ایک شعبہ یا ضمیمہ رہے۔ ایسی چیز کو دین و مذہب کے نام سے موسوم کرنا ہی غلط ہے۔ حقیقت میں دین وہ ہے جو زندگی کا ایک جز نہیں بلکہ تمام زندگی ہو۔ زندگی کی روح اور اس کی قوت محرکہ ہو۔ فہم و شعور اور فکر و نظر ہو۔ صحیح اور غلط میں امتیاز کرنے والی کسوٹی ہو۔ زندگی کے ہر میدان میں ہر ہر قدم پر سیدھے راستے اور ٹیڑھے راستوں کے درمیان فرق کرکے دکھائے۔ اور راہ راست پر استقامت و پیش قدمی کی طاقت بخشے۔ اور زندگی کے اس لامتناہی سفر میں جو دنیا سے لے کر آخرت تک مسلسل جا رہا ہے انسان کو ہر مرحلہ میں کامیابی و سعادت کے ساتھ گذار دے"۔

مذہب کی دنیا میں یہ ایک انقلابی تصور تھا۔ لیکن افسوس کہ عملی طور پر یہ تصور زیادہ عرصہ تک اپنی صحیح شکل میں باقی نہیں رہ سکا۔ اگرچہ دنیائے انسانیت اس تصور سے متاثر ہوئی

تھی اور کسی نہ کسی شکل میں اسے اپنانے پر بھی آمادہ تھی لیکن خود اسلامی معاشرہ میں جاہلیت کے خمیر سے بنے ہوئے دماغوں نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا ساتھ ہی مشیت ایزدی سے کچھ واقعات ایسے پیش آئے کہ دین و دنیا کی تقسیم کے پرانے جاہلی تصور کو اسلامی معاشرے میں دبے پاؤں گھس آنے کا موقع مل گیا۔ اگرچہ ذہنوں میں اور بہت بڑی حد تک انفرادی عمل میں بھی مذہب کا وہی جامع تصور کارفرما رہا جو اسلام نے عطا کیا تھا۔ بلکہ حکمراں طبقہ میں بھی اس کے جلوے نظر آتے رہے۔ لیکن حکومت کی سطح پر ایسی تبدیلیاں آئیں جس کے نتیجہ میں بلا ارادہ بلکہ مذہبی اکابر کی خواہش کے علی الرغم اس طرح کے دائرے بن گئے۔ ایک حکومت وسیاست کا دائرہ اور دوسرے دین علم وفکر اور اسلامی تربیت کے دائرے ان دینی دائروں نے یہ کارنامہ بھی انجام دیا کہ حکومت کی مدد کے بغیر بلکہ اس کی مزاحمت کے باوجود دینی تعلیمات واحکام کو ایک مرتب دستوری شکل میں مدون کر دیا۔ جو اس وقت تک نصوص و روایات کی شکل میں کام کر رہے تھے۔ البتہ مجتہدین کی یہ خدمت تاریخ کا ایسا حیرت انگیز کارنامہ ہے جس کی مثال شاید نہ ملے ہدایت الٰہی کی اساس پر بنا ہوا یہ قانون حکومت کی طاقت کے بغیر امت کے دلوں میں گھر کر گیا۔ اور بعد میں ہزار بارہ سو سال تک یہی آئین امت مسلمہ پر ایسی حکومت کرتا رہا کہ وہ جابر حکمراں بھی جو اپنی فطرت کے اعتبار سے آزاد منش تھے اجتماعی اصول وامور میں اس کی گرفت سے اتنے آزاد نہیں ہو سکے کہ بالکل اپنی من مانی کر سکتے۔ دوسری طرف اسی دینی تعلیم وتربیت نے ایسے اکابر رجال کو جنم دیا جن کے مقابلہ میں کم ہی شخصیتوں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اور قرآنی افکار واقدار پر قائم شدہ اس تہذیب نے دنیا کو یہ حیرت انگیز اعجوبہ دکھایا کہ اسی تہذیب کے علمبرداروں کو اور ان کے ملکوں کو تاتاریوں کے مردم خور سیلاب نے تہ و بالا تو کر دیا لیکن یہی غالب قوم اپنی مفتوح قوم کی تہذیب سے مسخر ہو گئی اور " پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانوں سے "۔

یہ باتیں " ہم نے پتنگ اڑائی ایرو پلین سے پہلے " جیسی افیون کی گولیاں نہیں ہیں۔ خود یورپ کے منصف مزاج مصنفین و مفکرین نے بھی بیان کیا ہے کہ یورپ کو صدیوں کی گہری نیند سے بیدار کرنے میں اسپین کے مسلم مفکرین اور ان کے علوم وافکار کا بڑا ہاتھ ہے۔

یہ سب کچھ تو ہوا لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ حکومتوں کی غیر فطری تبدیلیوں کے نتیجہ میں ایسے حکمراں آتے رہے جو ملک گیری و حکمرانی کی صلاحیتوں سے تو مالا مال تھے۔ لیکن دینی بصیرت اور تقویٰ و

طہارت کے اعتبار سے ان کا مقام یہ نہیں تھا کہ امت کے دلوں پر اپنی قیادت و امامت کا سکہ بٹھا کر دین اور سیاست دونوں کو ایک ہی مرکز سے وابستہ رکھ سکتے۔ تاکہ اس کا نظم انسان سازی کی وہ مشین بنا رہتا جس میں سے ڈھل ڈھل کر ایسے انسان نکلتے رہتے جو دنیا پر ابر رحمت کی طرح چھائے رہتے اور دنیا والوں پر باران رحمت برستی رہتی۔ غالبًا وہ حکمران اپنی حیثیت کو خود بھی سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے دین داروں کو استعمال کرنے کی چاہے کوشش کی ہو۔ لیکن ان کے دائرے میں مجتہد بن کر قدم رکھنے کی جرأت کبھی نہیں کی۔

اس صورت حال کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ مستقل طور پر دینی دائرے علیحدہ اور سیاسی دائرے علیحدہ ہو گئے۔ اور دونوں ادارے جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے ویسے ہی ویسے دور سے دور تر ہوتے چلے گئے۔ اگرچہ ان دونوں دائروں نے ایک دوسرے پر اثر ڈالا بھی اور اثر قبول بھی کیا۔ اور ذہنی طور پر دونوں اداروں نے دین و دنیا کی تقسیم کو نہ مانا ہو لیکن عمل کی دنیا میں دین الگ ہو گیا اور دنیا الگ۔ دین دینداروں کے لئے اور دنیا دنیاداروں کے لئے مخصوص ہو گئے۔ عمل کی دنیا اگر ذہن و فکر کے مطابق نہ ہو تو یہ صورت حال زیادہ دن باقی نہیں رہتی غیر شعوری طور پر ذہن و فکر بھی عملی شکل کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہی کچھ یہاں بھی ہوا۔ ہوتے ہوتے زوال کے بعد تو اس صورت حال کو یعنی دین و دنیا کی تفریق کو بالعموم ذہن و فکر نے بھی معقول مان لیا۔

حکمرانوں میں بعض بادشاہ ضرور متقی و پرہیزگار پیدا ہوئے۔ اور انہوں نے حکومت بھی حتی الامکان ذمہ دارانہ کی لیکن بیشتر بادشاہوں کا حال یہ رہا کہ ایک طرف تو خوشامدی علماء نے یہ تصور پیدا کیا یا ان سے کرایا گیا کہ بادشاہ اگرچہ خدا تو نہیں مگر خدا کا سایہ ضرور ہے۔ الله نہیں ظل اللہ ہے۔ اس لئے اس ظل اللہ کی اطاعت بے چون و چرا ہونی چاہیئے چنانچہ کہا گیا۔

؎ اگر شہ روز را گوید شب است ایں بباید گفت اینک ماہ و پروین۔

یعنی بادشاہ دن کو رات کہے تو کہنا چاہیئے کہ جی ہاں چاند اور تارے نظر آ رہے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا کہ ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کا مقام حاصل کرے۔ اگرچہ بعض قوی الایمان بزرگوں نے سلطان جائر کے سامنے کلمہ حق کہنے کی سعادت پائی۔ اور کبھی کبھی وقتی طور پر اس کا کچھ نہ کچھ اثر ہوا بھی۔ لیکن عام حالت یہی رہی کہ "کون سنتا

ہے فغان درویش" بہرحال اس صورت حال میں ہونا یہی تھا کہ حکمراں اقتدار کے نشہ میں مست ہو کر عیش عشرت میں ڈوب جائیں اور اقتدار کی دیوی پر ہر قیمتی متاع کو بھینٹ چڑھا دیں۔ اس طرح جب اقتدار کا چسکہ لگ گیا تو وہ خلق خدا کو اپنا غلام بناتے بناتے خود خواہش اقتدار کے غلام بن گئے۔ اور اقتدار کے نشہ میں سرشار ہو کر دین سے دور ہوتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ بعض نے تو اس کی خاطر اپنا ایک نیا دین بھی گھر ڈالا۔ البتہ کچھ بادشاہ وقتاً فوقتاً ایسے بھی آئے جنہوں نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے ذریعہ فتوحات بھی کیں اور اندرونی نظم کو بہتر طور پر قائم کر کے اپنی حکومت کے جلال و جبروت کا سکہ بٹھا دیا۔ اس سے اسلام کا بھی کچھ بھرم قائم رہا اور مسلمانوں کا بھی۔ لیکن بعد کے زوال و انحطاط کے دور میں تو بعض بادشاہ اس طرح غلفت میں کھوئے رہے کہ جب انہیں اطلاع دی گئی کہ دشمن بڑھتا ہوا پایہ تخت کے قریب آ گیا ہے تو انہوں نے جواب دیا" این دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ"

دوسری جانب دینی امامت کا معاملہ یہ رہا کہ کبھی سیاسی قیادت سے مسلح تصادم کی شکل میں اور کبھی اس کے بغیر برابر کوشش ہوتی رہی کہ دین و دنیا کی عملی تقسیم ختم ہو اور دینی سیادت و دنیوی قیادت یکجا ہوں تاکہ اسلام کا منشا پورا ہو اور دنیا والے اس کی برکات سے شاد کام ہو سکیں لیکن یہ کوششیں کافی خون اور کافی صلاحتیں وصول کر کے بھی کامیاب نہیں ہوئیں۔ کیوں نہیں ہوئیں؟ یہ ایک علیحدہ سوال ہے۔ یہاں تو بس یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ ان ناکامیوں نے دینی حلقوں پر بہت خراب اثر ڈالا۔ ایک تو مایوسی کی کیفیت پیدا ہوئی۔ دوسرے آرام طلب عناصر نے بعض خوشنما تاویلات کے سایہ میں پناہ لے لی پھر اتفاق سے اسی زمانہ میں یونانی علوم مسلمانوں میں در آئے۔ جنہوں نے اسلام کے سادہ اور دل نشیں عقائد کو فلسفہ کی پیچ در پیچ گتھیوں میں الجھا دیا۔ اگرچہ مسلمان علماء نے ان فلسفوں کا مقابلہ انہیں علوم کے ہتھیاروں سے کیا جس سے ایک مستقل علم کلام وجود میں آگیا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ قیاسی علم سے بنے ہوئے پائے بے چوبیں۔ یقینی علم سے پیدا ہونے والے یقین کو ہلا کر یکسوئی کو منتشر کر دیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ حرب عقائد کا ہنگامہ کھڑا ہوا اور ایک کلمہ پر جمع ہونے والی امت بہت سے فرقوں میں بٹ گئی۔ ان فرقوں کے علماء کی ذہنی صلاحیتیں اور عوام کی عملی طاقتیں باہم دست و گریبان رہنے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششوں میں لگ گئیں۔ اب ان کے پاس اتنا وقت ہی نہیں رہا کہ اپنے اصل

کام کی طرف توجہ دیں اور اپنے دین کو کار فرما طاقت بنانے کی کوشش کریں۔ بادشاہوں اور امرا کی اکثریت دنیا میں غرق ہو کر اپنی من مانی کرنے کے نتیجہ میں امت کے سواد اعظم کی نظروں سے گر چکی تھی اس لیے جو لوگ بھی درباروں سے وابستہ ہوتے وہ اپنا اعتبار کھو دیتے تھے۔ اس صورت حال نے امت میں ترک دنیا اور رہبانیت کے جراثیم کو اپنا کام کرنے کا موقعہ دیا۔ ساتھ ہی تزکیہ اور ایمان بالشہود اور مشاہدہ حق اور سیر مقامات وغیرہ کی طلب میں دوسری قوموں کے جاہلیت زدہ تصورات اور طریقے غیب پر ایمان رکھنے والے مسلمانوں میں گھس آئے۔ اور نہایت مقدس و دل آویز ناموں سے ترک لذات کی لذت میں گم کر دینے والے اشغال میں جب عملی جدوجہد پر جان دینے والے مسلمان مشغول ہو گئے تو فکر و عمل کی دنیا ہی بدل گئی۔ تزکیۂ نفس کا تصور اور نقشہ ہی کچھ اور بن گیا۔ "سیروا فی الارض" کی تعمیل تصوراتی سیر کی شکل میں کی جانے لگی۔ قرآن کے عملی معجزہ پر ایمان رکھنے والے عجائب کی دنیا میں کھو گئے۔ اگرچہ خود انہی کے ذمہ دار بزرگ روکتے رہے مگر کشوف و کرامات کی مدد سے ایک نئی متھیالوجی تیار ہو گئی۔ جو ہر طرح دوسروں کی متھیالوجی سے لگا کھا سکتی ہے۔ بلاشبہ اس دور میں اور انہی حلقوں میں ایسے ایسے نفوس زکیہ پیدا ہوئے جن پر ہم بجا طور پر فخر کرتے ہیں لیکن یہ بلند و بالا شخصیتیں بھی لوگوں کو اس مقام پر جانے سے نہیں روک سکیں کہ وہ بھی گھوڑے کی طرح زیربار چلنے کے بجائے جنازہ کی طرح کاندھوں پر چلنے لگے۔ اور یہ عظیم بزرگ ہی نہیں۔ امت میں ہمیشہ ایک گروہ ایسا رہا جو حق پر قائم رہتے ہوئے اسے سربلند کرنے کی دھن میں لگا رہا۔ مگر امت کی اکثریت کا حال یہ ہو گیا تھا کہ وہ سعادت و خلافت کے زمانے کی ہر نقل و حرکت کو مبہوت ہو کر سنتے تھے مگر اس پر عمل کرنے کا ارادہ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس زمانے میں جو کچھ ہوا وہ فرشتوں کی مدد سے ہوا۔ اس لیے اب جبکہ فرشتے نہیں آئیں گے کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ "مردے از غیب" کی آمد کے منتظر تھے۔ اور انہوں نے خندقیں کھودنے اور قلعے بنانے کے بجائے خانقاہیں بنانا شروع کر دیا۔ اور حال و قال کی مجلسوں ہی میں اپنی نجات دیکھنے لگے۔ ان کے علماء و حکماء نے احتساب کائنات کی جدوجہد چھوڑ کر پرانی کتابوں پر حاشیے چڑھانے ہی کو کمال علم سمجھ لیا۔ اور اجتہاد کا دروازہ اپنے ہاتھ سے بند کر دیا۔

اسی طرح جب سلاطین و امرا میں روح جہاد غائب ہو گئی اور علماء و حکماء کے اندر اجتہاد کی گرمی سرد پڑ گئی تو وہ دنیا کی فکری امامت اور عملی سیاست سے گویا خود دست بردار ہو گئے۔ اس کے

بعد سنت اللہ کے مطابق کسی نہ کسی کو تو اس مقام پر آنا ہی تھا۔ چنانچہ یورپ اٹھا اور نئی ذہنی توانائی اور عملی طاقت سے کام لے کر فکری امامت اور سیاسی قیادت کی خالی مسند پر قابض ہوگیا پاپائے اعظم کے ماتحت مقدس سلطنت روما کا قیام دراصل مذہب و سیاست کو یکجا کرنے کی اسی جدوجہد کا اثر تھا جس کی آواز داعی اسلام نے بلند کی تھی۔ مگر یورپ بادشاہت کے ادارے کو ختم نہیں کرسکا اور اس سے سمجھوتہ کرلینے پر اکتفا کیا۔ مگر ساتھ ہی اس پر اپنا تسلط رکھنا بھی ضروری سمجھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برابر کی طاقت کے دو ادارے باہم متصادم رہنے لگے۔ کبھی ایک کا پلہ بھاری رہا کبھی دوسرے کا۔ اس لئے کہنا چاہیئے کہ آٹھویں صدی سے لے کر سولہویں سترھویں صدی تک کے یورپ کی تاریخ پاپائیت کے تصادم کی داستان ہے۔

اسی عرصہ میں یورپ کے ذہن و فکر کے بند کھولنے میں دو چیزوں نے بڑا کام کیا۔ ایک تو اسپین کے راستہ سے اسلامی علوم و افکار کے اثرات یورپ میں پہنچے۔ دوسرے ۱۴۵۳ء میں جب سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کیا تو وہاں کے امراء روسا کے ساتھ وہاں کے ان صاحبان علم و فضل نے بھی اندرون یورپ کا رخ کیا جو عرصہ سے علم و فضل کے خزانے دبائے بیٹھے تھے۔ یورپ نے جو اس وقت تک جہل کی تاریکی میں گم تھا ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور آہستہ آہستہ یورپ ان علمی خزانوں سے مالا مال ہونے لگا جو اس وقت تک یونان سے آگے نہیں بڑھ سکے تھے۔ اور یہ حسن اتفاق تھا کہ ۱۴۳۸ء میں جرمنی کے ایک شخص نے چھاپہ خانہ ایجاد کیا جس کی وجہ سے کتابوں کی اشاعت میں بہت آسانی ہوگئی اور علم کی روشنی یورپ کے دور دراز گوشوں تک پہنچنے لگی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ پندرھویں صدی کے آخر سے لے کر سولہویں صدی تک کے عرصہ میں یورپ کی کایا پلٹ ہوگئی۔ اسی لیے یورپ کی تاریخ میں اس زمانے کو احیاء علوم کا زمانہ کہا جاتا ہے۔

اب تک یورپ کا دماغ پاپائیت کی خود ساختہ مذہبی پابندیوں اور افسانہ طرازیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ لیکن احیاء علوم کی اس تحریک نے یہ بندشیں ڈھیلی کیں۔ کلیسا کا عالم تھا کہ جہاں کسی نے اس سے ہٹ کر منہ سے کوئی بھاپ نکالی کہ اس پر الحاد و بے دینی کا الزام لگا اور اسے عدالت تفتیش کے حوالہ کردیا گیا جو ۱۴۸۱ء سے جگہ جگہ اس نام سے قائم تھیں۔ یہ عدالتیں ذرا سی چون و چرا کرنے کی بھی بیحد سنگین سزائیں دیتی تھیں۔ لیکن جب احیاء علوم کے نتیجہ میں ذہنی بیداری پیدا ہوئی تو ان عدالتوں نے سچ مچ بوچڑ خانوں کا کام کیا۔ اور نئی دریافت کرنے والوں کو جن کی تحقیق چاہے کتنی ہی معقول اور انسانوں کے لئے کیسی ہی مفید ہو ایسی ایسی

ہولناک سزائیں دیں جنھیں پڑھ کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہنا پڑتا ہے کہ ان تعذیب خانوں کو عدالت کہنا لفظ عدالت کی توہین ہے۔ مگران مظالم نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ احیائے علوم سے جو بیداری پیدا ہوئی تھی وہ چونکہ فطری اور حقیقی تھی اس لئے چاہے بہتیرں دماغوں کو آگ کے شعلوں میں جھونک دیا گیا ہو۔ لیکن بیداری کی اس لہر کو دبایا نہیں جاسکا۔ بلکہ جیسے جیسے یہ مظالم بڑھتے گئے ویسے ہی ویسے یہ ذہنی بیداری کلیسا کے خلاف بیزاری بنتی گئی۔ اس طرح یہ لاوا پکتا رہا۔ بالآخر خود پاپائیت ہی کے حلقہ سے ایک شخص مارٹن لوتھر اٹھا اور اس نے کلیسا کی چولیں ہلادیں۔ اگرچہ وہ خود ایک پادری تھا اور ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا تھا لیکن غیر معمولی ہمت وصلاحیت کا مالک تھا۔ پہلے تو کلیسا کی خود ساختہ مذہبی پابندیوں کے خلاف پھر اس کے طبع زاد عقائد کے خلاف اس کے دل میں جذبات پیدا ہوئے۔ اس کے بعد پوپ کی جاری کردہ "دستاویز مغفرت" نے تو اس کے ان جذبات کو نکلنے کا راستہ دیا اور ۱۵۱۷ء میں وہ کھلم کھلا پوپ کے مقابلہ میں آگیا۔

دوسری طرف عوام سیاسی رخ سے میگنا کارٹا اور اعلان حقوق کے مرحلوں سے گذرتے ہوئے ایک نئی زندگی کی جانب بڑھ رہے رہتے۔ اور آہستہ آہستہ بادشاہت کے اختیارات کم اور عوام کے حقوق بڑھتے جارہے تھے۔ یہاں تک کہ انقلاب فرانس کے زلزلہ نے یورپ کے معاشرے کی بساط ہی الٹ دی اور بالکل نئی بنیادوں پر نئی تعمیر شروع ہوئی۔

لیکن یہ بنیادیں قطعی طور پر منفی تھیں۔ ایسی مثبت فکر جس پر لوگوں کو انشراح ہو اور وہ معاشرہ کی مستحکم بنیاد بن سکے ان کو نہیں ملی۔

یہ حقیقت تو لوگوں نے سمجھ لی کہ انسان اور خدا کے درمیان کسی درمیانی واسطہ کی ضرورت نہیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پوپ ہو یا بادشاہ کسی کی آواز خدا کی آواز نہیں ہے۔ یہ بھی طے ہو گیا کہ کسی شخص کو خدا نے انسانوں کا حاکم بنا کر نہیں بھیجا ہے۔ یہ بھی جان لیا گیا کہ حکومت اصول و قانون کی ہونا چاہئے نہ کہ ایک یا چند افراد کی یہ بھی تسلیم کر لیا گیا کہ ہر انسان کے حقوق برابر ہیں اور ان میں کسی مصنوعی بنیاد پر تفریق کرنا منشائے قدرت کے خلاف ہے۔ غرض کہ اس طرح کی باتیں تو لوگوں نے سمجھ لیں اور پاپائیت کے جبرے بھی بڑی حد تک نجات مل گئی۔ مگر یہ کہ اب کیا ہو؟ انسانیت کے جہاز کی منزل کونسی ہے؟ اس کے سفر کا رخ کون متعین کرے؟ اور اسے ڈوبنے سے کونسی طاقت بچائے؟ وغیرہ۔ ایسے سوالات کا وہ کوئی واضح جواب نہیں پا سکے۔

ابھی پاپائیت اور اصلاح مذہب کی کشمکش کا اور عوامی بیداری اور ملوکیت کے تنازعہ کا جو مختصر ذکر ہوا اس سے یہ! کوئی نہیں سمجھے گا کہ یہ سب کچھ کسی تخیال مطلق "پا جان جہان" کا کھیل تھا اور اس نے اپنی ذات کے ارتقا کی خاطر افکار و تصورات میں یہ کشمکش کرائی تھی۔ نہ کوئی یہ بات مانے گا کہ اس اکھیڑ بچھاڑ میں روئی چھین جھپٹ کار فرما تھی۔ مگر کہا کچھ ایسا ہی گیا اور اندھیرے میں بھٹکنے والے محروم ہدایت انسانوں نے ایسے خیالی فلسفوں کو چراغ سمجھ کر تھام لیا۔

عیسائی متکلمین نے اپنے مذہبی عقائد کی عمارت اپنی بائبل اور یونانی فلسفہ کے ملے جلے تصورات کائنات والنسان پر تعمیر کر رکھی تھی۔ اور ان کا خیال یہ تھا کہ ان بنیادوں کو ذرا سی ٹھیس لگی کہ پوری عمارت ڈھیر ہوئی۔ اس لئے وہ کسی ایسی تنقید و تحقیق کو برداشت نہیں کر سکتے تھے جس کی وجہ سے اہل کلیسا کو اپنے علم کلام پر نظر ثانی کرنی پڑ جائے۔ اس طرح کی ہر چیز کو وہ مذہب کے لئے براہ راست خطرہ سمجھتے تھے۔ دوسری طرف جو لوگ احیائے علوم کا کام کر رہے تھے انھیں ہر ہر قدم پر اس فلسفہ کی کمزوریاں معلوم ہو رہی تھیں جن پر عقائد و کلام کا یہ پورا نظام قائم تھا۔ مگر وہ جوں جوں آگے بڑھتے تھے اہل کلیسا اپنی طاقت کے بل پر ان کی راہ روکنے کی کوشش کرتے تھے۔ "آنکھوں کو پچھلے زمانہ کی مانی ہوئی حقیقتوں کے خلاف بہت سی چیزیں روز مرہ دشن میں نظر آ رہی تھیں مگر اہل کلیسا کو اصرار تھا کہ ان مسلمات پہ نظر ثانی کرنے کے بجائے دیکھنے والی آنکھیں پھوڑ دی جائیں۔ دماغوں کو بہت سے ان نظریات میں بھول محسوس ہو رہا تھا جن کو پہلے بعض عقائد کی اٹل دلیل سمجھا گیا تھا۔ مگر اہل کلیسا کہتے تھے کہ ان دلائل پر غور و فکر کرنے کے بجائے ان دماغوں کو پاش پاش کر دینا چاہیے جو ایسی باتیں سوچتے ہیں۔۔۔۔"

جیسا کہ ابھی اشارہ ہوا اس کشمکش کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ جدید علمی بیداری میں اوّل روز ہی سے مذہب اور اہل مذہب کے خلاف ایک ضد سی پیدا ہو گئی۔ اور یہ ضد مسیحیت ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ نفس مذہب اس کا نشانہ بن گیا۔ علوم جدیدہ کے علمبرداروں نے یہ سمجھ لیا کہ مذہب بجائے خود ایک ڈھونگ ہے۔ اس کے عقائد دلیل پر قائم نہیں ہیں اس لئے علم کی روشنی سے وہ ڈرتا ہے کہ کہیں اس کا پول نہ کھل جائے۔ دوسرے یہ کہ ان علوم سے پیدا ہونے والی تہذیب کی رگ رگ میں خدا بیزاری اور لامذہبیت کی ذہنیت پیوست ہو گئی۔ علوم و فنون اور ادب کا جو کچھ بھی ارتقا ہوا اس کی جڑ میں وہ ضد برابر موجود رہی جو علمی بیداری کے شروع میں مذہب کے

خلاف پیدا ہو چکی تھی۔ سوچنے کا انداز یہ ہو گیا کہ مذہب جو چیز بھی پیش کرے وہ شک کے لائق ہے۔ اور ہر وہ چیز جو دنیوی علوم کے استادوں کی طرف سے آئے وہ مان لینے کی مستحق ہے۔ اس طرح وہ تمام اجتماعی فلسفے اور اجتماعی نظام جو اس طرز فکر کی بنیاد پر وجود میں آئے وہ خدا کے تخیل سے خالی اور آخرت کے تصور سے عاری رہے۔ اور اسی چیز نے ان کے فلسفۂ زندگی کو ظاہر پرست بنا دیا۔ انہوں نے سمجھا کہ انسان ایک قسم کا حیوان ہے وہ نہ کسی کا تابع ہے نہ اس کو کہیں اوپر سے ہدایت ملتی ہے۔ اسے اگر ہدایت مل سکتی ہے تو قوانین طبیعی سے یا حیوانی زندگی کے تجربات سے۔ انھوں نے سمجھا کہ انسان کی زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنی طبیعت کے تقاضوں کو اور اپنی خواہشات کو زیادہ سے زیادہ آزادی سے پورا کرے ان کی ظاہر بیں نگاہ نے انھیں بتایا اور ان کے مادہ پرست ذہن نے یہ رائے قائم کی کہ حقیقت جو کچھ بھی ہے انہی چیزوں کی ہے جن کو ناپا یا تولا جا سکے۔ اور جو چیزیں ہمارے پانچوں حواس میں سے کسی کی گرفت میں نہ آئیں ان کی کوئی حقیقت نہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں منفی ہیں یا عقل کی خودشناسی کا نتیجہ جن سے انسانی ذہن اتنا ہی مطمئن ہو سکتا ہے جتنا ریت میں منہ چھپا لینے سے شتر مرغ مطمئن ہوتا ہوگا۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ روٹی اور کپڑے کے ساتھ بلکہ کبھی تو اس سے بھی پہلے کائنات کے معمہ کو حل کرنا چاہتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں یہ ابتدائی سوالات اس کے سامنے آتے ہیں کہ یہ کائنات جس میں وہ رہتا ہے خود بخود پیدا ہو گئی ہے یا کوئی اس کا پیدا کرنے والا ہے۔ اگر ہے تو وہ کون ہے اور کیسا ہے۔ کائنات کی یہ مشین خود بخود چل رہی ہے یا اسے کوئی چلا رہا ہے۔ انسان کی حیثیت اس کائنات میں کیا ہے۔ اس کا آغاز کیسے ہوا اور انجام کیا ہوتا ہے۔ یہ آزاد ہے یا کسی کے سامنے جوابدہ۔ وغیرہ۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے سوالات فلسفی اور مفکر کے سامنے نہیں آتے بلکہ عام آدمی بھی یہ باتیں سوچتا ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ انسانوں کی بڑی اکثریت کا ذہن ان جوابات کو قبول کر لیتا ہے جو روایتی طور پر ان کے حلقہ میں چلے آ رہے ہوتے ہیں۔ اور اپنے طور پر وہ ان سوالات کا جواب تلاش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

پھر ایک بات اور بھی ہے۔ انسان کے ایک معاشرتی وجود ہونے کی وجہ سے وہ ایک نظام زندگی کا محتاج ہے اور انسانی زندگی کا کوئی نظام نامہ بن نہیں سکتا جب تک کہ ان ابتدائی اور بنیادی سوالات کا کوئی ایک جواب نہ دے دیا جائے۔ وہ جواب صحیح ہو یا غلط مگر ان سوالات

کا کوئی نہ کوئی جواب دیے بغیر انسانی قافلہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یہ امور غیب چونکہ حواس کی گرفت میں آنے والے نہیں ہیں۔ ان کے کسی بھی جواب کا ایسا ثبوت ممکن بھی نہیں جس سے انکار ممکن نہ رہے۔ اور مغرب کا علوم جدیدہ سے بنا ہوا ذہن اپنی فطرت کے تقاضہ سے مجبور ہو کر یا روایتی طور پر چاہے انفرادی حیثیت سے خدا و مذہب کو مانتا ہو۔ لیکن اجتماعی معاملات میں وہ مذہب سے آزاد ہو گیا۔ وہ ان بنیادی امور میں جنہیں جاننے کا کوئی ذریعہ انسان کے پاس نہیں ہے ہدایت الٰہی سے بے نیاز رہا۔ وہ ان حقیقتوں کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھا جو ناپی اور تولی نہ جا سکیں۔ ان میں جو سمجھ دار اور خود شناس تھے وہ تو لا ادریت کے مقام پر رہے مگر دنیا ے علم کے بعض نو دولتوں نے آگے بڑھ کر امور غیب کے بارے میں "عدم ثبوت" کو "ثبوت عدم" سمجھ لیا۔ بہر حال وہ اپنی اس کیفیت کی وجہ سے مجبور تھے کہ اندھیرے میں تیر چلائیں اور جس طرف سے کوئی آواز "کھٹ" جیسی سنائی دے اسے حقیقت سمجھ بیٹھیں۔

اس صورت حال کے دو نتیجے سامنے آئے۔ کلیسائی نظام جیسا بھی کچھ تھا۔ اور اس نے اپنے ماننے والوں کو ظلم کی چکی میں کتنا ہی پیسا ہو۔ مگر اس کا یہ فائدہ ضرور تھا کہ عیسائی دنیا کو ایک رشتہ میں پروئے ہوئے تھا۔ جب یہ ٹوٹا تو سارے دانے بکھر گئے۔ اور چونکہ اجتماعی زندگی کی خود اپنی ضرورت ہے کہ کوئی ایسا مرکز ہو جس سے تمام افراد جڑے رہیں اور ان کے جذبات محبت و وفاداری بھی اسی سے وابستہ ہوں۔ اجتماع کے نئے مرکز قومیت و وطنیت کے نام سے وجود میں آئے۔ اور انسان کے وہ سب جذبات و احساسات جو مذہب کی دنیا میں خدا سے وابستہ تھے اس سیکولر ذہن نے قوم و وطن سے جوڑ دیئے۔ اس جوڑ توڑ نے بہت سی چیزیں بدل دیں۔ اپنائیت اور غیریت کے پیمانے بدل گئے۔ پہلے فرانس کا عیسائی جرمنی کے عیسائی کا بھائی تھا اور فرانس کے غیر عیسائی کا غیر۔ اب وہ فرانس کے غیر عیسائی کا بھائی ہو گیا اور جرمنی کے عیسائی کا غیر۔ پہلے وہ خدا کے لئے مرنے پر فخر کرتا تھا۔ اب وطن کے نام پر جان دینے لگا۔ پہلے خوب وہ تھا جو خدا کو پسند ہو۔ اب خوب وہ ہو گیا جس سے وطن سربلند ہو۔ پہلے محبت و وفاداری کا مستحق خدا تھا اب وطن بن گیا۔ اس طرح عمل کی دنیا میں ان تازہ خداؤں کا پیرہن مذہب کا کفن ثابت ہوا۔ اور "اقوام میں مخلوق خدا بٹ گئی اس سے"۔

دوسرا نتیجہ یہ کہ مغرب کی یہ جدید سیکولر تہذیب بغیر کسی مثبت نظریاتی بنیاد کے ادھر میں چلی تھی۔ اس لئے کچھ نظریات اور فلسفوں سے بنی ہوئی بیساکھیاں اس تہذیب میں نیچے سے فٹ

کردی گئیں۔ حالانکہ یہی مادہ پرست سیکولر ذہن کسی ایسی حقیقت کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھا جو حواس خمسہ کی پکڑ میں نہ آتی ہو۔ لیکن اس نے ان خیالی فلسفوں کو حقیقت کے طور پر تسلیم کرلیا جن کے حق میں عقلی ثبوت اتنا بھی نہیں جتنا مذہبی عقائد کے حق میں ہے۔

شاید ایسے ہی حالات کا تقاضا تھا کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں تین فلسفیانہ نظریے ایسے اٹھے جو تفصیلات سے قطع نظر اپنی روح کے اعتبار سے پوری تہذیب پر چھا گئے۔

ان نظریات پر تفصیلی گفتگو سے بات طویل ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ ان میں سے ایک نظریہ وہ ہے جسے ہیگل نے پیش کیا اور جسے وہ Dialectic Process کہتا ہے۔ جس کی رو سے افکار و تخیلات کی دنیا میں مسلسل کشمکش ہو رہی ہے۔ اس کشمکش کے نتیجہ میں ایک تہذیب وجود میں آتی ہے۔ یہ دور تہذیب جب پختہ ہو جاتا ہے تو اس کی کمزوریاں واضح ہونا شروع ہوتی ہیں۔ اور اس کے مقابلہ میں کچھ دوسرے تخیلات ابھرنا شروع ہوتے ہیں اور اس سے جنگ کرتے ہیں۔ اسی نزاع و کشمکش سے ایک نیا دور تہذیب جنم پاتا ہے جو گذشتہ دور تہذیب کی کچھ خوبیاں باقی رکھتے ہوئے کچھ نئی خوبیاں اپنے اندر شامل کر لیتا ہے اس کے بعد یہ دور تہذیب بھی پرانا ہو کر اپنے پیٹ سے پیدا ہونے والے دعوے کے مقابلے میں جواب دعوے بن جاتا ہے۔ اور اپنے اندر سے پیدا ہونے والے دعوے سے اس طرح کشمکش کرتا ہے جس طرح جب یہ دعوے تھا تو اس کی کشمکش اپنے سے پہلے کے دور سے ہوئی تھی۔ یہ سلسلہ برابر جاری ہے اور افکار و تصورات کی نزاع و کشمکش کے بطن سے ایک کے بعد دوسرا دور تہذیب وجود میں آتا رہتا ہے۔ اور اس طرح انسانی تہذیب برابر ترقی کر رہی ہے۔ اس کے نزدیک اس طرح انسانی تمدن و تہذیب کے ارتقا میں روح مطلق یا جان جہان یعنی ذات خداوندی خود ترقی کر رہی ہے اور اپنی ذات کی تکمیل کے لئے کوشاں ہے اس عمل ارتقا کو ہیگل اپنی اصلاح میں جدلی عمل Dialectic Process کہتا ہے۔ اس کے نزدیک عرصہ حیات یا میدان دہر میں گویا ایک مسلسل منطقی مناظرہ و مجادلہ ہو رہا ہے پہلے ایک دعوے (Thesis) سامنے آتا ہے۔ پھر اس کے مقابلے میں جواب دعوے (ANTITHESIS) پیش ہوتا ہے۔ پھر ایک طویل جھگڑے کے بعد عقل کلی یا روح کلی ان کے درمیان صلح کراتی ہے۔ یعنی کچھ باتیں اس کی اور کچھ اس کی قبول کرکے ایک مرکب (SYNTHESIS) بنا دیتی ہے۔ آگے چل کر یہ مرکب خود ایک دعویٰ بن جاتا ہے۔ پھر اس کا جواب دعویٰ مقابلے میں آتا ہے۔ اور پھر ان کے درمیان لڑائی کے

بعد مصالحت ہوتی ہے اور ایک نیا مرکب بنتا ہے"۔

دوسرا نظریہ وہ ہے جو ڈارون کا نظریہ ارتقا کہلاتا ہے جو تنازع للبقاء اور انتخاب طبعی اور قانون بقائے اصلح نامی تصورات کے ساتھ نہ صرف مغربی دنیا کے ذہنوں پر چھا گیا۔ بلکہ مغربی تہذیب جو بغیر پیروں چل رہی تھی اس کے نیچے بیچو بین کی طرح فٹ ہو گیا۔

یہاں اس کے حیاتیاتی پہلو پر گفتگو کا موقعہ نہیں۔ اس کا مختصر خلاصہ یا اس سے متاثر ہو کر کائنات کا جو تصور قائم کیا گیا وہ یہ تھا کہ کائنات ایک رزم گاہ ہے جس میں ہر آن ہر طرف زندگی و بقا کے لئے ایک ابدی جنگ برپا ہے۔ اسی کا نام تنازع للبقاء ہے۔ نظام فطرت ہے ہی کچھ ایسا کہ جسے زندہ اور باقی رہنا ہو وہ نزاع اور کشمکش کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا اس ..... نظام میں جو فنا ہوتا ہے وہ اس لئے فنا ہوتا ہے کہ وہ کمزور ہے اور اسے فنا ہونا ہی چاہیئے۔ اور جو باقی رہتا ہے وہ اس لئے باقی رہتا ہے کہ وہ طاقت ور ہے۔ اور اسے باقی رہنا چاہیئے۔ یہی بقا اس کے اصلح ہونے کی دلیل ہے۔ اور یہی عمل قانون بقائے اصلح ہے۔

اس تصور کو جب حیاتیات کے دائرے سے نکال کر انسانی اجتماعیات میں داخل کر دیا جائے اور یہ تصور دماغ میں بیٹھ جائے تو ظاہر ہے کہ اس فلسفہ زندگی میں عدل و انصاف، امانت و دیانت اور صداقت و راست بازی کی کیا ضرورت رہے گی۔ اس میں حق کا وہ مفہوم کہاں باقی رہتا ہے جو کبھی کمزور کو بھی پہنچ سکتا ہو۔ اور ظلم کے وہ معنی کیسے ہو سکتے ہیں جن سے کبھی طاقتور بھی قصوروار بن سکتا ہو۔ دنیا میں ظلم پہلے بھی ہوتا تھا مگر پہلے وہ ظلم تھا اور اب اسے ایک ایسی منطق مل گئی جس سے وہ طاقت ور کا حق بن گیا۔ اس فلسفہ کے بعد یورپ والوں کو اپنے تمام مظالم کے لئے ایک دلیل ہاتھ آ گئی۔ انہوں نے اگر امریکہ اور آسٹریلیا اور افریقہ کی پرانی نسلوں کو مٹایا اور کمزور قوموں کو اپنا غلام بنایا تو یہ گویا ان کا حق تھا جو انہوں نے قانون فطرت کے مطابق حاصل کیا۔ اور مٹنے والے اس کے مستحق تھے کہ انہیں مٹا دیا جائے اس بارے میں اگر اہل مغرب کے ضمیر میں پہلے کوئی خلش ہو گی بھی تو اس منطق نے اسے دور کر دیا۔ حیاتیات میں اس نظریہ کی حیثیت جو کچھ بھی ہو۔ مگر معاشرت و سیاست میں آ کر تو اس نے انسان کو انسان کے لئے بھیڑیا بنا دیا۔

مغربی تہذیب کا آخری بچہ مارکس کی مادی تعبیر تاریخ کے بطن سے نکلا۔ جو فتنہ انگیزی و شر باری میں پہلے دونوں برخورداروں سے بھی بازی لے گیا۔

اپنے موضوع کے اندر رہتے ہوئے یہاں اس نظریہ کا اتنا مختصر تعارف کافی ہوگا کہ "انسانی ذہن کو اس نے بھی حیات دنیا کا وہی تصور دیا جو پہلے ہیگل نے پھر ڈاروِن نے دیا تھا۔ ہیگل نے فکر کی دنیا کو رزم گاہ بنا کر پیش کیا تھا۔ ڈاروِن نے کائنات اور نظام فطرت کو میدان جنگ بنا کر دکھایا۔ اور مارکس نے خود انسانی معاشرے کی وہی تصویر بنا کر دکھا دی۔ اس تصویر میں انسان شروع سے لڑتا جھگڑتا نظر آتا ہے۔ اس کی فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ اپنی اغراض اور اپنے مفاد کے لئے اپنے ہم جنسوں سے لڑے۔ مادی و معاشی اغراض نے اسے مختلف طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ سراسر خود غرضی کے بنا پر ان طبقوں میں کشمکش اور نزاع برپا رہی ہے۔ اور انسانی تاریخ کا سارا ارتقا اسی خود غرضانہ طبقاتی کشمکش کی بدولت ہوا ہے۔ قوموں اور قوموں کی لڑائی تو درکنار خود ایک ہی قوم کے مختلف طبقوں کی لڑائی بھی اس تصویر میں سراسر تقاضائے فطرت نظر آتی ہے۔ اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اور انسان کے درمیان اگر کوئی رشتہ ہے تو صرف اغراض و مفاد کے اشتراک کا رشتہ ہے۔ ان رشتہ داروں سے ملنا اور متفق ہو کر ان سب لوگوں سے لڑنا جن سے آدمی کی معاشی اغراض متصادم ہوں ـــ خواہ وہ اپنے ہی ہم قوم اور ہم مذہب کیوں نہ ہوں ـــ سراسر حق ہے۔ اور اس حرکت کا ارتکاب نہیں بلکہ اس سے اجتناب خلاف فطرت ہے۔"

ان تصورات نے جس دنیا کو جنم دیا اس میں ان مکارم اخلاق کی امید رکھنا ہی فضول ہے جو مذہب و خدا پرستی کی دین ہیں۔ بے دینی کی اس سیکولر فضا میں جس فلسفہ اخلاق کو فروغ حاصل ہو سکتا تھا وہ خالص افادیت کا فلسفہ تھا۔ جس کے ساتھ لذتیت کے ایک مادہ پرستانہ تصور کی آمیزش ہو گئی تھی "اس اخلاق میں خیر و شر کا کوئی مستقل معیار نہیں ہے۔ ہر چیز اضافی ہے۔ ذاتی یا قومی منفعت کے لئے ہر اصول توڑا اور بنایا جا سکتا ہے۔ آج جو کچھ اچھا ہے وہ کل برا ہو سکتا ہے۔ اور آج جو برا ہے وہ کل اچھا بن سکتا ہے۔ ایک کے لئے حق و باطل کا معیار ایک ہے اور دوسرے کے لئے دوسرا ـــ جو لوگ ہیگل اور مارکس کے نظریات سے متاثر ہوتے ہیں ان کے دماغ میں دو باتیں گہرائی کے ساتھ بیٹھ جاتی ہیں ایک یہ کہ ہر دور کی پوری تہذیب ایک وحدت ہوتی ہے۔ جس میں کی ہر چیز اپنے دور کے اجتماعی مزاج کی گویا ترجمان ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ جب ایک تہذیب خوب پک چکتی ہے تو خود بخود تاریخی اسباب سے اس تہذیب کے اندر سے رجحانات کا ایک نیا مجموعہ نمودار ہوتا ہے۔ اس طرح ایک کے بعد دوسری جو نئی تہذیبیں

وجود میں آتی ہیں ان میں سے ہر بعد کی تہذیب پرانی تہذیبوں سے بہتر ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ پرانی تہذیبوں کے بہترین اجزاء کے ساتھ نئے افکار و نظریات کے قیمتی اجزا بھی اپنے اندر رکھتی ہے۔

"ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے ذہن میں یہ دو خیال جم گئے ہوں وہ درحقیقت کسی ایسی تعلیم پر ایمان رکھ ہی نہیں سکتے جو اب سے صدیوں پہلے (ان کے عقیدہ کے مطابق ایک گذرے ہوئے تہذیبی دور میں) دی گئی ہو۔ ان کے سامنے جب ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور محمد علیہم السلام کے نام لئے جائیں گے تو وہ یہی جواب دیں گے کہ "یہ سب لوگ اپنے اپنے دور کی پیداوار تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے عہد کی تہذیب کے مقابلہ میں ایک جواب دعویٰ (ANTITHESIS) پیش کیا تھا جو ایک کشمکش کے بعد ایک مرکب تہذیب (SYNTHESIS) کا جز بن گیا۔ اور اس کے بعد اور کتنے ہی جواب دعویٰ پیش ہو چکے ہیں اور کتنے ہی مرکب بن چکے ہیں۔ یہاں تک کہ انسانی تہذیب ترقی کرتے کرتے ہمارے اس دور تک پہنچی ہے۔ ہم ان لوگوں کی قدر اس لحاظ سے ضرور کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے اپنے عہد میں انسانی تہذیب کو آگے بڑھانے کے لئے کام کیا۔ مگر اب کسی پرانے جواب دعویٰ کو پھر سے سامنے لانے کا کونسا موقع ہے۔"

یہاں اس بات کو سمجھ لینا چاہیے کہ انسان کی فطرت خیر پسند واقع ہوئی ہے۔ وہ کسی شر کو شر ہی کی شکل میں قبول نہیں کرتا۔ اس لئے باطل کو کچھ نہ کچھ صداقت اپنے اندر شامل کرنا ہی پڑتی ہے۔ لیکن یہ عمل اس وقت ہوتا ہے جب باطل کو قبول عام حاصل کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ابتدا تو یوں ہوتی ہے کہ انسان کی خیر پسند طبیعت کسی صداقت کا مثبت طور پر اثر قبول کرکے اور کسی ظلم سے منفی طور پر متاثر ہو کر کسی ایک سچائی پر نظریں جما لیتی ہے۔ اس کے بعد ہدایت سے محروم ہو جانے کی وجہ سے اپنی کوتاہ نگاہی کے سبب اسی ایک سچائی کے محور پر پوری انسانیت اور اس کے معاملات کو گھما دیا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ صداقت جو اگر اپنے حدود میں رہے تو صداقت ہی رہے گی۔ مگر حدود سے تجاوز کے بعد وہ باطل بن جاتی ہے۔ یہی کچھ اہل مغرب کے ساتھ ہوا۔ جن نظریات کا ابھی ذکر ہوا ان سب میں صداقت کے کچھ اجزا ضرور تھے۔ مگر مغرب کے انتہا پسند ذہن نے ان اجزاء صداقت کو کل صداقت سمجھ لیا۔ اگر ان کم نظر فلسفیوں تک قرآن کی روشنی پہنچی ہوتی تو وہ تنازع للبقاء اور انتخاب طبعی میں سے قانون بقائے اصلح کے بجائے قانون بقائے انفع اخذ کرتے اور اس طرح طاقت کی دوڑ کے بجائے نفع رسانی کی دوڑ شروع ہو جاتی۔ اور یہ اعلیٰ ترین دل و دماغ انسانوں کو طاقت حاصل کرکے درندہ بننے کا راستہ نہیں دکھاتے بلکہ زیادہ سے زیادہ نفع رسانی کے گر سکھاتے۔ اور اپنی اعلیٰ درجہ

کی صلاحیتوں کے ساتھ نفع رسانی کی دوڑ میں شریک ہو کر اسی دنیا کو جنت کا نمونہ بنا دیتے۔
مگر اب خدا کے فضل سے اس صورت حال کا ردعمل شروع ہو گیا ہے۔ مادہ پرستی کی اس بھٹی کی تپش کو لوگ محسوس کرنے لگے ہیں۔ اور اگرچہ ابھی ان کی تعداد کم ہے لیکن اسی تہذیب کی گود میں پلے ہوئے لوگ بھی سمجھے جا رہے ہیں کہ یہ خالص مادہ پرستانہ اجتماعی سفر ہم کو بیابان مرگ کے قریب لے آیا ہے۔ ہم غلط نقطہ سے چلے تھے اور غلط جگہ پہنچے۔
پھر یہ مادہ پرستانہ سیکولر تہذیب جب اپنے افکار و نظریات سے مسلح ہو کر اور جدید ترین جنگی اسلحہ سے لیس ہو یورپ سے باہر نکلی تو اسے اسلامی تہذیب سے بھی واسطہ پڑا۔ جو اس وقت اگرچہ روح جہاد اور روح اجتہاد سے محروم ہو کر اپنی تسخیر کی طاقت اور جوانی کھو چکی تھی۔ مگر پھر بھی دنیا کی تمام تہذیبوں میں سب سے زیادہ مرتب اور مربوط تھی۔ ساتھ ہی اپنا ایک جگمگاتا ہوا ماضی رکھتی تھی جس میں تابناک مستقبل نظر آ رہا تھا۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ یہ تہذیب ایک مستحکم ایمان اور زندہ یقین پر قائم ہے۔ اس لئے دوسری اکثر تہذیبیں تو اس جدید تہذیب کے سانچہ میں ڈھل گئیں لیکن مسلمانوں نے ہار نہیں مانی۔ مگر چونکہ ہتھیار بند ہاتھوں کے ذریعہ پیش کئے جانے والے خیالات و افکار جسموں سے بھی پہلے دماغوں کو مسحور و مسخر کر لیتے ہیں اس لئے ہر جگہ مقابلہ غیر مساوی رہا۔ یہ مسلح مغربی تہذیب آگے بڑھتی رہی اور غیر مسلح اسلامی تہذیب رک رک کر پیچھے ہٹتی رہی۔ لیکن ایسا کہیں بھی نہیں ہوا کہ وہ بالکل ہی مغلوب ہو کر اس کے رنگ میں رنگ جائے۔ مغرب کے استادوں نے مسلمانوں کا یہ ذہن بنانے کی پوری کوشش کی کہ اسلام سیاست سے بلند ہے اس لئے دیندار مسلمانوں کو سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ اس کے لئے یہی بہتر ہے کہ "چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہان بے ثبات" آنکھیں بند کر کے اپنے ذکر و شغل میں معروف رہے۔ لیکن چونکہ یہ باتیں ان چیزوں سے میل نہیں کھاتیں جن سے مسلمان کا خمیر بنا ہے اس لئے "کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے" والی کیفیت پیدا ہو گئی اور اسی کے نتیجہ میں مسلمانوں کے اندر فکری اعتبار سے دو گروہ بن گئے۔ یہ جو ہم دیکھ رہے ہیں کہ تقریباً تمام مسلم ممالک میں ایک اضطراب کی کیفیت ہے اور اکھیڑ پچھاڑ کر بھی ہوئی ہے اس کی وجہ یہی ہے۔ ایک طرف تو مغربی افکار سے مسحور وہ لوگ ہیں جنھیں مغربی قومیں جاتے جاتے اپنا جانشین بنا گئی ہیں۔ دوسری جانب وہ لوگ ہیں جو دین کو عافیت کے گوشوں سے نکال کر عملی زندگی

کے میدان میں برپا کرنا چاہتے ہیں۔

مگر جیسا کہ ابھی بیان ہوا ایک طرف تو دانائے فرنگ کی سمجھ میں آنے لگا ہے کہ عقل نے جب بال و پر کھولے تو وہ گرفتار تر ہوگئی۔ اور اس کا بیمار مادیت کے انجکشنوں سے بیمار تر ہوگیا بلکہ بعض سلیم الفطرت اہل نظر تو ہدایت طلب نگاہوں سے اپنے دائرے کے باہر بھی جھانکنے لگے ہیں۔ دوسری طرف مسلم دنیا میں حرکت پیدا ہوئی ہے اور ان کے سمندر میں فکری لہریں اٹھنے لگی ہیں۔ جس طرح ہزار بارہ سو سال پہلے اپنے غلبہ کے دور میں انھوں نے یونانی فلسفہ اور بعض دوسرے علوم و افکار کے حملوں کا مقابلہ خود انہی علوم کے ہتھیاروں سے کیا گیا تھا۔ اس طرح اب مغلوبیت کے زمانہ میں مسلم مفکرین مغربی علوم کے ہتھیاروں سے مسلح ہوکر میدان میں اترے ہیں۔ اب سے چالیس پچاس سال پہلے تک مسلم علماء مغربی تہذیب کا مقابلہ مدافعانہ بلکہ معذرت خواہانہ انداز میں کرتے تھے۔ مغربی دنیا سے نکلی ہوئی ہر چمکدار چیز کے تعلق سے کہتے تھے کہ یہ تو ہمارے اسلام میں بھی ہے۔ ترقی نسواں ہو، جمہوریت ہو، معاشی مساوات ہو۔ غرض یہ ہے کہ جو چیز بھی یورپ سے آئی انہوں نے اسے اسلامی تعلیمات میں سے ڈھونڈھ نکالا اور جواب میں پیش کردیا حالانکہ ان میں سے ہر چیز اسلام میں ضرور ہے مگر اپنے رنگ میں اور اپنے مزاج کے مطابق ہے۔ میں نے خود اس زمانے میں جدید تعلیم یافتہ نسل کو اسلام سے شرماتے ہوئے دیکھا ہے۔ مگر اب خدا کے فضل سے یہی نسل زندہ اور چھا جانے والے اسلام کی علم بردار بن گئی ہے۔ اب الحمدللہ اسلام فکری اعتبار سے اقدامی پوزیشن میں آگیا ہے اور مغربی فکر مدافعت کر رہا ہے۔ نئی تعمیر کے لئے ہر انقلابی پیش قدمی کے ساتھ یہی ہوتا آیا ہے کہ جگہ چھوڑنے والی عمارت کے وارث اس کا استقبال پھانسی کے پھندوں سے کرتے ہیں۔ مگر آخر میں وہ صلیب بردار ہاتھ زیر ہو جاتے ہیں۔ جب بھی کوئی تشنہ کام آخر شب میں آتا ہے تو ساقی تعظیم کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے۔ شیشے جھک جاتے ہیں اور ساغر گردش میں آجاتے ہیں۔ آج یہی سب کچھ اسلامی دنیا میں تقریباً ہر جگہ ہو رہا ہے اور اب تو غیر مسلم دنیا کے تھمے ہوئے تالاب میں بھی بلبلے اٹھنے لگے ہیں۔ حتیٰ کہ مشرقی یورپ جہاں کمیونزم کے سایہ میں انسانی باڑے بنے ہوئے ہیں وہاں بھی یہ آواز اٹھنا شروع ہوگئی ہے۔ اور بات یہ نہیں ہے کہ یہ ایک جذباتی ابھار ہے جو بیک وقت جگہ جگہ سے اٹھا ہے جیسا کہ جذباتی لہر کا مزاج بھی ہوتا ہے بلکہ اس کے اندر گہرا اور ٹھنڈا اور مدلل فکر کام کر رہا ہے

جس نے مسلمانوں کے اندر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی جرأت پیدا کی ہے اور یہ یقین پیدا کیا ہے کہ صرف یہی حق ہے جسے غالب ہونا ہی ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ سے

جب اس انگارہ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا — تو کر لیتا ہے وہ بال و پر روح الامیں پیدا

یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ یہ بات بھی سمجھ لینے کی ہے۔

اس صدی کی ابتدا میں تقریباً ہر مسلم ملک میں انقلابی اسلام کے داعی پیدا ہوئے۔ اس کیلئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ بس غور طلب بات یہ ہے کہ پچیس تیس سال کے عرصہ میں ہی ایسا کیوں ہوا کیا ان سب بزرگوں کی روحوں نے عالم بالا میں کوئی کانفرنس کر کے طے کیا تھا کہ میں فلاں ملک میں جاتا ہوں تم فلاں جگہ جاؤ۔ یا پھر یہ بات ہے کہ عالم اسباب کے اعتبار سے یہ سب کچھ مغربی تہذیب کے ہمہ گیر غلبہ کا ہمہ گیر رد عمل ہے۔ اور اس بات پر یقین کیجئے کہ خدائے رحمٰن ورحیم کو دکھی انسانیت پر یعنی اپنے بھٹکے ہوئے بندوں پر رحم آگیا ہے اور اس کی مشیت نے یہ سب اسباب پیدا کئے ہیں تاکہ اس کے ستم زدہ و فریب خوردہ بندے آنکھیں کھولیں اور اپنے رب کی رحمت کے سایہ میں آجائیں زمانے کی بہت سی فکری و عملی تبدیلیاں اور علامتیں صاف بتا رہی ہیں کہ دنیا والے اپنے پیروں سے چل کر اسلام کے قریب آگئے ہیں۔ یہ دعوت توحید زندہ و بیدار ضمیر کی پکار کا جواب تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی لیکن اب تو وہ وقت کی ضرورت بھی بن گئی ہے۔ اور عصری تقاضا بن کر ابھر رہی ہے۔ خدا کی رحمت اسلام کی شکل میں اب اس کے بندوں پر نازل ہونے والی ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں۔ بس سوال یہ ہے کہ اس رحمت کے نازل ہونے کا ذریعہ کون بنتا ہے؟ آیا امت مسلمہ اس کا ذریعہ بنتی ہے جس کا حق مقدم ہے۔ یا خدا نخواستہ اسے نظر انداز کر کے کسی اور کو یہ شرف بخشا جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ بے نیاز ہے۔ سب اس کے محتاج ہیں وہ کسی کا محتاج نہیں۔ اور وہ فرما ہی چکا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ (مائدہ ۵۴)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھرے گا تو اللہ جلد ایسے لوگوں کو لائیگا جن سے وہ محبت کریگا اور جن کو وہ محبت کریں گے۔ وہ مومنوں کے لئے نرم اور کافروں کے لئے سخت ہوں گے۔ وہ اللہ کے راستے میں جہاد کرینگے اور (اس سلسلے میں) کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا نہیں کرینگے۔ یہ اللہ کا فضل ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے اس سے نوازتا ہے اور اللہ بڑی کشادگی والا علم والا ہے۔

اسلامی طلبہ تنظیموں کا مطلوبہ ڈھانچہ

سلطان احمد اصلاحی

اسلامی اجتماعیت کے مطلوبہ تفصیلی ڈھانچہ کے سیاق میں یہ مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اسلامی طلبہ تنظیموں کا مطلوبہ ڈھانچہ (STRUCTURE) کیا ہے؟ تجدید و احیائے دین کے لیے انھیں اپنے اپنے دائروں میں آزاد اور خود مختار رہ کر کام کرنا چاہئے۔ یا اس کام کو اپنے سے بڑوں کی سرپرستی اور اس راہ کے پیش رووں کی براہ راست نگرانی اور رہنمائی میں انجام دیا جانا چاہئے۔ موجودہ دور کو بجا طور پر تحریکات کا دور کہنا چاہئے۔ کار دعوت و تجدید کے معروف ذرائع میں یہ وہ اضافہ ہے جس کی اہمیت و افادیت کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ماضی قریب تک دعوت و اصلاح اور تجدید دین کے کام عام طور پر مدرسہ و خانقاہ اور امامت و خطابت جیسے معروف ذرائع سے انجام پاتے تھے۔ جدید دور کی دو تین سو سالہ تاریخ نے نئی تبدیلیوں کے ناگزیر تقاضے کے طور پر افکار و نظریات کی تشہیر و ترویج اور ان کے مطابق حالات کی تبدیلی اور تعمیر نو کے لیے اس دائرے میں تحریکات (MOVEMENTS) کے فعال اور موثر عنصر کا اضافہ کیا۔ اصلاح و انقلاب کی اس جدید تکنیک کو مسلمان امت نے بھی بجا طور پر خوش آمدید کہا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا جو ماضی قریب میں عالم اسلام کے دوسرے خطوں کی طرح اس برصغیر میں اسلامی تحریکات کا آغاز ہوا۔ اور دنیائے انسانیت کو اسلام کے پیغام سے آشنا کرنے اور اس کے مطابق اپنی زندگیوں کو تبدیل کرنے کے لیے اس نئے ذریعۂ اصلاح و انقلاب کا تجربہ کیا گیا۔

اسلامی تحریکات کا ماضی:

ماضی قریب میں تجدید و احیائے دین اور اسلام کے غلبہ و نفاذ کے لیے عالم کے علاوہ دنیا کے دوسرے خطوں میں جو تحریکات اٹھیں غیر مسلم ابنائے انسانیت کی طرح مسلمانوں کے اندر بھی ان کی دعوت کسی تفریق و امتیاز کے بغیر ان کے تمام

طبقات سے تھی۔ مرد، عورتیں اور نوجوان سبھی یکساں طور پر ان کے مخاطب تھے۔ اور بلا لحاظ سن و سال ہر ایک سے یہی مطالبہ تھا کہ وہ اپنے کو اسلام کے سانچے میں ڈھال لے اور جملہ معاملات زندگی کی نسبت سے اپنے اوپر وہ رنگ چڑھالے جس سے بہتر اور جس سے عمدہ نہ کوئی دوسرا رنگ ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

طلبہ تنظیموں کا آغاز: بعد کے زمانہ میں ان تحریکات کے اندر اسلامی طلبہ تنظیموں کے نئے عنصر کا اضافہ ہوا۔ خیال یہ کیا گیا کہ نوجوانوں کی نفسیات الگ اور ان کا مزاج اور افتاد طبع بزرگوں اور عمر رسیدہ لوگوں سے مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے تحریک و دعوت کے کام کے لیے اگر ان کے الگ فورم اور الگ تنظیمی ڈھانچے بن جائیں تو کام کو زیادہ بہتر اور فطری طریقے پر انجام دیا جاسکے گا۔ بزرگوں کے ساتھ نوجوانوں کی مطلوبہ بے تکلفی باقی نہیں رہتی اور ان کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے باہم ایک طرح کا فطری حجاب قائم رہتا ہے۔ اس سے تحریک و دعوت کا کام متاثر ہوتا ہے۔ اس لیے طلبہ تنظیموں کا الگ مستقل پلیٹ فارم قائم ہوجانا زیادہ مناسب ہے۔ تاریخی پس منظر سے قطع نظر اور اس تفصیل میں جائے بغیر کہ وہاں کی سرپرست تحریک اسلامی نے نوجوانوں کی اس امنگ کا کس حد تک ساتھ دیا اور طلبہ تنظیم کے الگ مستقل ڈھانچے کو خوش دلی یا اس کے برعکس کس طرح گوارا کیا، اس سلسلے کا سب سے پہلا تجربہ پاکستان میں اسلامی جمعیۃ الطلبہ کی صورت میں سامنے آیا۔ اسی طرح ہندوستان میں اسلامک موومنٹ آف انڈیا اور اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا کا قیام عمل میں آیا۔ چونکہ آئندہ ہماری گفتگو خاص طور پر انھیں تینوں طلبہ تنظیموں کے پس منظر میں ہوگی اس لیے طوالت سے بچتے ہوئے ہم دیگر اسلامی طلبہ تنظیموں کو قلم انداز کرتے ہیں۔

عالمی اسلامی طلبہ تنظیمیں: اسلامی طلبہ تنظیموں پر گفتگو کرتے ہوئے دو نام ہیں جنھیں مشکل ہی نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ ورلڈ اسمبلی آف مسلم یوتھ (WAMY) جس کا صدر دفتر "ریاض" سعودی عرب ہے۔ اور دوسری انٹرنیشنل اسلامک فیڈریشن آف اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (IIFSO) جس کا مرکز کویت ہے۔ لیکن جیسا کہ آخر الذکر کے نام ہی سے ظاہر ہے یہ طلبہ تنظیمیں بذات خود کوئی مستقل حیثیت کی حامل نہیں جن کا اپنا علیٰحدہ تشخص ہو اور جو اپنی مستقل بنیادیں (BASES) رکھتی ہوں۔ یہ دراصل دنیا بھر میں پھیلی ہوئی مختلف و متنوع اسلامی طلبہ تنظیموں کا ایک وفاق (FEDRATION) ہیں جن کا کام ان مختلف تنظیموں کو ایک لڑی میں پرونا اور ان کے مابین اتحاد و تعاون کی بیش از بیش صورتیں پیدا کرکے انھیں ایک

دوسرے سے زیادہ سے زیادہ قریب اور باہم گہرا مربوط رکھتا ہے۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ ان دعاتی طلبہ تنظیموں کا مطلوبہ ہدف اور اس کا تفصیلی لائحہ عمل اور طریقہ کار شاید ان تنظیموں کے سامنے بھی بہت زیادہ واضح نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالباً ان کی جدوجہد اور ان کی سرگرمیوں کا کوئی واضح رُخ اب تک سامنے نہیں آسکا ہے۔ اور یہ وہ مسئلہ ہے جس پر ان تنظیموں کے ذمہ داروں اور اس مزاج (NATURE) کی حامل تنظیموں میں دلچسپی رکھنے والے اور ان کے ہم خیال افراد کو سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ بحث و مذاکرہ کی وقتی مجالس سے آگے بھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ اور کام کا بڑا وسیع دائرہ کار موجود ہے۔

برصغیر ہند و پاک اور اسلامی طلبہ تنظیمیں: اسلامی طلبہ تنظیموں کے متحرک و فعال رول کے لیے ہمیں پھر اسی برصغیر کی طرف واپس آنا ہوگا۔ بنگلہ دیش کے خاص حالات ہیں جو کچھ زیادہ واضح نہیں ہیں۔ اس سے ہٹ کر جب ہم پاکستان کی طرف نظر اٹھاتے ہیں تو وہاں ہمیں اسلامی جمعیۃ الطلبہ سرگرم کار دکھائی دیتی ہے۔ اس کی تاسیس اور بعد میں اس کے سلسلے میں وہاں کی سرپرست تحریک اسلامی کے ردعمل وغیرہ جیسے مسائل سے صرف نظر کرکے بظاہر جو صورت حال نظر آتی ہے وہ یہی کہ پاکستان کی تحریک اسلامی اس نوجوان طلبہ تنظیم سے بہت کچھ توقعات وابستہ رکھتی ہے۔ ہرچند کہ یہ تنظیم براہ راست تحریک کی سرپرستی میں کام نہیں کر رہی ہے اور اپنے فیصلوں اور اپنے لیے تجویز کردہ لائحہ عمل وغیرہ کے سلسلے میں وہ بہت کچھ آزاد ہے، بہرحال تحریک کا سایہ اس کے سر ہے۔ تحریک کو اس کے ذریعہ سے غالباً نئے کارکن بھی فراہم ہو رہے ہیں اور جہاں کہیں اسے اپنے کاموں کے لیے نئے اور تازہ خون کی ضرورت ہوتی ہے اسلامی جمعیۃ الطلبہ اس کے ساتھ پورا پورا تعاون کرتی ہے۔ پاکستان کے حالات چونکہ براہ راست ہمارے سامنے نہیں، اس لیے آگے نہ جاکر اس سلسلے میں ہم اسی عمومی تبصرہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

ہندوستان میں ملک کی تقسیم کے ساتھ جب تحریک اسلامی کی بھی تشکیل نو عمل میں آئی تو اس کے ساتھ ہی یہاں طلبہ اور نوجوانوں کا بازو بھی سرگرم ہوگیا لیکن ابتدا میں اس کا رُخ زیادہ تر اکیڈمک اور علمی اور تحقیقی تھا۔ بعد میں تحریک کے بعض مخلصین کی کوششوں سے طلبہ اور نوجوانوں میں کام نے عمومی تحریک کی صورت اختیار کی۔ اور ملک کے مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے اسلامی طلبہ تنظیمیں قائم ہوگئیں اور نسبتاً منظم انداز میں اپنا کام انجام دینے لگیں۔ علی گڑھ میں ایس۔ آئی۔ ایم۔ آف انڈیا سے پہلے سے قائم اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا

(S.I.O)، بہار کی 'حلقہ طلبہ اسلامی'، کلکتہ کی MSA مسلم اسٹوڈنٹس اسوسی ایشن آف انڈیا اور آندھرا پردیش کی اسٹوڈنٹس اسلامک یونین (SIU) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس عرصہ میں ان تمام طلبہ تنظیموں کو ملاکر ملک میں ایک کل ہند اسلامی طلبہ تنظیم کے قیام کی کوششوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہی کچھ حالات تھے جبکہ ۱۹۷۵ء میں ایمرجنسی کا نفاذ عمل میں آیا اور تحریک اسلامی کے ساتھ طلبہ تنظیموں کی سرگرمیاں بھی بڑی حد تک القط ہوگئیں۔ انیس ماہ بعد ۱۹۷۷ء میں ایمرجنسی کا خاتمہ ہوا تو تحریک اسلامی پر سے پابندی (BAN) اٹھنے کے ساتھ ہی طلبہ تنظیموں نے بھی انگڑائی لینی شروع کر دی۔ عرض کیا گیا کہ ایمرجنسی سے پہلے ہی پورے ملک کی تمام طلبہ تنظیموں کو ایک مرکزی تنظیم میں ضم ہو جانے کی کوششوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ ایمرجنسی کے بعد یہ کوششیں خاطر خواہ طریقے پر بار آور ہوئیں۔ چنانچہ بہار اور آندھرا کی اسلامی طلبہ تنظیموں کے علاوہ بقیہ تنظیموں نے عام طور پر اپنے کو ایک کل ہند طلبہ تنظیم کے ڈھانچے میں ضم کر لیا۔ البتہ اب اس دائرے نے تنظیم (ORGANISATION) سے آگے تحریک (MOVEMENT) کی صورت اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ ۲۵ر اپریل ۱۹۷۷ء کو اسٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ آف انڈیا (SIM) کے نام سے علی گڑھ میں اس کل ہند تحریک کا قیام عمل میں آیا۔ جو تحریک اسلامی ہند کی برائے نام سرپرستی کے باوجود اپنے پالیسی پروگرام اور اپنے فیصلوں اور لائحہ عمل میں اصلاً آزاد اور خود مختار تھی۔ ایس آئی ایم اپنی اسی حیثیت میں کام کرتی رہی۔ یہاں تک کہ ۱۹۸۲ء میں ہندوستان کی تحریک اسلامی کی طرف سے اپنی براہ راست سرپرستی میں ایک کل ہند طلبہ تنظیم کے قائم کرنے کا فیصلہ ہوا۔ توقع کی گئی کہ ایس۔ آئی۔ ایم آف انڈیا اس قافلہ میں شریک ہو کر کل ہند اسلامی تنظیم کے قیام میں اپنا قرار واقعی حصہ ادا کرے گی۔ لیکن غالباً اپنے مصالح اور ترجیحات کے پیش نظر وہ تحریک اسلامی ہند کی اس خواہش سے اپنے کو ہم آہنگ نہ کر سکی۔ اور تحریک کی اخلاقی سرپرستی سے آگے اس کی قانونی سرپرستی اور براہ راست نگرانی سے آزاد رہ کر اپنی مستقل حیثیت میں اس نے کام کرنے کو پسند کیا۔ بالآخر تحریک نے اپنی براہ راست نگرانی اور سرپرستی میں ایک کل ہند طلبہ تنظیم اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا (S.I.O) کے قیام کا فیصلہ کیا۔ تادم تحریر یہ دونوں ہی طلبہ تنظیمیں کل ہند سطح پر اپنے اپنے دائروں میں سرگرم عمل ہیں۔ اور ملک کے طلبہ اور نوجوانوں کو اسلام کے پیغام سے آشنا کر کے تحریک اسلامی کے قافلے کو آگے بڑھانے کے لیے جدوجہد میں لگی ہوئی ہیں۔ ہندوستان کے خاص حالات کے پس منظر میں اسلامی طلبہ تنظیموں کی اس صورت حال کے پیش نظر فطری طور پر اسلام کے ایک طالب علم کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ دونوں میں کون سی صورت زیادہ

مناسب اور زیادہ قرین مصلحت اور قرآن و سنت سے زیادہ قریب اور اصول دین اور مصالح دین سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ اپنے بڑوں اور بزرگوں کی براہ راست سرپرستی و نگرانی میں نوجوانوں کا کام دین کے لیے کرنا، دین اور اصول و مصالح دین سے قریب ہے۔ یا اس کے برعکس کہ نوجوانوں کا دین اور دعوت دین کا کام الگ اور آزاد رہ کر کرنا ہی زیادہ مناسب اور قرین مصلحت ہے۔ سطور ذیل میں ہندوستان کے خاص حالات کے پس منظر میں ہمیں اسی نازک مسئلہ سے عہدہ برآ ہونا ہے۔

دور جدید کا پس منظر: دین کی خدمت اور اسلام کے احیا و سربلندی کے لیے اداروں کی طرح تحریکوں اور تنظیموں کا قیام بھی کوئی غیر مستحسن چیز نہیں بلکہ دین کے تقاضوں کی ادائیگی میں امکانی کمیوں کو محسوس کرتے ہوئے بسا اوقات مدارس و مکاتب کی طرح تنظیموں اور تحریکوں کے قیام کو بھی شریعت کے اصطلاحی الفاظ کو استعمال کرتے ہوئے "مستحب" سے آگے 'واجب' قرار دیا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر ہندوستان کے حالات کے پس منظر میں جہاں 'الجماعۃ' کا وجود نہیں ہے۔ اور اس کے نتیجے میں کسی تحریک و جماعت کا یہ دعویٰ نہیں کہ 'حق' اسی کے دائرے میں محصور ہے۔ اور اس کے باہر جو کچھ ہے وہ ضلالت و گمراہی ہے۔ ظاہر ہے امت کے دوسرے تمام طبقات کی طرح طلبہ اور نوجوانوں کو بھی یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ دینی مقاصد کو روبکار لانے کے لیے حالات و زمانہ کے تقاضے سے تحریکیں اور تنظیمیں قائم کرسکیں۔ اور اس طرح یہ کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا جس پر چنداں غور کیا جاتا۔ لیکن خاص طور پر ہندوستان اور شاید کسی قدر پاکستان کی حد تک بھی اس کے اندر ایک ایسا عنصر شامل ہوتا دکھائی دیتا ہے کہ اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھنا کسی صورت مناسب نہیں ہوسکتا۔ اور وہ یہ کہ یہاں علیٰحدہ طلبہ تنظیم کے پیچھے اس راہ کے اپنے پیش رو بزرگوں اور بڑوں سے بیزاری اور ان سے کسی قدر مایوسی ایک بڑے موثر عامل کی حیثیت سے کارفرما رہی ہے۔ آج کے کچھ طلبہ اور نوجوانوں کا یہ چلتا ہوا تاثر ہے کہ ملت کی بوڑھی قیادت از کار رفتہ ہو چکی ہے۔ نئے حالات کو سمجھنے اور اس کا ساتھ دینے کی صلاحیت اب اس کے اندر باقی نہیں رہی۔ اس لیے دین و ملت کے کاروبار کو اب پوری طرح نوجوانوں کے حوالہ کردینا چاہیے۔ یہ بات جو بظاہر معمولی اور سادہ نظر آتی ہے شاید وہ اتنی سادہ نہیں ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں دور جدید کے پس منظر پر ایک نگاہ ڈالنی چاہیے۔

دور جدید کے دو فتنے: دور جدید نے فکر و نظر کا جو خاص سانچہ تیار کیا ہے اس کے اثرات شعوری یا غیر شعوری طور پر بہت دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔

لہٰذا یورپ میں اسلام پسند حلقوں کا بھی ان سے متاثر ہو جانا کچھ بہت زیادہ تعجب خیز نہیں۔ خلاصہ کے طور پر فکر و نظر کے اس نئے سانچے کے لیے دو عنوان کافی ہیں : ۱۔ خدا بیزاری اور ۲۔ انسان ناشناسی۔

۱۔ **خدا بیزاری :** موجودہ دور اپنے مزاج اور بنیاد کے لحاظ سے خدا بیزار اور خدا ناشناس ہے۔ اپنے خالق و محسن اعظم سے منہ موڑ کر رہنا اور اس سے بے نیازی اور آزادی کو اس نے انسان کا وظیفۂ حیات قرار دیا ہے۔ اپنے رب کریم کی طرف سے دھوکہ میں پڑی ہوئی آج کی انسانیت کے اندر اگر کہیں ہمیں خدا اور مذہب کی آواز سنائی دیتی ہے تو وہ محض حالات و مصالح کے تقاضے سے ہے۔ لیکن عوام کو خدا پرستی اور مذہبیت و دینداری کی آزادی ایک خاص دائرے کے اندر ہی ملتی ہے۔ انفرادی زندگی سے آگے جہاں کہیں اجتماعی معاملات اور زندگی کے اہم امور و مسائل کی بات آتی ہے تو خدا بیزاری اور ہدایت الٰہی سے بے نیازی پر متمدن دنیا کی عظیم اکثریت متفق اللفظ نظر آتی ہے۔ آج کی مہذب دنیا کا یہ وہ 'کلمۂ سواء' ہے جس پر کسی کا اختلاف نظر نہیں آتا اور ہر ایک اس کے سلسلے میں متحد اللفظ اور یک زبان ہے۔

۲۔ **انسان ناشناسی :** زندگی میں جب خدا شناسی نہ رہ جائے تو انسان شناسی کا کیا سوال رہ جاتا ہے۔ انسان جب اپنے خالق و مالک کو بھول جائے جس کے بے پایاں احسانات سے اس کا ہر بن مو گراں بار ہے تو پھر انسانوں کی شکر گزاری اور ان کی احسان شناسی کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ خدا بیزاری کے بعد دور جدید کا دوسرا بڑا فتنہ یہی انسان ناشناسی ہے۔ ہر شخص اپنے آپ میں مگن ہے۔ اسے بالکل یاد نہیں کہ اس کی شخصیت کی تعمیر میں دوسروں کا بھی حصہ ہے۔ اس کے اوپر کچھ دوسرے آدمیوں کے بھی احسانات ہیں جن کی قدرشناسی ضروری ہے۔ دور کے لوگوں کو تو چھوڑیے آج انسان ناشناسی کی یہ بیماری اس حد تک آگے بڑھ چکی ہے کہ آدمی اپنے قریب ترین اعزہ یہاں تک کہ اپنے والدین اور ماں باپ تک کا حق شناس نہیں رہ گیا ہے۔ اس کا عبرتناک منظر دیکھنا ہو تو آج کے یورپ پر نگاہ ڈالیے جہاں بوڑھے والدین اپنے آخری ایام اس حسرت کے ساتھ گزارتے ہیں کہ کاش موت جلد انہیں اپنی آغوش میں لے لے [illegible] ان کے قائم کردہ ان اداروں کے [illegible] کرتے ہیں [illegible] اور [illegible] [illegible] زندگی کے [illegible] [illegible] آگئی ہے۔ ایک طرف والدین [illegible]

طرف اولاد اپنی دنیا میں مگن ہے، از کار رفتہ والدین کا بوجھ اپنے سر پر لاد کر وہ اپنے پیسے زندگی کے لطف کو کرکرا کرنا نہیں چاہتی۔ یہاں تک کہ بسا اوقات والدین کی موت کی اطلاع بھی سعادت مند اولاد کو فون کے ذریعہ ملتی ہے۔ خوش بخت والدین وہ ہیں جن کے آخری رسومات کے سلسلے میں حکومت کے محکمۂ تجہیز و تکفین کو بذریعہ فون یہ اطلاع ملتی ہے کہ اس کے اخراجات اولاد کے کھاتے [illegible] سے منہا کر لیے جائیں۔ ورنہ اکثریت انہی والدین کی ہے جو اس کی حسرت بھی اپنے ساتھ ہی لے جاتے ہیں۔

جنریشن گیپ کا مسئلہ: انسان بہت کچھ حالات کی پیداوار ہے۔ وہ ناگزیر طور پر اپنے ماحول سے متاثر ہوتا اور اس کے اچھے یا برے اثرات کو قبول کرتا ہے آج کل بعض اسلام پسند حلقوں میں اپنے بزرگوں اور بڑوں سے بیزاری اور بے نیازی کی جو کسی قدر کیفیت پائی جاتی ہے دورِ جدید کے اس خاص پس منظر کا بھی اس میں کچھ دخل ہو تو اس پر بہت زیادہ تعجب کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں تک کہ بعض علما تک یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ جنریشن گیپ، کا مسئلہ ملت کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ قوم کی بوڑھی نسل اپنی اہمیت و افادیت کو بہت کچھ کھو چکی ہے۔ دین و ملت کے مفادات کے تحفظ کے لیے اب نئی نسل کا دور آ چکا ہے۔ قوم کی زمام کار اب اس کے حوالہ کر دینا چاہئے۔ ایسا نہ کیا گیا تو دین و ملت ان میں سے کسی کی خیر نہیں۔ پرانی نسل ہی نئی نسل کے عزائم اور حوصلوں کا ساتھ نہیں دے سکتی اس لیے اب اسے کلی طور پر دین و ملت کے مسائل سے ریٹائر ہو جانا چاہئے۔ علیحدہ طلبہ تنظیم کی تشکیل میں جنریشن گیپ، کا یہ پس منظر غالباً کسی نہ کسی حد تک ضرور شامل ہے، اس لیے اسلام کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اسلام جنریشن گیپ کے مسئلہ کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔ نیز یہ کہ اسلامی طلبہ تنظیموں کے ڈھانچے کے سلسلے میں اس کا مطلوبہ تصور کیا ہے؟

جنریشن گیپ کا مسئلہ اور اسلام: اسلام کے لیے امت کے اندر نسلوں کے اس طرح کے فاصلہ کا تصور قابل قبول نہیں جس سے اس کے بزرگ اور نوجوان ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ قرآن تو قیامت کے احوال کی نقشہ کشی کرتے ہوئے دنیا کے تمام انسانوں کو تین طبقات 'اصحاب المیمنہ' (دائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال پانے والے خوش قسمت) اصحاب المشئمۃ (بائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال پانے والے جہنمی لوگ) اور السابقون السابقون (بازی مار لے جانے والے خدا تعالیٰ کی خاص قربت کے مستحقین) میں تقسیم کرتے

ہوئے صراحت کرتا ہے کہ دوسرے تمام پیغمبروں کی طرح اس امت کے اندر بھی اس کی آخری نسلوں میں ہر دور اور ہر زمانہ کی طرح خدا کی خاص قربت کے سب سے بلند مقام سے نوازے جانے والے 'سابقون السابقون' کا ایک طبقہ موجود رہے گا۔ جہاں تک ان کے بعد جنت کی ابدی نعمتوں سے شادکام ہونے والے 'اصحاب الیمنہ' (دائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال پانے والے خوش بخت، جنتی لوگوں) کا تعلق ہے تو دوسرے ادوار کی طرح اس امت کے دوراول کے ساتھ اس کے دور آخر میں بھی ان کی اسی طرح فراوانی ہوگی:

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۙ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۚ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ۞ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ۙ وَقَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ ۞ (واقعہ: ۱۰-۱۴) - - - - - - - - - - - - -	اور بازی مارلے جانے والے ہاں بازی مارلے جانے والے یہی ہیں جو (حق تعالیٰ کی) خاص قربت سے نوازے جائیں گے۔ یہ نعمت بھرے باغات میں ہوں گے۔ ان میں بڑی تعداد اگلوں کی ہوگی۔ اور ایک جماعت پچھلوں میں سے بھی ہوگی۔

آگے 'اصحاب الیمنہ' دائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال پانے والوں کو جنت میں حاصل ہونے والی نعمتوں کی تفصیل کے بعد فرمایا:

وَاَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ ۞ - - - - - - - - ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ۞ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ ۞ (واقعہ: ۲۷-۴۰)	اور دائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال پانے والے، کیا کہنا ان دائیں ہاتھ والوں کا ..... ان میں بڑی تعداد اگلوں کی ہوگی۔ اور ایسی ہی بڑی تعداد پچھلوں میں سے بھی ہوگی۔

جس کی وضاحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان بے شمار احادیث سے ہوتی ہے، جن میں آپ نے صراحت کی ہے کہ اس امت کے اندر ہر دور اور ہر زمانہ میں اور ہر جگہ اور ہر سطح پر ایسے حق پسندوں کی ایک جماعت موجود رہے گی جو دین پر خود عمل کرنے کے ساتھ اس کے تقاضوں کو برپا کرنے کے لیے

---

[1] بہت سے مفسرین نے 'سابقون' سے حضرات انبیاء علیہم السلام اور 'اولین' سے اس امت سے پہلے کی امتوں کو مراد لیا ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس تخصیص کی کوئی وجہ نہیں۔ قرآن نے نیکی اور بھلائی کے کاموں میں سبقت اور دین کے تقاضوں کی ادائیگی میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے اور ساتھ ہی حق تعالیٰ کی قربت و معیت کو آیت بالا

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

ہمہ آن معروف جد وجہد رہے گی۔ اور مخالفتوں کا بڑے سے بڑا طوفان بھی اس کو اس راستے سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہوگا۔ اور یہ سلسلہ قیامت تک اسی طرح قائم رہے گا۔

لایزال من امتی امۃ قائمۃ بامر اللہ لایضرھم من خذلھم ولا من خالفھم حتی یاتی امر اللہ وھم علی ذالک۔[1]

- - - - - - - - - - - - - -

میری امت میں سے ایک جماعت برابر اللہ کے دین کو مضبوطی سے تھامے قائم و موجود رہے گی، جو انھیں چھوڑیں گے یا جو ان کی مخالفت کے درپے ہوں گے ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ یہاں تک کہ قیامت آجائے گی اور وہ اسی حال پر ثابت قدم رہیں گے۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے موقع پر صراحت فرماتے ہیں کہ اس امت کے اندر ہر نسل کے بعد دوسری نسل میں ایسے حق پرست پیدا ہوتے رہیں گے جو دین کے سلسلے میں پیدا ہو جانے والی بے اعتدالیوں کو زائل کرکے قیامت تک کے لیے اس کے صاف شفاف چہرے کو نکھارتے رہیں گے۔ حضرت ابراہیم بن عبدالرحمن عُذری فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تحریف الغالین وانتحال المبطلین و

علم (دین) کی اس امانت کو ہر آنے والی نسل کے راست باز لوگ (مسلسل اور لگاتار) اپنے سینے سے لگائے رہیں گے۔ جو اس سے غلو کرنے والوں

---

[1] متفق علیہ، بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح جلد ۲۔ کتاب الفتن، باب ثواب ہذہ الامۃ

دیگر سوابقین کی طرح دوسرے مقامات میں تمام خوب کاروں کے لیے عام رکھا ہے۔ اسی طرح 'اولین' کو اگر پچھلی امتوں کے لیے بھی عام مانا جائے تو 'اولین وآخرین' کا اطلاق مقدم طور پر اس امت مرحومہ پر ہوگا اس لیے کہ صحیح ترین روایات سے ثابت ہے کہ گذشتہ تمام امتوں کے مقابلہ میں صلحاء و اتقیاء کی تعداد اس کے اندر زیادہ اور جنت کا بڑا حصہ اسی کے دم قدم سے آباد ہوگا۔ حافظ ابن کثیر آیت کی اسی تاویل کو زیادہ راجح قرار دیتے ہیں۔ تفسیر ابن کثیر ۴/۲۸۱۔۲۸۵ مکتبہ تجاریہ کبریٰ، مصر ۱۹۳۶ء، ہمارے دور کے مفسرین میں مولانا امین احسن اصلاحی بھی اولین سے اسی امت کے اولین و آخرین مراد لیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو، تدبر قرآن: ۷/۱۶۳، ۱۶۹ فاران فاؤنڈیشن، پاکستان ۱۹۷۹ء

تاویل الجاھلین لہ ۔ کی تحریفات، باطل پسندوں کی من گھڑت باتوں اور ناواقف کاروں کی بے جا تاویلات کے غبار کو برابر صاف کرتے رہیں گے۔

طلبہ تنظیموں کا ڈھانچہ ـــ اسلام کا مطلوبہ رویہ: قرآن وسنت کے ان نصوص کا صاف تقاضا ہے کہ امت کے اندر قیامت تک ہر دور اور ہر زمانہ میں ایسی حق پرست جماعت موجود رہے گی جس سے دین وایمان کے سلسلے میں برابر روشنی حاصل کی جاتی رہے گی۔ اس کا امکان ضرور ہے کہ کچھ لوگ دین کا علم رکھ کر اس پر عمل کی دولت سے محروم ہوں اور دین کے نام پر دین وملت کا سودا کرنے سے بھی نہ چوکیں لیکن ظاہر ہے کہ نصوص بالا میں جو بات کہی گئی ہے وہ اس صورت حال کو مستثنیٰ کر کے ہی کہی گئی ہے۔ یقیناً اس کے بعد امت کے دوسرے تمام طبقات کی طرح طلبہ اور نوجوانوں کے لیے بھی اس پہلو سے مایوسی کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ امت کے اندر ان شاء اللہ ایسے لوگوں کی ایک جماعت ہمیشہ موجود رہے گی جو ان کی صحیح دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی رہے گی۔ اس سلسلے میں جہاں تک ترجیح وانتخاب کا سوال ہے تو وہ تو ایک فطری اور بدیہی چیز ہے۔ زندگی کے دوسرے تمام دائروں کی طرح مسلمان طلبہ اور نوجوانوں کو بھی یہ اختیار بہر حال حاصل ہے کہ وہ اپنی اصلاح وتربیت اور دین اور دعوت کے تقاضوں کی تکمیل کے سلسلے میں اپنے لیے بہتر سے بہتر شخص اور جماعت کا انتخاب کرسکیں۔ لیکن فی الجملہ امت اور اکابرین امت سے مایوس وبیزار ہونے کی کسی کے لیے بہر حال گنجائش نہیں ہے۔ ذیل میں ہم اس سلسلے میں دوسرے نصوص پیش کرتے ہیں جن سے واضح ہوگا کہ سماجی ومعاشرتی معاملات کی طرح امت کے دینی وجماعتی معاملات میں اپنے سے بڑوں اور بزرگوں کی مرجعیت کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ عقل عام کے اس فیصلہ کے اضافہ کے ساتھ کہ جب ہر فن کے سلسلے میں اس کے ماہرین کو نظر انداز کر کے اس کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا، تو اصلاح وتزکیہ اور دعوت واصلاح سب سے زیادہ اہم مشکل اور نازک فن کا حق اس کے بغیر کیونکر ادا کیا جاسکتا ہے

لہ رواہ البیہقی فی کتاب المدخل مرسلاً، بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح جلد۱۔ کتاب العلم، فصل ثانی۔ اس امت کی فی الجملہ خیریت اور قیامت تک کے لیے اس [illegible] جماعت کی موجودگی کی تفصیل کی دیگر احادیث کے لیے ملاحظہ ہو مشکوٰۃ المصابیح جلد ۲ کتاب [illegible] نیز تفسیر ابن کثیر: ۱۴/۲ [illegible] محولہ بالا۔

جبکہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ اہل اور انسانوں کی منتخب جماعت جماعت حضرات انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا۔ ہندوستان کے خاص حالات کے پس منظر میں اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ صحیح دینی رہنمائی کے بغیر اگر خدانخواستہ نوجوانی کے جوش میں کوئی نامناسب اقدام ہوجائے، تو دین اور دعوت دین کو ایسے کسی نقصان کا پہنچ جانا خارج از امکان نہیں جس کی تلافی شاید بہت دور تک نہ کی جاسکے گی۔ دین اور دعوت دین اور امت کے اجتماعی امور و مسائل کے سلسلے میں اپنے بڑوں کی ناگزیر رہنمائی کی اہمیت و ضرورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی درج ذیل احادیث سے ثابت ہے جنھیں ان چند عنوانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے،

بڑوں کا احترام: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث ہے کہ جو کوئی ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کا حق نہ پہچانے وہ ہم میں سے نہیں:

من لم یرحم صغیرنا ویعرف حق کبیرنا فلیس منّا[1] دوسرے موقعہ پر اسے امت مسلمہ کے مقصد وجود 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کے ساتھ جوڑ کر بیان فرمایا۔ جس سے اس حکم کی مزید اہمیت وعظمت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا ویامر بالمعروف وینہ عن المنکر[2]	وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی توقیر و تعظیم نہ کرے اور بھلائی (معروف) کا حکم نہ دے اور برائی (منکر) سے منع نہ کرے۔

ان احادیث کو عام طور پر مسلمانوں کے معاشرتی ادب کے دائرے میں محصور رکھا جاتا ہے اسلامی معاشرہ کا امتیازی نشان ہے کہ اس کے اندر چھوٹوں کے ساتھ شفقت و مہربانی کا معاملہ اپنے سے بڑوں کا عزت و احترام وان کے ساتھ تعظیم و تکریم کا معاملہ کیا جائے۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ امت کی مطلوبہ سیادت و قیادت اور دین اور دعوت دین وغیرہ جیسے امت کے اجتماعی امور و مسائل کے سلسلے میں قوم کے صالح و خداترس اکابر کی مرکزیت و مرجعیت کے لیے ان احادیث سے استدلال نہ کیا جائے۔ اسے مذاق ہی کہا جائے گا کہ ہم اپنے بڑوں کے سامنے بیٹھیں تو باادب ہو کر اور

[1] ابوداؤد جلد ۲۔ کتاب الادب، باب فی الرحمۃ۔ نیز مسند احمد جلد ۲

[2] ترمذی جلد ۲۔ ابواب البر والصلہ، باب ما جاء فی رحمۃ الصبیان۔ قال الترمذی حدیث غریب

ان سے گفتگو کریں تو آواز مدھم اور نرم لب ولہجے ہیں، لیکن اس سے آگے جب معاملہ دین وملت کی نسبت سے اجتماعی اہم ترامور ومسائل کا آئے تو ہم انھیں درخور اعتنا نہ سمجھیں۔ اور از کار رفتہ خیال کے انھیں چھوڑ کر آگے نکل جانے ہی میں دین وملت کا مفاد باور کریں۔

خوب سمجھ لیا جائے کہ اسلام کی راہ میں رہتے اور اس کے لیے کام کرتے ہوئے جن خوش قسمت انسانوں کے بال سفید ہو جائیں، خدا تعالیٰ کے حضور ان کے مراتب بہت بلند ہیں۔ سماجی و معاشرتی دائرے میں ان کا ادب واحترام ملحوظ رکھنے کے ساتھ قومی واجتماعی معاملات میں ان کی مرکزیت کو تسلیم کرکے ہی ان کی واقعی توقیر وتعظیم کا حق ادا کیا جاسکتا ہے۔ حدیث ذیل میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پورے پس منظر کے ساتھ اس نکتے کو واضح فرمایا ہے:

عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ قال نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن نتف الشیب وقال ہو نور المومن وقال ما شاب رجل فی الاسلام شیبۃ الا رفعہ اللہ بہا درجۃ ومحیت عنہ بہا سیئۃ وکتبت لہ بہا حسنۃ وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس منا من لم یوقر کبیرنا ویرحم صغیرنا [1]

حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ اور پھر اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفید ہو جانے والے بالوں کو نوچنے سے منع فرمایا اور یہ ارشاد فرمایا کہ یہ مومن کا نور ہے۔ مزید ارشاد ہوا کہ جو کوئی شخص اسلام کے راستہ میں رہتے ہوئے اپنا کوئی بال سفید کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے اس کا ایک درجہ بلند فرماتا ہے۔ اور اس کے نامۂ اعمال سے ایک گناہ مٹا دیا جاتا ہے۔ اور اس کے حق میں ایک نیکی اور لکھ دی جاتی ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے بڑوں کی توقیر وتعظیم نہ کرے اور ہمارے چھوٹوں کے ساتھ شفقت ومحبت سے پیش نہ آئے۔

راہ خدا میں کام کرتے ہوئے جن خوش بختوں کو اپنے سیاہ بالوں کو سفید کرنے کی توفیق نصیب

[1] مسند احمد، ۲/۲۰۷

ہو، دوسری اور بہت سی حدیثوں میں بھی اس کے بڑے فضائل بیان کیے گئے ہیں[1] زندگی کے تمام معاملات میں اپنے بڑوں اور بزرگوں کی توقیر و تعظیم کرنا اور ان کی واقعی قدر و منزلت کا لحاظ رکھنا کوئی معمولی نیکی نہیں۔ بلکہ بہت بڑی نیکی ہے۔ اس سے بڑھ کر اس کی بڑائی کی دلیل اور کیا ہوگی کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حق تعالیٰ کے اجلال و اکرام کے مرادف گردانا ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان من اجلال اللہ اکرام ذی الشیبۃ المسلم .. الخ[2]

اللہ کی بزرگی اور تعظیم کا تقاضا ہے کہ اس مسلمان کے ساتھ عزت کا معاملہ کیا جائے جس کے بال اسی راستہ میں سفید ہوئے ہوں۔

عرض کیا جا چکا ہے کہ معاشرتی ادب و احترام اپنی معنویت یکسر کھو دے گا اگر قومی و اجتماعی امور و معاملات میں بڑوں کی خدمات و تجربات کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنے کو پالیسی کے طور پر اختیار کر لیا جائے۔

۲۔ بڑوں کی شکر گزاری: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری حدیث جو اس سلسلے میں ہمارا مرکز توجہ بنتی ہے اس کا کہنا ہے کہ جو کوئی انسانوں کا شکر گزار نہ ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کا حق ادا نہیں کر سکتا: لایشکر اللہ من لایشکر الناس[3] اسلام کے نزدیک دین کی بنیاد شکر گزاری پر قائم ہے۔ انسان کے اوپر اللہ تعالیٰ کے احسانات بے شمار اور اس کی نعمتیں بے پایاں ہیں۔ اپنی زندگی میں ان نعمتوں کا براہ راست تجربہ کر کے آدمی اپنے کو اس کے لیے مجبور پاتا ہے کہ وہ رب کریم کے دامن میں پناہ لے اور ہمہ آن اس کی حمد و ثنا کے نغمے گاتا رہے۔ اس کے ساتھ ہی اپنی حیات مستعار میں ہر انسان کسی نہ کسی درجہ

---

[1] ان احادیث کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ترمذی جلد ۱۔ ابواب السیر۔ باب ما جاء من شاب شیبۃ فی سبیل اللہ۔ نسائی جلد ۲۔ کتاب الجہاد۔ باب ثواب من رمی بسہم فی سبیل اللہ۔ نیز مسند احمد ۲/۲۱۳، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۸۴، ۲۸۶۔ ۶/۲۰، ۲۱۔ ایضاً مسند احمد: ۲/۱۷۹۔

[2] ابوداؤد جلد ۲۔ کتاب الادب، باب فی تنزیل الناس منازلہم۔ [3] مسند احمد: ۲/۲۹۵، ۳۰۲، ۳۸۸۔ نیز ترمذی جلد ۲۔ ابواب البر والصلۃ، باب ما جاء فی الشکر لمن احسن الیک۔ قال الترمذی فی الحدیث ہذا حدیث صحیح

ہیں دوسرے بے شمار انسانوں کے احسانات لئے لدا ہوا ہے۔ شکر گزاری کا یہ جذبہ جس کسی کے اندر موجزن ہوگا، اللہ تعالیٰ کے بے پایاں احسانات پر سراپا شکر و سپاس ہونے کے ساتھ وہ اپنے محسن انسانوں کا بھی لازماً احسان مند ہوگا۔ اور اس کی پوری زندگی میں اس شکر گزاری کی جھلک صاف طور پر نظر آئے گی۔

دوسرے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید کے لیے اسے ماضی کے صیغہ سے بیان فرمایا:

من لم يشكر الناس لم يشكر الله[1] — جو انسانوں کا شکر گزار نہ ہوا وہ اللہ کا شکر گزار نہ ہوا

جبکہ ایک اور جگہ مبالغہ کا صیغہ استعمال کر کے اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے مزید ترغیب کا سامان فراہم کیا ہے:

ان اشكر الناس لله اشكرهم للناس۔[2] — اللہ تعالیٰ کا جو جتنا شکر گزار ہوگا، انسانوں کا بھی وہ اسی نسبت سے شکر گزار ہوگا۔

ظاہر ہے انسانوں میں سب سے زیادہ اس شکر گزاری کے مستحق ان کے معنوی محسنین ہی ہوں گے۔ ایک مسلمان کی زندگی کی سب سے قیمتی دولت اس کا دین ہے۔ پس اس دنیا میں اس کا سب سے بڑا محسن وہ ہے جس کے واسطے سے اس کے لیے دین کی کوئی گرہ کھلے۔ اس کے لیے اس کی تربیت و اصلاح کا سامان ہو اور دین پر عمل اور اس کے تقاضوں کو سمجھنے کی راہیں سامنے آئیں۔ یوں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث عام ہے جس کے مخاطب بلا تفریق امت کے تمام افراد ہیں، لیکن کوئی شک نہیں کہ طلبہ اور نوجوانوں سے بڑھ کر اس کا اطلاق کسی دوسرے پر نہیں ہو سکتا۔ کہ اپنے بڑوں کی نسبت سے وہ احسان مندی کے سامنے زیادہ محتاج اور ضرورت مند ہیں۔ یقیناً اکابر کی شکر گزاری کا یہ تقاضا اس کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا کہ زندگی کے دوسرے امور و مسائل کی طرح دین و امت سے تعلق رکھنے والے اجتماعی امور و مسائل میں ان کی واقعی اہمیت و مرجعیت کو تسلیم کیا جائے۔ اور قومی اور جماعتی معاملات میں انھیں نظر انداز کرنے کے بجائے ان کے لیے نگاہوں کو فرش راہ کرتے ہوئے آگے بڑھایا جائے۔

---

[1] ترمذی، حوالہ سابق۔ نیز مسند احمد: ۲۸۸/۲۰۔ قال الترمذی فی الحدیث ہذا حدیث حسن صحیح۔ [2] مسند احمد ۲۱۲/۵

۳۔ انزلوا الناس منازلہم : اس کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری حدیث بھی ہے جس سے اس سلسلے میں ہمیں رہنمائی ملتی ہے۔ اور وہ یہ کہ ہمیں اپنی پوری زندگی میں ہر شخص کو وہ مقام دینا چاہیے جس کا کہ وہ ازروئے عقل وانصاف مستحق ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انزلوا الناس منازلھم [1] — تمام لوگوں کو ان کا جائز مقام دو جس کے کہ وہ مستحق ہیں۔

دوسرے موقع پر ان کے الفاظ ہیں:

امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ننزل الناس منازلھم [2] — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم تمام لوگوں کو ان کا جائز مقام دیں جس کے کہ وہ مستحق ہیں۔

ظاہر ہے جب دنیا کے رو سے تمام انسان اس کے مستحق ہیں کہ زندگی کے تمام دائروں میں انھیں ان کا جائز مقام دیا جائے تو اسلام مرحومہ کی نسبت سے جو لوگ اس کی دینی قیادت وسیادت کے مقام پر فائز ہوں وہ تو بدرجہ اولیٰ اس کے مستحق ہوں گے۔ اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر ہماری اس عام گفتگو کے پس منظر میں عمل اسی وقت کیا جا سکے گا جبکہ مسلمان طلبہ اور نوجوانوں کی طرف سے دین وملت سے تعلق رکھنے والے اجتماعی امور ومسائل میں ان کا قرار واقعی مقام تسلیم کیا جائے اور دین اور دعوت دین کے کام میں اپنے بڑوں اور بزرگوں کی خدمات اور ان کے تجربات سے پوری طرح فائدہ اٹھایا جائے۔

---

[1] ابوداؤد جلد ۲۔ کتاب الادب باب فی تنزیل الناس منازلہم۔ [2] مقدمہ صحیح مسلم: اس پہلی حدیث کے سلسلے میں امام ابوداؤد نے یہ نوٹ لگایا ہے کہ اس کے راوی میمون بن ابی شبیب نے حضرت عائشہؓ کا زمانہ نہیں پایا یا یہ کہ ان سے ان کی ملاقات ثابت نہیں، "قال ابوداؤد میمون لم یدرک عائشۃ" (ابوداؤد حوالہ سابق) صحیح مسلم کے شارح امام نووی فرماتے ہیں کہ ابوداؤد کا یہ کہنا بہت کچھ محل نظر ہے اس لیے کہ میمون بن ابی شبیب کوفہ کے کافی پرانے آدمی ہیں جنھوں نے مغیرہ بن شعبہ کا زمانہ پایا ہے جبکہ مغیرہ کی وفات حضرت عائشہ سے پہلے ہوئی ہے۔ مزید براں فن حدیث کے سلسلہ میں امام مسلم کے نزدیک روایت کی صحت کے لیے ملنے کے ثبوت کے سلسلے میں ملاقات کے امکان کے ساتھ ہم زمانہ کا ایک ہونا کافی ہے۔ ملاقات

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

۴۔ مسلمانوں سے محبت: قرآن و حدیث کی ایک دوسری تعلیم بھی ہمارے لیے بہت قابلِ توجہ ہے۔ قرآن نے تمام مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی قرار دیا ہے[1]۔ احادیث میں اس کے تقاضوں کی وضاحت کے ساتھ یہی بات مزید تفصیل سے کہی گئی ہے[2]۔ اس برادرانہ تعلق کا لازمی تقاضا ہے کہ اسلامی جماعت میں باہم الفت و محبت کے انتہائی گہرے تعلقات قائم ہوں۔ یہاں تک کہ ایک حدیث میں اسے ایمان کا لازمی تقاضا قرار دیا گیا ہے۔ آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ابھارنے اور پروان چڑھانے کی ایک عملی تدبیر کی بھی نشاندہی فرمائی ہے۔ آپؐ کی مشہور حدیث ہے:

لا تدخلون الجنة حتى تومنوا ولا تومنوا حتى تحابوا اولا ادلكم على شئ اذا فعلتموه تحاببتم افشوا السلام بينكم[3]

تم جنت میں داخل نہیں ہوسکتے یہاں تک کہ تم ایمان والے ہو اور تم ایمان والے نہیں ہوسکتے یہاں تک کہ تم آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرو۔ کیا میں تمہیں وہ بات بتاؤں کہ اگر تم اس پر عمل پیرا ہو تو آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو آپس میں سلام کو خوب رواج دو۔

[1] حجرات: ۱۰ [2] ان احادیث کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، مشکوٰۃ المصابیح جلد ۲۔ کتاب الادب، باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق۔ [3] مسلم جلد ۱۔ کتاب الایمان، باب بیان انہ لایدخل الجنۃ الا المومنون وان محبۃ المومنین من الایمان۔

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ) کی صراحت ضروری نہیں ہے۔ تو اگر میمون کی طرف سے صاف لفظوں میں یہ بات آئی ہوتی کہ عائشہؓ سے میری ملاقات نہیں تو ابوداؤد کے لیے تعین کے ساتھ یہ کہنا درست ہوتا کہ انھوں نے انھیں نہیں پایا۔ لیکن افسوس کہ یہاں یہ چیز حاصل نہیں الخ۔ آگے امام نووی فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ کی اس حدیث کو امام بزار نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔ البتہ اس کے سلسلے میں وہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث صرف اسی طریقے سے جانی جاتی ہے۔ ہاں موقوف روایت کے طور پر حضرت عائشہ سے دوسرے مختلف طریقوں سے مروی ہے۔ امام مسلم کی روایت کے سلسلے میں امام موصوف فرماتے ہیں کہ چونکہ انھوں نے اسے 'وقد ذکر عن عائشۃؓ' کے ڈھیلے الفاظ سے بیان کیا ہے اس لیے اس کی صحت کی قطعیت کی بات تو نہیں کی جاسکتی۔ البتہ چونکہ یہاں وہ اسے اصل کے طور پر لائے ہیں شاہد (اور متابع) کے طور پر نہیں اس لیے اس کا تقاضا ہے کہ اس روایت کی صحت کو تسلیم کیا جائے۔ ہاں امام حاکم نے اپنی کتاب 'معرفۃ علوم الحدیث' میں اس کی صحت کا فیصلہ کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب[1]

[1] مقدمہ النووی علی شرحہ للمسلم مع المسلم: ۱/ ۱۴ اصح المطابع، دہلی،

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان احادیث کو بھی عام طور پر مسلمانوں کے معاشرتی ادب کے دائرے تک محدود سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس سے آگے امت مسلمہ کے مقصد وجود سے ان احادیث کا گہرا تعلق ہے۔ امت مسلمہ دنیا میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے جس عظیم مقصد کے لیے برپا کی گئی ہے اس کا لازمی تقاضا ہے کہ اسے ہر جگہ اور ہر سطح پر الفت ومحبت کے مضبوط رشتے میں بندھا ہوا ہونا چاہیے۔ اسے ان تمام چیزوں سے سختی سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے جو اس کے اس تعلق اور رشتہ کو مجروح کرنے والی ہوں۔ اس کے لیے ہمیں سورۂ آل عمران کا مطالعہ کرنا چاہئے جس میں امت مسلمہ کے مذکورہ فریضۂ منصبی کی وضاحت سے پہلے اس کی مقدم شرط کے طور پر تمام مسلمانوں کو مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط تھامنے کی تلقین اور انتشار وافتراق سے دور رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا[1] (اور تم سب مل کر اللہ کی رسی (اس کے دین) کو مضبوط تھام لو اور افتراق وانتشار کا شکار نہ ہو۔

یہی چیز ہے جسے اس سے پہلے صراط مستقیم سے تعبیر کیا گیا ہے:

ومن یعتصم باللہ فقد ھدی الی صراط مستقیم[2] (اور جو کوئی اللہ کے دین) کو مضبوط پکڑ لے تو اسے سیدھے راستے کی رہنمائی مل گئی۔

جس سے ہٹ کر صرف شیطان کے راستوں کی پیروی کی راہ ہی باقی رہ جاتی ہے۔

یایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوات الشیطان[3] اے لوگو جو ایمان لائے ہو اسلام میں تم سب مل کر داخل ہو۔ اور شیطان کے دکھائے ہوئے راستوں کی پیروی نہ کرو۔

معلوم ہوا کہ 'واعتصموا بحبل اللہ جمیعا' (اور اللہ کی رسی (اس کے دین) کو تم سب مل کر مضبوط تھام لو) اور 'ادخلوا فی السلم کافۃ' (اور تم سب تمام کے تمام اسلام میں داخل ہو جاؤ) میں جو کچھ فرمایا گیا ہے، وہی بات دوسرے لفظوں میں حدیث بالا میں 'لا تؤمنوا حتی تحابوا' (تم ایمان والے نہیں ہو سکتے یہاں تک آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرو) کے الفاظ سے ادا کی گئی ہے[4]

---

[1] آل عمران ۱۰۳، [2] آل عمران ۱۰۱ [3] بقرہ ۲۰۸ [4] یہ نکتہ علامہ العصر حمید الدین فراہیؒ کے غیر مطبوعہ قرآنی حواشی سے ماخوذ ہے سورۂ آل عمران آیات ۱۰۱ تا ۱۰۳)

صدر اول میں اسلامی جماعت کے اندر دوسری چیزوں کے علاوہ الفت و محبت کا یہی رشتہ تھا جس کی بدولت اس نے کفر و شرک کے قلعوں کو تہ و بالا کر ڈالا اتفاقاً تاریخ و سیر کی کتابیں اس کے شواہد سے بھری پڑی ہیں۔

ایک نظریاتی گروہ کی حیثیت سے امت مسلمہ کا یہ مطلوبہ الفت و محبت کا ناگزیر باہمی تعلق یقیناً طلبہ اور نوجوانوں کو بھی اپنے دائرے میں شامل کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بلکہ شاید اپنے بڑوں اور بزرگوں کی نسبت سے ان کے لیے اس کے تقاضے کچھ آگے اور بڑھے ہی ہوئے ہوں گے۔ امت کے اندر الفت و محبت کے اس مطلوبہ وصف کی آبیاری اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ اس کے دوسرے تمام طبقات کی طرح طلبہ اور نوجوانوں کی طرف سے بھی اس کی قرارداد واقعی پذیرائی ہو۔ وہ امت کے دوسرے عناصر کی طرح اس کے خدا ترس اور مخلص اکابرین کے لیے سر تا پا اخلاص اور عقیدت و محبت کے جذبات سے لبریز ہوں۔ اس مطلوبہ وصف اور اپنے بڑوں سے بے نیازی و بے توجہی میں جو عظیم فاصلہ ہے اسے آسانی کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ قرآن کا مطلوبہ نوجوان: آگے قرآن اپنے مطلوبہ نوجوان کا بھی یہی کچھ نقشہ پیش کرتا ہے۔ سورۂ کہف میں حضرت موسیٰ اور ان کے جوان کی جو سرگذشت بیان ہوئی ہے، اس کی تفصیل میں مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ یوشع بن نون تھے جو ان کے خادم خاص اور سفر و حضر میں ہر وقت ان کے ساتھ رہتے اور ان سے علم دین کی تحصیل میں لگے رہتے تھے[1]۔ اسی کی برکت سے وہ آں جناب کی زندگی میں پیغمبری کے منصب سے سرفراز کئے گئے اور ان کے بعد ان کی جانشینی سے نوازے گئے[2]۔ حضرت خضر سے علمی ملاقات کے سفر میں حضرت موسیٰ کے ساتھ ان صالح جوان کی معیت اس کا صاف پتہ دیتی ہے کہ اپنے بزرگ کی طرح ان کے اندر بھی اپنے کو علم سے آراستہ کرنے اور علمی و فکری ہر پہلو سے اپنے کو پختہ سے پختہ تر کرنے کا ایسا جذبہ موجزن تھا جو کہیں تھمنے کا نام نہیں لیتا تھا۔

پیغمبر کے اس حاضر باش نوجوان کی اس سیرت کا بھی صاف اشارہ ملتا ہے کہ مسلمان امت کے طلبہ اور نوجوانوں کو اپنے مثالی اکابر اور بزرگوں کے پیچھے لگ کر اپنے کو علم و عمل ہر پہلو سے زیادہ سے زیادہ پختہ بنانے کے لیے فکرمند اور کوشاں ہونا چاہئے۔ ظاہر ہے یہ چیز بڑوں

---

[1] تفسیر الجلالین / ۳۸۹۔ دار المعرفہ، بیروت ۱۴۰۳ھ / ۱۹۸۳ء [2] تفسیر موضح القرآن / ۷۹۲۔ تاج کمپنی، لاہور۔

سے عقیدت و محبت اور ان سے یک گونہ جذباتی تعلق کے ذریعہ ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ بے نیازی و بے زاری اور ذہنی فاصلوں کے ہوتے ہوئے اس کی راہ نہیں کھل سکتی ہے[1]

علیحدہ تنظیم کے لوازم: لیکن اس گفتگو کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان طلبہ اور نوجوانوں کے لیے اپنی علیحدہ تنظیم اور تحریک چلانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے یقیناً طلبہ اور نوجوان اپنی آزاد اور خود مختار تنظیمیں اور تحریکیں چلا سکتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات ان کے لیے ایسا کرنا مستحسن و مطلوب سے آگے واجب اور ضروری ہوگا۔ لیکن اس کے لیے تین شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

۱۔ **واضح نصب العین:** ہر دوسری تحریک و تنظیم کی طرح آزاد اور خود مختار طلبہ تنظیم یا تحریک کے لیے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ کہ اس کا اپنا علیحدہ واضح نصب العین ہو۔ جو قرآن و سنت کی روشنی میں پوری طرح جانچا اور کسا ہو اور اس کے تمام وابستگان کو اس پر کامل شرح صدر حاصل ہو۔ بسا اوقات اس کا امکان ہے کہ دین کی ترویج و اشاعت اور اس

---

[1] قرآن کے مطلوبہ نوجوان کی بحث میں اس واقعہ سے ہمارے اس ضمنی استدلال کے سلسلے میں یہ اشکال پیش آسکتا ہے کہ قرآن نے نبوت کے بعد سیدنا ابراہیمؑ کے لیے 'فتی' (جوان) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جبکہ نبوت کی عمر چالیس سال متفقہ ہے۔ حضرت عیسیٰ کے سلسلے میں یہ جو مشہور ہے کہ وہ نبوت کے سارے معجزے ۳۵، ۳۶ سال کی عمر میں دکھا کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ) لیکن بات یہ ہے کہ 'فتی' کے اصل معنی 'جوان' ہی کے ہیں۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ نو مقامات پر آیا ہے۔ اور موقع کی مناسبت سے چند ایک کے علاوہ حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے ہر جگہ اس کا ترجمہ 'جوان' ہی سے کیا ہے۔ 'لسان العرب' میں بھی 'الفتاء' کے معنی 'الشباب' (جوانی) اور 'الفتی' اور 'الفتیۃ' کے معنی 'الشاب' اور 'الشابہ' جوان لڑکا اور لڑکی ہی بیان کئے گئے ہیں: (جلد: ۱۴۵/۶۳، دارصادر بیروت) البتہ آگے صاحب لسان نے مشہور لغوی قتیبی کا ایک قول نقل کیا ہے کہ 'فتی' کے معنی 'جوان' اور 'حدیث السن' کے نہیں بلکہ اس کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جو عقل و خرد میں پختہ اور حالات سے عہدہ برآ ہونے میں مرد کامل ہو اس کے لیے انھوں نے کلام عرب سے شواہد بھی پیش کئے ہیں۔ ۱۴۸ لیکن ان اشعار کی یہ توجیہ آسانی کے ساتھ کی جا سکتی ہے کہ 'فتی' کے اصل معنی تو 'جوان' اور 'نوجوان' ہی کے ہیں۔ البتہ اس کا اطلاق ان لوگوں پر بھی ہوتا ہے جو عمر رسیدہ ہو کر بھی ... وصف کے ساتھ جوانی کا جوش اور وہی حوصلہ اور امنگ بھی رکھتے ہوں۔ سیدنا ابراہیم کے لیے اس لفظ کے استعمال میں بھی یہی معنویت معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

کے احیاء و سربلندی کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کچھ نوجوانوں اور کم عمروں کے سامنے وہ حقائق کھول دے جن تک وقت کے بڑوں بڑوں کی رسائی نہ ہو سکے۔ مثل مشہور ہی ہے کہ:

گاہ باشد کہ کودکے ناداں — بہ غلط بر ہدف زند تیرے

اسلام کے احیاء اور اسے غالب و سربلند دیکھنے کے سلسلے میں اپنے گرد و پیش بلکہ بسا اوقات وسیع تر دائرے عالم اسلام کی سطح پر بھی کسی ایسی کمی اور خلا کو محسوس کیا جا سکتا ہے جسے پُر کرنے کے لیے ضروری ہو کہ دین کی خدمت کے لیے موجود اداروں اور تحریکات میں نئی تنظیم اور تحریک کا اضافہ کیا جائے۔ عالم اسلام سے ہٹ کر خود ہمارا ملک ہندوستان ماضی قریب میں اس سلسلے کا خوش گوار تجربہ کر چکا ہے جبکہ تجدید و احیاء دین کی نسبت سے علم دین سے آراستہ غیر دستار بند نوجوانوں کی شعلہ بار تحریروں نے وقت کے بڑے بڑے اکابر کو اپنی جگہ سے ہلا کر نئے سرے سے سوچنے کے لیے متوجہ کر دیا۔ چنانچہ انھوں نے برسر عام اس کا اعتراف کیا اور اس کی کھلے دل سے تحسین کی۔[1] تقسیم سے پہلے برصغیر ہند کی سب سے زیادہ منظم اور فعال اسلامی تحریک کو قائم کرنے کی بھی جس شخصیت کو بارگاہ ایزدی سے توفیق کی ارزانی ہوئی وہ بھی جبکہ وہ اپنے معروف ماہنامے کے ذریعہ پورے ملک میں آگ لگائے ہوئے تھا کوئی بوڑھا اور سن رسیدہ نہیں بلکہ ۳۰، ۳۵ سال کا نوجوان ہی تھا۔[2] مزید براں کچھ آگے جن لوگوں نے اس کی اس آواز پر لبیک کہا تھا ان کی بڑی اکثریت بھی عموماً اس سے کم سن نوجوانوں ہی کی تھی۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ آج دین کا درد رکھنے والے طلباء اور نوجوانوں کو علٰحدہ تنظیم اور تحریک کے حق سے محروم رکھا جائے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ ان کے سامنے

---

[1] اشارہ ہے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور کے 'الہلال' اور 'البلاغ' کی طرف جس سے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے رتبہ کے لوگ غیر معمولی طور پر متاثر اور معترف تھے۔ [2] بعض احباب اس پس منظر میں علٰحدہ تنظیم کے جواز کے حق میں بانی جماعت اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے نمونہ کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن شاید وہ ان کی آگے کی زندگی کے نمونے کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ حالات کے اپنے تجزیے سے جب انھوں نے علٰحدہ دینی تحریک کی ضرورت محسوس کی تو اس کے حق میں انھوں نے مکمل فکری مواد فراہم کیا۔ اور اس کے تقاضوں کی ادائیگی کے لیے اپنی پوری زندگی اسی کام میں لگا دی۔ اور خدا کے فضل سے اپنے پیچھے مخلصین کی ایک پوری ٹیم چھوڑ کر گئے۔ بانی تحریک کے اس نمونہ سے ان احباب کے نمونے شاید میل نہیں کھاتے جنھوں نے علٰحدہ تحریک کا علم تو بلند کیا لیکن آگے کی اس کی ضرورتوں کا لحاظ نہ کر کے غالباً بہت جلد الگ الگ اپنی بیرکوں میں واپس چلے گئے۔

پیش نظر کام کی نسبت سے 'نصب العین' بالکل 'واضح' ہو۔ اور قرآن وسنت سے اسے اس طرح مبرہن ومدلل کر دیا گیا ہو کہ اس کی حقانیت اور اس کی افادیت وضرورت کے سلسلے میں کسی حق پسند کے لیے بجا طور پر کوئی کلام نہ رہے۔

۲۔ متعین طریقۂ کار: بسا اوقات مقصد اور نصب العین کے اتحاد و یکسانیت کے باوجود طریقۂ کار کے اختلاف کا تقاضا ہوتا ہے کہ الگ ادارہ کی طرح علٰحدہ تنظیم وتحریک کی بنیاد رکھی جائے۔

ظاہر ہے امت کے دوسرے تمام طبقات کی طرح قرآن وسنت کی روشنی میں حالات کے تجزیہ اور اس کی مناسبت سے دین کی تجدید اور اسلام کے احیاء وسربلندی کے لیے طریق کار اور لائحۂ عمل کی تعیین وتشخیص کا حق طلبہ اور نوجوانوں کو بھی حاصل ہے۔ اور یہاں بھی اس کا امکان ہے کہ بسا اوقات نصب العین کی طرح، طریقۂ کار کی تعیین میں بھی بیت بڑوں کے مقابلہ میں ان کا نشانہ صحیح ہو۔ لیکن علٰحدہ تحریک کے مقصد اور نصب العین کی طرح اس طریقۂ کار کو بھی بالکل واضح اور متعین ہونا چاہیے۔ جس میں طلبہ تحریک کی اس عملی ضرورت کا اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ نصب العین کی طرح طریقۂ کار کے اختلاف کی صورت میں کارکنان تحریک کے اندر اگر اس کی مسلسل ترجمانی اور تفہیم کا فرض انجام نہ دیا جاتا ہے تو زیادہ دور تک ان کی صفوں میں اتحاد واتفاق اور ذہنی وفکری یکسوئی کو بھی برقرار رکھنا مشکل ہوگا علٰحدہ طلبہ تحریک کے لیے الگ معین طریقۂ کار کافی بنیاد ہے۔ لیکن بات یہی ہے کہ اسے افراد کے ذہنوں ہی میں نہیں بلکہ الفاظ میں متعین ومبرہن ہونا چاہیے جسے آسانی کے ساتھ سمجھا اور دوسروں کو سمجھایا جا سکے۔

۳۔ مخلص کارکنوں کی ضرورت: نصب العین واضح اور طریقۂ کار بالکل متعین ہو، پھر بھی تحریک کے لیے ایک تیسری چیز ناگزیر اہمیت کی حامل ہے۔ اور وہ ہے مخلص کارکنوں کی موجودگی۔ جو اس کو ——— اپنا اوڑھنا بچھونا بنا چکے ہوں۔ رنگ بہت اچھا اور اس کو چڑھانے کا طریقہ بھی معلوم، لیکن اگر وہ ہاتھ ہی موجود نہ ہوں جن کے ذریعہ صحیح معنوں میں رنگ اپنا رنگ دکھا سکے تو اپنی تمام خوبیوں اور اچھائیوں کے باوجود وہ رنگ بے رنگ ہی رہے گا۔ اس لیے کسی بھی دوسری تحریک کی طرح الگ اور مستقل طلبہ تحریک کے لیے بھی ناگزیر ہے کہ اس کے پاس مخلص کارکنوں کی ٹیم موجود ہو۔ جو سود وزیاں سے آزاد ہو کر تحریک کی نیند سوئے اور اسی کی نیند جاگے۔ یوں تو تحریک کے لیے مخلص کارکنوں کی ضرورت ہر جگہ اور ہر سطح پر ہوتی ہے۔ لیکن خاص طور پر اس کی ضرورت اس کے صف اول کے لوگوں میں ہوتی ہے۔ جن کے ذریعہ ہی اصلاً کسی تحریک کو جانا جاتا ہے اور اس سے قربت

وشمولیت کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ اس معنی میں تحریک کو بالکل ادارہ کی مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اداروں کو بعض خاص افراد کے ذریعہ ہی جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ علٰحدہ طلبہ تحریک کی بھی یہ ناگزیر ضرورت ہے کہ خاص طور پر اس کی پہلی صفوں میں ایسے افراد کی خاطر خواہ موجودگی ہو جن کا فہم دین، خوف خدا، امانت و دیانت، ایثار و قربانی اور اسلام اور ملت اسلام کے لیے ان کی بے لوثی و اخلاص، شک و شبہ سے بالکل بالا ہو، اور جو اپنے کو اس کام کے لیے پورے طور پر یکسو کر چکے ہوں۔

مستقل اور خود مختار تحریک کے لیے مطلوبہ ان تینوں ناگزیر شرطوں کو پورا کئے بغیر کسی علٰحدہ دینی تحریک کے قیام کو زیادہ سے زیادہ ایک مباح، کام کہا جا سکتا ہے جس کے سلسلے میں اصول فقہ کی یہ بحث پیش نظر رکھنے کی ہے کہ اسے حلال و حرام کے بین بین کی ایک چیز قرار دیا گیا ہے۔ ہندوستان کی خستہ حال ملت اسلامیہ کے محدود وسائل کو یوں بھی بہت سوچ سمجھ کر استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔

ربنا لا تواخذنا ان نسینا او اخطانا ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا
إنک انت السمیع العلیم

اسلام کا تصور مساوات

از سلطان احمد اصلاحی

اردو زبان میں اپنے موضوع پر پہلی مفصل کتاب جس میں 'مساوات' کے رائج الوقت تصور کی کمزوریوں اور خامیوں کی نشاندہی اس کے مآخذ کی روشنی میں کی گئی ہے۔ معاصر دنیا کے جائزہ کے ساتھ اس سلسلے میں سیکولر نظریات کی طرح دوسرے معروف مذاہب کی ناکامی کو واضح کیا گیا ہے۔ اس کے بعد انسانی سماج میں آزادی و مساوات کی آبیاری میں اسلام کے امتیازی کردار کو پوری تفصیل سے پیش کیا گیا ہے، اور اس کے اخلاقی، قانونی اور تاریخی تمام پہلوؤں پر علمی و تحقیقی انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔ آخر میں ان ممکنہ اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو اسلام کے تصور مساوات پر کیے جاسکتے ہیں۔ آفسٹ طباعت، صفحات ۲۴۴۔ قیمت ۲۰ روپے۔

ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی، ۱۳۵۳، چتلی قبر، دہلی۔

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیوٹ)، لمیٹڈ، لاہور، پاکستان سے بھی یہ کتاب شائع ہو چکی ہے

رسائل و مسائل

مفقود الخبر کی بیوی جس کی شادی کمسنی میں کردی گئی

سلطان احمد اصلاحی

جناب مدیر زندگی نو السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مندرجہ ذیل مسئلہ کا جواب قرآن وسنت کی روشنی میں بذریعہ رسالہ زندگی نو اور جوابی خط کے ذریعہ[1] ارسال فرمائیں مسئلہ کی نوعیت صرف فتویٰ پوچھنا ہی نہیں ہے بلکہ واقعتاً مسئلہ درپیش ہے۔

حمیرہ جب آٹھ سال کی تھی تبھی اس کے گھر والوں نے اس کی شادی کردی تھی لیکن کچھ دنوں بعد اس کا شوہر اچانک لاپتہ ہوگیا اس وقت حمیرہ کی عمر اٹھارہ سال سے اوپر ہے ایسی صورت میں کیا حمیرہ دوسری شادی کرسکتی ہے؟

نوٹ حمیرہ نیز اس کے گھر والے بہت پریشان ہیں کہ خدا نہ کرے حمیرہ کے قدم کسی غلط راستے پر اٹھ جاویں ـــ جواب کا متمنی ہوں۔

کسی قریبی شمارہ میں شائع کریں مہربانی ہوگی۔

جواب

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ، آپ کے مسئلہ میں خیار بلوغ، ولایت اجبار اور مفقود الخبر فقہ اسلامی کے تینوں ہی ابواب سے اجازت ہے کہ حمیرہ کی فی الفور کسی مسلمان قاضی یا بڑے اور مستند عالم دین کے ذریعہ تفریق کراکے، وفات کی عدت چار مہینہ دس دن گزارنے کے بعد، اس کی دوسری شادی کردی جائے۔ البتہ احتیاطاً سرکاری عدالت سے بھی اس کی بابت وثیقہ حاصل کرلینا بہتر ہوگا تاکہ بامکان واپسی شوہر اول کسی دشواری کا سامنا نہ ہو۔ یہ مسئلہ چونکہ عام ضرورت کا ہے اس لیے ذیل میں اسے قدرے تفصیل سے لکھا جاتا ہے۔

---

[1] خط کے ذریعہ مختصر جواب ارسال کردیا گیا ہے (ادارہ)

۱۔ خیار بلوغ کا مطلب یہ ہے کہ اگر لڑکے یا لڑکی کی شادی کمسنی میں کردی گئی ہو تو بالغ ہونے کے بعد ان کو اس کا اختیار رہتا ہے کہ چاہیں تو وہ اس نکاح کو باقی رکھیں یا اسے فسخ کردیں۔ آپ نے اس کی وضاحت نہیں کی ہے۔ اگر جمیرہ کی شادی اس کے باپ، دادا کے علاوہ اولیاء میں سے کسی نے کی ہے تب تو اسے یہ اختیار حاصل ہے ہی جیسا کہ ہدایہ میں ہے:

وان زوجھا غیر الاب والجد فلکل واحد منھما الخیار اذا بلغ ان شاء اقام علی النکاح وان شاء فسخ[1]	اگر ان کی (کمسن لڑکے اور لڑکی کی) شادی باپ، دادا کے علاوہ کسی نے کی ہو تو ان میں سے ہر ایک کو اختیار ہوگا کہ چاہے تو وہ اس نکاح کو باقی رکھے اور چاہے تو فسخ کردے۔

جس کی مزید تفصیل در مختار میں اس طرح کی گئی ہے:

وان کان المزوج غیرھما ای غیر الاب وابیہ لا یصح النکاح من غیر کفء او بغبن فاحش اصلا .. وان کان من کفء وبمھر المثل صح ولکن لھما ای لصغیر وصغیرۃ خیار الفسخ ولو بعد الدخول بالبلوغ او العلم بالنکاح بعدہ لقصور الشفقۃ[2] -	اگر شادی کرنے والا ان دونوں یعنی باپ دادا کے علاوہ کوئی دوسرا ہو تو اگر یہ نکاح غیر کفو سے اور (مہر وغیرہ) کے صریح نقصان کے ساتھ ہوا ہو تو یہ اصلاً منعقد ہی نہ ہوگا۔۔۔ ہاں اگر یہ کفو سے اور مہر مثل کے ساتھ ہو تو نکاح صحیح ہو جائے گا البتہ کمسن لڑکے اور لڑکی کو بالغ ہونے کے بعد فسخ کا اختیار حاصل ہوگا خواہ دخول ہی کیوں نہ ہو گیا ہو یا نکاح کی جانکاری بالغ ہونے کے بعد ہی کیوں نہ ہوئی ہو اس لیے کہ (باپ دادا کے علاوہ کے یہاں ان کی نسبت سے) وہ شفقت نہیں ہوتی جو مطلوب ہے۔

باپ دادا کے سلسلے میں بھی تفصیل ہے کہ اگر ان کا لا خیرا اور معاملات کے سلسلے میں بے پرکھ ہونا متحقق ہو تو ان کی طرف سے کیا ہوا نکاح بالاتفاق درست نہ ہوگا۔

ان کان الولی لم یعرف منھما (باپ دادا کے ولی ہونے کی صورت میں بھی نکاح

---

[1] ہدایہ: ۲/۲۹۷۔ کتاب النکاح، باب الاولیاء والاکفاء۔ رشیدیہ دہلی

[2] الدر المختار: ۲/۱۹/۴، ۲۰۔ مطبعہ عثمانیہ، مصر ۱۳۲۶ھ

سوء الاختيار ان عرف لا يصح النكاح اتفاقاً[1]

درست اسی وقت ہوگا جبکہ ان کی طرف سے لاپروا اور بے پرکھ ہونا معروف نہ ہو، لیکن اگر یہ چیز معروف ہو تو نکاح بالاتفاق درست نہ ہوگا۔

۲۔ باپ دادا کے سلسلے میں البتہ یہ کہا گیا ہے کہ اگر وہ کمسن لڑکے یا لڑکی کی شادی کردیں تو بالغ ہونے کے بعد ان کو اپنے معاملے کا کوئی اختیار نہیں رہے گا۔ چنانچہ ہدایہ میں ہے:

فان زوجهما الاب والجد يعني الصغير والصغيرة فلا خيار لهما بعد بلوغهما لانهما كاملا الرأى وافرا الشفقة فيلزم العقد بمباشرتهما كما اذا باشراه برضاهما بعد البلوغ[2]

اگر ان کی یعنی کمسن لڑکے اور لڑکی کی شادی باپ یا دادا کریں تو بالغ ہونے کے بعد ان کو کوئی اختیار نہیں رہے گا اس لیے کہ ان کی رائے کامل اور ان کی شفقت بھی کوئی کمی نہیں ہوتی ہے، تو ان کی طرف سے انجام پانے والے اس عقد کی پابندی لازم ہوگی گویا کہ انہوں نے بالغ ہوجانے کے بعد ان کی رضامندی سے اسے انجام دیا۔

ولایت اجبار کا یہی مطلب ہے۔ اسی لیے دوسرے موقع پر کہا گیا ہے کہ:

وللولي انكاح الصغير والصغيرة جبرا ولو ثيبا[3]

اور ولی (یعنی باپ دادا) کو کمسن لڑکے اور لڑکی کا بجبر نکاح کردینے کا حق ہے۔ خواہ لڑکی شوہر دیدہ ہی کیوں نہ ہوچکی ہو۔

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ مسئلہ اجتہادی ہے۔ قرآن وسنت سے اس کے حق میں کوئی منصوص دلیل نہیں ہے بلکہ متعدد صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نابالغ لڑکی کو اپنے نکاح کے معاملہ میں اختیار دیا ہے[4]۔ اسی لیے ہمارے نزدیک بعض متاخرین فقہا کی یہ رائے بڑی قابل توجہ ہے کہ اس خاص اجتہادی مسئلہ میں ترمیم کرکے صغیر و صغیرہ کو ہر حال میں خیار بلوغ دیا جانا چاہیے[5]۔

---

[1] الدرالمختار: ۲/۴۱۸۔ حوالہ سابق [2] ہدایہ: ۲/۲۹۷ [3] الدرالمختار: ۲/۴۱۷
[4] زاد المعاد فی ہدی خیرالعباد لابن قیم الجوزیہ: ۵/۹۵ تا ۹۹۔ موسستہ الرسالہ، بیروت طبع سابع ۱۹۸۵ء نیز حقوق الزوجین۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، ۹۸ تا ۱۰۴ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔ بار دوم ۱۹۸۳ء [5] حقوق الزوجین ۱۰۵

۳۔ فقہ حنفی میں بہ اختلاف اقوال مفقود الخبر کی بیوی کی انتظار کی مدت کے لیے شوہر کی عمر[۱] ۱۲۰، ۱۰۰، ۹۰، ۶۰ اور ۷۰ سال[۲] قرار دی گئی ہے۔ لیکن معلوم ہے کہ اس مسئلہ میں احناف کے یہاں فتویٰ امام مالک کے قول کے مطابق ہے۔ جس کی تفصیل ہے:

وقال مالک اذا مضی اربع سنین یفرق القاضی بینہ وبین امرأتہ وتعتد عدۃ الوفاۃ ثم تتزوج من شاءت[۳]	اور امام مالک نے کہا کہ جب چار سال گزر جائیں تو قاضی مفقود الخبر اور اس کی عورت کے درمیان تفریق کرا دے گا۔ اور وہ وفات کی عدت (چار ماہ دس دن) گزارے گی۔ پھر جس سے چاہے گی اپنی شادی کرے گی۔

- - - - - - - - -

ردالمحتار میں امام مالک کے اس مسلک کی وضاحت کے بعد:

خلافاً لمالک فان عندہ تعتد زوجۃ المفقود عدۃ الوفاۃ بعد مضی اربع سنین[۴]	امام مالک کے برخلاف اس لیے کہ ان کے نزدیک مفقود کی بیوی چار سال گزارنے کے بعد وفات کی عدت (چار ماہ دس دن) گزارے گی۔

احناف کی طرف سے اس مسلک کو اختیار کر لینے کی صراحت بھی ہے:

لقول القہستانی لو افتی بہ فی موضع الضرورۃ لا بأس بہ ... وقال فی البزازیۃ الفتویٰ فی زماننا علیٰ قول مالک[۵]	قہستانی کے اس قول کی بنا پر کہ اگر ضرورت کے وقت اس کے مطابق فتویٰ دیا جائے تو کوئی حرج نہیں ... اور بزازیہ میں فرمایا کہ ہمارے زمانہ میں فتویٰ امام مالک کے قول ہی پر ہے۔

علمائے احناف کے یہاں اس مسئلہ میں مالکی مسلک کے دوسرے جزئیات پر بھی عمل کرنے کو بہتر سمجھا گیا ہے[۶]۔ امام مالک کا مسلک معلوم ہے کہ جب مفقود الخبر کی بیوی کی دوسری شادی ہو جائے تو خواہ دوسرے شوہر کی اس سے ملاقات ہو نہ ہو پہلے شوہر کو اس پر کوئی اختیار نہیں رہے گا[۷]۔ متاخرین میں صاحب حقوق الزوجین نے بھی اسی کو پسند کیا ہے[۸]

---

[۱] ہدایہ: ۲/۶۰۲۔ کتاب المفقود [۲] ردالمحتار: ۳/۳۵۷۔ [۳] ہدایہ: ۲/ ۶۰۱-۶۰۲ کتاب المفقود۔ [۴] ردالمحتار۔ ۳/ ۳۵۶۔ کتاب المفقود، مطلب الافتاء بمذہب مالک فی زوجۃ المفقود [۵] ردالمحتار، حوالہ سابق [۶] فتاویٰ دارالعلوم دیوبند؛ ۱/۲۷۲۔ شائع کردہ دارالعلوم دیوبند، طبع اول ۱۹۸۱ء [۷] موطا امام مالک: ۲/۲۸۔ کتاب النکاح، عدۃ التی تفقد زوجہا۔ مکتبہ تجاریہ کبریٰ [۸] حقوق الزوجین ۱۳۲ تا ۱۳۴۔

اب صرف ایک مسئلہ باقی رہ جاتا ہے۔ صاحب ہدایہ نے امام مالک کا جو مسلک بیان کیا ہے اس میں "یفرق القاضی بینہ وبین امرأتہ" کا مقتضا معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی مفقود الخبر شوہر سے رہائی باقاعدہ مسلمان قاضی کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن خود امام مالک کے مسلک کی تصریحات اس معاملہ میں لچکدار ہیں۔ باقاعدہ قاضی اور والی نہ ہونے کی صورت میں اس معاملہ میں جماعت مسلمین کو با اختیار قرار دیا گیا ہے

ولزوجة المفقود الرفع للقاضي والوالي ووالي الماء والا فلجماعة المسلمين فيؤجل الحر اربع سنين ثم اعتدت كالوفاة ولا يحتاج فيها لاذن من الحاكم والا يوجد واحد منهم فلجماعة المسلمين صالحي بلدها[1][2]	اور مفقود کی بیوی معاملہ کو قاضی یا والی یا محصل زکوٰۃ عامل[1] کے پاس لے جائے گی لیکن اگر یہ نہ ہوں تو معاملہ مسلمانوں کی جماعت کے سپرد ہوگا۔ تو آزاد کے لیے چار سال کی مدت رکھی جائے گی پھر وہ وفات کی عدت (چار ماہ، دس دن) گزارے گی۔ اور اس کے سلسلے میں اسے موجود حاکم کی اجازت کی ضرورت نہ ہوگی۔ اور اگر ان میں سے کوئی نہ پایا جائے تو مسلمانوں کی جماعت میں علاقہ کے دیندار لوگوں کے یہ معاملہ سپرد ہوگا۔

اور صاحب ہدایہ کے مذکورہ قول کی یہ توجیہ بھی کی گئی ہے،

يفرق القاضي الخ اي ان كان والا فلو تأجيل غير القاضي يكفي ولا حاجة الى التفريق بعده[3]	قاضی تفریق کرے گا الخ یعنی یہ اس صورت کے لیے ہوگا جبکہ قاضی ہو ورنہ غیر قاضی کی طرف سے بھی اس مدت کی تعین کافی ہوگی۔ اور اس کے بعد اسے مزید کسی دوسرے ذریعہ سے تفریق کی حاجت نہ ہوگی۔

مزید براں فقہ حنفی کی دوسری جزئیات سے بھی اسی مسئلہ کو حل کرنے میں مدد ملتی ہے چنانچہ جب کسی علاقہ پر اغیار کا غلبہ ہو جائے اور نظام حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں میں نہ رہے تو اس

---

[1] "والی الماء" کے معنی ہیں محصل زکوٰۃ (کلکٹر یا عامل)، مالکی فقہاء کے یہاں اس کی تصریح ہے "والی الماء، ای جابی الزکوٰۃ۔ الخ" [2] شرح الخلاصہ الدردیر علی مختصر الشیخ الخلیل فی الفقہ للامام مالک، بحوالہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ۱۰/ ۲۷۲، ۲۷۳۔ [3] الحیلۃ الناجزۃ للتھانوی بحوالہ فتاوی دارالعلوم دیوبند حوالہ سابق ۱/ ۲۷۵۔

صورت حال کے لیے کہا گیا ہے کہ :

ویصیر القاضی قاضیا بتراضی المسلمین[1] — اور مسلمانوں کی باہمی رضا مندی سے قاضی قاضی قرار پائے گا۔

نیز یہ کہ :

ویجوز تقلد القضاء من السلطان العادل والجائر ولو کافرا۔[2] — عادل اور غیر عادل دونوں ہی طرح کے حکمرانوں کی طرف سے منصب قضاء کی تفویض اور اسے قبول کرنا جائز ہے۔ اور یہ اس صورت میں بھی جائز ہے جبکہ حکمراں کافر ہی کیوں نہ ہو۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس طرح کے معاملات و مسائل میں مسلمانوں کی قابل اعتماد اور معتبر تنظیموں اور اداروں اور ان سے وابستہ علماء و قضاۃ کو ان کے فیصلے کا اختیار ہونا چاہئے۔ غیر مسلم عدالتوں کے مسلمان قاضیوں اور ججوں کے فیصلے بھی اگر وہ شریعت کے مطابق ہوں تو قابل قبول ہوں گے۔ البتہ ذرا اور آگے بڑھ کر ہندوستان کے موجودہ حالات کے پس منظر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جبکہ یہاں مسلمان تنظیموں اور اداروں کے پاس قوت نافذہ نہیں ہے تو ان کے فیصلوں کی بابت اگر توثیق نامے علی الاطلاق سرکاری عدالتوں سے بھی حاصل کرلئے جائیں تو بہتر ہوگا۔ تاکہ آئندہ کی امکانی الجھنوں سے بچا جا سکے۔ واللہ اعلم بالصواب والیہ الملجاء والمآب۔

---

[1] ردالمحتار مع الدرالمختار، ۴/۲۷۴۔ کتاب القضاء [2] الدرالمختار: ۴/۲۷۴۔ حوالہ سابق

(بقیہ صفحہ ۵۶ کا) کے نام پر اکتفاء کیا گیا ہے۔ مطبع اور سن طباعت وغیرہ کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے کتابوں پر نمبر شمار لگا دیا گیا ہوتا تو البتہ بہتر تھا۔ مصنف غالباً پاکستانی ہیں۔ لیکن کتاب میں ان کا کوئی تعارف نہ ہونے کی وجہ سے تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ یہ کتاب جو مجلد ڈسٹ کور کے ساتھ شائع کی گئی ہے، اگر اس کے دونوں حاشیوں پر جدید انداز کے مطابق کتاب اور مصنف کا تعارف کرا دیا جاتا تو شاید مناسب ہوتا۔ کتابت و طباعت اعلیٰ اور دلکش اور قیمت بہت مناسب ہے۔ کم سے کم قیمت پر کتابوں کی فراہمی مرکزی مکتبہ اسلامی کی قدیم روایت ہے خدا کا شکر ہے کہ اس روایت کو آج بھی وہ اسی طرح قائم رکھے ہوئے ہے۔ اس پر وہ ہر طرح سے ستائش اور مبارکباد کا مستحق ہے۔ (س)

تنقید و تبصرہ:

اسوۂ حسنہ - قرآن کی روشنی میں۔ محمد شریف قاضی۔ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی،
صفحات ۵۲۸ - مجلد مع گردپوش قیمت ۴۵/= روپے بار اول ۱۹۸۶ء

اردو ادب کو عالمی زبانوں میں 'اسلامیات' کی نسبت سے جو امتیازی مقام حاصل ہے، اس کا ایک بڑا اہم اور نمایاں پہلو اس بات کا ہے کہ سیرت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا ذخیرہ ہے۔ اسلامیات کے دوسرے موضوعات کے علاوہ خاص اس موضوع پر اس زبان میں وہ ممتاز اور منفرد چیزیں ہیں جن کی نظیر بعض پہلوؤں سے عربی اور فارسی میں بھی ملنی مشکل ہے۔ آخری پیغمبر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و شخصیت اس امت مرحومہ کے لیے وہ محبوب ترین موضوع ہے جس پر اپنے دور اول ہی سے اس نے بجا طور پر قرار واقعی توجہ دی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت جامعیت و کمال کا وہ بحر ناپیدا کنار ہے کہ اس کی گہرائیوں میں آدمی جس قدر گھستا ہے اسے اپنے عجز و درماندگی کا اتنا ہی احساس ہوتا ہے۔ آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے دو رخ ہیں، آپؐ کے ذاتی اور شخصی کمالات، دوسرے آپؐ کی نبوی خصوصیات اور تعلیمات۔ جناب محمد شریف قاضی کی زیر تبصرہ تصنیف سیرت صاحب سیرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ان دونوں ہی حیثیتوں کی جامع ہے۔ جس میں خاص طور پر مصنف نے آپؐ کی سیرت کے دوسرے پہلو پر زیادہ کامل اور شرح و بسط کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ مسلمان امت کے لیے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر جس انداز اور جس پیرائے میں بھی ہو وہ اس کی نگاہوں کے لئے ٹھنڈک کا باعث ہے لیکن آپ سے اصل تعلق اور حقیقی محبت اس میں ہے کہ آپ کی تعلیمات اور آپ کے اسوہ کو اپنی پوری زندگی کے لیے حرز جان بنا لیا جائے۔ اور زندگی کے کسی موڑ پر ان سے سر مو انحراف نہ ہونے پائے۔ مسلمانوں میں دینی فکر جو اضمحلال کا شکار ہوئی ہے، اس کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ صاحب سیرت کے سراپا اور آپ کی شخصی زندگی کے چرچے تو بڑی دھوم دھام سے ہوتے ہیں، لیکن آپؐ کے اصل پیغام اور اصل مشن سے ویسا ہی تغافل برتا جاتا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے اس پردۂ غفلت کو ہٹانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اور آپ کیا تھے سے زیادہ آپ کی تعلیمات کیا تھیں کے پہلو کو پوری طرح ابھار کر پیش کیا ہے۔ آپؐ کی حیات معنوی کو اجاگر کرنے میں اصلاً مصنف نے قرآن حکیم کو ہی بنیاد بنایا ہے۔ ساتھ ہی احادیث اور تاریخ و سیرت کے مستند ذخیرے سے بھی پوری طرح استفادہ کیا ہے۔ زبان صاف ستھری، موثر اور رواں ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں پہنچے اور اسے زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے۔ سیرت نبوی کے پیرائے میں مصنف نے اسلام کا ایک جامع تعارف کرا دیا ہے۔ آخر میں مراجع کی فہرست ہے جن کی مدد سے یہ کتاب تیار کی گئی ہے۔ یہ معروف و متداول کتابیں ہیں اس لیے صرف مصنف اور کتاب (بقیہ صفحہ ۵۵ پر)

ماہنامہ
زندگی نو
نئی دہلی

جلد ۷ ✻ اگست ۱۹۸۷ء مطابق ذی الحجہ، محرم ۸-۱۴۰۷ھ ✻ شمارہ ۲

فہرست مضامین

ادارتی امور کے لئے خط و کتابت کا پتہ: مدیر زندگی نو پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ترسیل زر و انتظامی امور کے لئے: منیجر ماہنامہ زندگی نو، ۱۵۲۵، سوئیوالان نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

● سالانہ زر تعاون -/۵۵ روپے ● بیرون ہند -/۲۲۵ روپے انڈین ● فی شمارہ -/5 روپے ●

سرخ نشان، علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لئے فوری زر سالانہ ارسال فرمائیں یا اگلا شمارہ کسی اطلاع کے نہ ملنے پر بذریعہ وی۔پی ارسال کیا جائے گا۔

پرنٹر و پبلشر محمد حبیب اللہ قادری نے دعوت ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی جانب سے جمال پرنٹنگ پریس، جامع مسجد، دہلی سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ "زندگی نو" ۱۵۲۵، سوئیوالان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔ فون: ۲۷۳۳۳۸ ★ ۲۶۵۳۱۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

موعظہ حسنہ

سید جلال الدین عمری

قرآن مجید نے دعوت و تبلیغ میں 'موعظہ حسنہ' سے بھی کام لینے کا حکم دیا ہے۔ وعظ یا موعظت یہ ہے کہ انسان کے پاکیزہ جذبات کو ابھارا جائے، غلط روی پر اسے تنبیہ کی جائے اور صحیح روش پر اس کی تحسین کی جائے، ثواب و عقاب کا اس طرح ذکر کیا جائے کہ دل میں رقت پیدا ہو اور آدمی خیر کی طرف پیش قدمی کرے اور شر سے باز رہے[1]

قرآن مجید نے دعوت کے لیے وعظ کا یہ طریقہ بکثرت استعمال کیا ہے۔ وہ انسان کے ضمیر کو جھنجوڑتا اور اس کے باطن سے اپیل کرتا ہے، حق کے انکار پر اس کی سرزنش اور حق کے قبول کرنے پر اس کی تحسین کرتا ہے۔ یہ بات بار بار واضح کرتا ہے کہ اس دنیا کا سود و زیاں چند روزہ اور بے حقیقت اور آخرت کا نفع و نقصان ابدی ہے، اس لیے اس دنیائے ناپائدار کی خاطر آخرت کا نقصان کرنا انسان کی بہت بڑی نادانی ہے۔ یہ باتیں اس نے اتنے موثر طریقہ سے پیش کی ہیں کہ بڑے بڑے مخالفین کی دل کی دنیا بدل گئی ہے۔

قرآن مجید نے حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ دعوت و تبلیغ کا حکم دیا ہے۔ امام رازی ان دونوں کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حکمت یہ ہے کہ اسلام نے جو عقاید اور ایمانیات پیش کئے ہیں انھیں قطعی اور یقینی دلائل سے ثابت کیا جائے۔ یہ طریقہ ان لوگوں کے لیے مفید ہے جو اعلیٰ ذہنی صلاحیت کے مالک ہیں لیکن جو لوگ کم تر ذہنی صلاحیت رکھتے ہیں ان کے لیے موعظہ حسنہ ہے۔ تفسیر کبیر ۵/۱۴۲

اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ موعظہ حسنہ ذہین طبقہ کے لیے بالکل بے سود ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ بعض اوقات عام افراد ہی نہیں بڑے بڑے دانشور اور فلسفی بھی موعظہ حسنہ کا گہرا اثر قبول کرنے پر مجبور

[1] امام راغب فرماتے ہیں الوعظ: زجر مقترن بالتخویف (مفردات القرآن مادہ وعظ) لسان العرب میں ہے۔ الوعظ النصح والتذکیر بالعواقب۔ مادہ وعظ۔ اس کی مزید تشریحات آگے آرہی ہیں۔

ہوتے ہیں اور اس کے ذریعہ فکر کو نیا رخ اور عمل کو نیا میدان مل جاتا ہے۔

موعظت ان لوگوں کے لیے بھی مفید ہے جو دین سے بے خبر یا اس کے مخالف اور منکر ہیں اور ان لوگوں کے لیے بھی جو اس کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن مجید کو سارے انسانوں کے لیے موعظت کہا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ ۝ (یونس، ۵۷، ۵۸)

اے لوگو! تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس موعظت (نصیحت) اور دلوں کی بیماریوں کے لیے نسخہ شفا آچکا ہے۔ یہ ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو اس پر ایمان رکھتے ہیں ملے نبی کہہ دو کہ یہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہے۔ اس پر خوشی منانی چاہیے یہ اس چیز سے بہتر ہے جسے یہ جمع کر رہے ہیں۔

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور جن کے دلوں میں خدا کا خوف ہوتا ہے ان کے لیے اس موعظت سے بڑا فائدہ پہنچتا ہے۔ پورا قرآن ان کے لیے موعظت ہی موعظت ہے۔

هَٰذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ ۝ (آل عمران ۱۳۸)

یہ بیان ہے لوگوں کے لیے اور اس میں ہدایت اور موعظت ہے متقیوں کے لیے۔

قرآن مجید نے بہت سے مقامات پر احکام شریعت کے بیان کرنے کے بعد اس بات کی نصیحت اور تاکید کی ہے کہ ان کی پابندی کی جائے اسی کو وہ موعظت سے تعبیر کرتا ہے۔

سورہ بقرہ میں نکاح و طلاق کے احکام بیان کرتے ہوئے یہ موعظت کی گئی۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝ (البقرہ: ۲۳۱)

یاد کرو اللہ کے احسان کو جو اس نے تم پر کیا ہے اور جو کتاب و حکمت اس نے نازل کی ہے اس کے ذریعہ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

اس کے بعد والی آیت میں یہی موعظت ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

ذَٰلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۗ ذَٰلِكُمْ

اس کی نصیحت تم میں سے ہر اس شخص کو کی جاتی ہے جو کہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے

أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿﴾ (البقرہ: ۲۳۲)

یہی تمہارے لیے صاف ستھرا اور پاکیزہ طریقہ ہے۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

احکام طلاق کے ذیل میں وعظ کا یہی انداز ایک دوسرے موقع پر بھی اختیار کیا گیا ہے،

ذَٰلِكُمْ يُوعَظُ بِهِ مَن كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا ﴿٢﴾ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ ۚ قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (الطلاق: ۲، ۳)

ان باتوں کی ہر اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے۔ جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا راستہ پیدا کر دے گا اور اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اسے گمان بھی نہ جاتا اور جو اللہ پر بھروسہ رکھے وہ اس کے لیے کافی ہے۔ بے شک اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

سود کی حرمت کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا

فَمَن جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّهِ فَانتَهَىٰ فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (البقرہ: ۲۷۵)

جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہونچے اور وہ سود خوری سے باز آجائے تو جو کچھ وہ پہلے لے چکا لے چکا اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے لیکن جو شخص اس نصیحت کے آنے کے بعد بھی یہی حرکت کرے تو ایسے لوگ جہنم میں جائیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اسی سلسلہ بیان کے آخر میں ارشاد ہوا۔

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ۖ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (البقرہ: ۲۸۱)

ڈرو اس دن سے جس دن تم لوگ اللہ کی طرف لوٹائے جاؤگے اور ہر شخص کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور اس پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

ان آیات میں احکام شریعت کی پابندی کی جس طرح ترغیب دی گئی ہے اور اس سلسلہ میں جس انداز میں تاکید کی گئی ہے اسے 'وعظ' اور 'موعظت' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان آیات میں چند باتوں پر زور دیا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ آدمی اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرے اور اس کی نافرمانی

سے ڈرتا ہے۔ یہ بات ہمیشہ اس کے پیش نظر رہنی چاہئے کہ ایک دن اسے خدا کے حضور پہونچ کر اپنے ایک ایک عمل کی جواب دہی کرنی ہے، کامیاب وہ ہے جو اس دن کامیاب قرار پائے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زندگی گزارنے کے لیے جو ہدایات دی ہیں ان کی پابندی میں خود اس کا فائدہ ہے، اس سے اس کا تزکیہ ہوتا ہے اور اس کے اخلاق اور سیرت سنورتی ہے۔ تیسرے یہ کہ اس راہ میں جو دشواریاں پیش آئیں۔ خدا کے بھروسہ پر برداشت کرنا چاہئے جو شخص خدا پر صحیح معنی میں توکل کرتا ہے اللہ تعالیٰ غیب سے اس کی مشکلات حل کرتا ہے۔

اس طرح ان آیات میں موعظت کا صحیح طریقہ بتا دیا گیا ہے۔ جب تک اس کی پابندی نہ ہو کم سے کم یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ موعظت مکمل نہیں ہوگی اور اس کا حق ادا نہیں ہوگا۔

دعوت و اصلاح کے میدان میں امت سے جو کوتاہیاں سرزد ہو رہی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وعظ ونصیحت کی ذمہ داری بالعموم ان لوگوں نے اٹھا رکھی ہے جو اس کی نزاکتوں سے بے خبر ہیں اور جو اسے بیشتر حالات میں اپنے ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان کی نادانی اور خودغرضی نے اس مقدس کام کے حسن کو بگاڑ دیا ہے اور یہ ایک ایسے پیشہ کی شکل اختیار کر گیا ہے جس میں واعظ مخاطبین کی بھلائی سے زیادہ اپنا فائدہ چاہتا ہے اس سے اس کام کی تاثیر ختم ہو گئی ہے اور امت کے اندر اس کی قدر و قیمت گھٹ کر رہ گئی ہے۔

ہمارے واعظین کی علمی اور عملی کمزوریوں کی وجہ سے بہت سے ذہین، سمجھ دار اور خدا ترس افراد بھی 'وعظ' سے گھبراتے ہیں۔ انھیں یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں ان کا شمار بھی پیشہ ور واعظوں میں نہ ہونے لگے۔ حالانکہ یہ کوئی صحیح روش نہیں ہے۔ اس سے موعظت کے جس عمل کو امت میں اعلیٰ معیار پر جاری رہنا چاہئے اسے نقصان پہونچتا ہے دعوت اور امت کی اصلاح و تربیت میں موعظت کا بڑا دخل ہے اس میں امت کی بہترین صلاحیتیں صرف ہونی چاہئیں۔ دعوت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ جہاں ضرورت ہو مخاطب کو عقلی طور پر مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے اور جہاں وعظ ونصیحت سود مند ہو سکتی ہو وہاں وعظ ونصیحت سے کام لیا جائے۔ یہ دونوں کام اپنے مزاج کے لحاظ سے کسی قدر مختلف ضرور ہیں لیکن داعی کو بہرحال یہ انجام دینے ہوں گے۔ اس کی باتیں عقل کو بھی اپیل کرتی ہوں اور ان سے دینی جذبات اور احساسات کو بھی تقویت پہونچے۔ اسے بیک وقت حکیم بھی ہونا چاہئے اور واعظ بھی۔

قرآن و حدیث میں موعظت کے اصول و آداب بھی بیان ہوئے ہیں۔ یہاں ان میں سے بعض کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

۱۔ موعظت میں ہمدردی، دل سوزی اور غم خواری ہونی چاہئے، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ اس کے بغیر موعظت کا تصور ہی مکمل نہیں ہوتا۔ عربی لغت کے ایک بہت بڑے ماہر خلیل نے وعظ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

هو التذكير بالخير فی ما يرق له القلب ۱	یہ خیر کی اس طرح تذکیر کا نام ہے جس سے دل میں رقت پیدا ہو

ایک اور ماہر لغت ابن سیدہ کہتے ہیں۔

هو تذكير الانسان بما يلين قلبه من ثواب و عقاب ۲	وعظ یہ ہے کہ ثواب اور عذاب کے بیان کے ذریعہ تم اس طرح انسان کی تذکیر کرو کہ اس کا دل نرم پڑ جائے۔

قرآن کریم میں موعظہ حسنہ کے ذریعہ دعوت کا جو حکم دیا گیا ہے اس کی تفسیر علامہ خازن نے ان الفاظ میں کی ہے۔

يعنى وادعهم الى الله بالترغيب والترهيب وهو انه لا يخفى عليهم انك تناصحهم وتقصد ما ينفعهم ۳	یعنی تم ان کو ترغیب و ترہیب کے ذریعہ اللہ کی طرف دعوت دو، اس طرح کہ ان پر یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ تم ان کی خیر خواہی کر رہے ہو اور ان کا فائدہ چاہتے ہو۔

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو دین کی بنیادی باتوں کی نصیحت کی تھی۔ اس نصیحت کو قرآن نے وعظ ہی سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک باپ اپنی اولاد کو جس خلوص اور محبت کے ساتھ نصیحت کرتا ہے وہ وعظ ہے۔ بسا اوقات انسان مضبوط ترین دلائل کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا لیکن اخلاص اور ہمدردی کے ساتھ کی جانے والی نصیحت اس کے دل میں اتر جاتی ہے اور وہ اس سے منھ موڑنے کی ہمت نہیں کر پاتا۔ دلائل کو ٹھکرانے والا انسان خلوص و محبت کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

۲۔ دین کے دشمنوں اور اس کے خلاف سازشیں کرنے والوں کے ساتھ بھی موعظت ہونی چاہئے یہ ان کی اصلاح کی ایک موثر تدبیر ہے۔ اسلامی معاشرہ میں منافقین کا رویہ بالکل واضح تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ان کے سینوں میں نفرت، بغض اور دشمنی کے جذبات پرورش پا رہے تھے وہ مسلمانوں کی کامیابی پر حسد سے جلتے تھے اور ان کی ہر ناکامی ان کے لیے مسرت کا پیام لاتی

۱ راغب، مفردات القرآن/۵۲۹ ۲ ابن منظور، لسان العرب، مادہ وعظ ۳ خازن، تفسیر ۴/۱۰۲

تھی۔ لیکن اس کے باوجود کہا گیا کہ ان کے ساتھ وعظ و نصیحت کا موثر طریقہ اختیار کیا جائے اور انھیں اپنی حرکتوں سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے۔ ارشاد ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا (نساء: ۶۳)	اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے۔ انھیں نظر انداز کیجیے، ان کو نصیحت کیجیے اور ان سے ان کے نفوس میں اتر جانے والی بات کیجیے۔

مطلب یہ کہ انھیں نصیحت کی جائے، موثر اور بلیغ انداز میں انھیں جھنجوڑا جائے، ان کی حرکتوں کی مذمت کی جائے اور انھیں ان کے انجام سے باخبر کیا جائے۔

۲- جس شخص کے اندر دین کی طلب ہو اور جو حق کے دریافت ہونے کے بعد اس پر عمل کرنے کے لیے آمادہ ہو، اسے موعظت سے فائدہ پہونچتا ہے، لیکن جو شخص حق کو قبول کرنا نہ چاہے اس کے لیے موعظت بے سود ہو سکتی ہے۔ اس لیے موعظت جہاں مفید ہو وہاں ضرور کرنی چاہیے اور جہاں اس سے فائدہ کی توقع نہ ہو وہاں اس سے احتراز کرنا چاہیے۔ حدیث میں آیا ہے کہ جب کسی صاحب علم سے کوئی بات دریافت کی جائے اور وہ اس کا شرعی حکم جانتا ہو تو اسے صاف صاف یہ حکم بتا دینا چاہیے۔ علم کو چھپانا حقیقت پر پردہ ڈالنا ہے اور یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

من سئل عن علم علمه ثم كتمه الجم يوم القيامة بلجام من النار[1]	جس شخص سے علم کی کوئی ایسی بات پوچھی گئی جسے وہ جانتا تھا پھر بھی اس نے اسے چھپایا تو قیامت کے روز اسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی

جہاں علم کی طلب ہو وہاں یہ حکم ہے اور جہاں دین سے بے نیازی دکھائی جائے وہاں حکم ہے کہ دین کے علم بردار کو بھی بے نیازی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

نعم الرجل الفقيه فى الدين ان احتيج اليه نفع وان استغنى عنه اغنى نفسه[2]	دین کا وہ فقیہ بہت اچھا ہے کہ اگر اس کے سامنے حاجت رکھی جائے تو فائدہ پہونچائے اور اس سے بے نیازی دکھائی جائے تو وہ خود بھی بے نیازی دکھائے۔

[1] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب العلم، بحوالہ احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ　[2] مشکوٰۃ، کتاب العلم، بحوالہ رزین

یہ ہدایت بظاہر دینی امور میں استفتا اور فتویٰ سے متعلق ہے، لیکن موعظت میں بھی اسے پیش نظر رکھنا چاہیے۔ لوگوں کے پیچھے پڑ کر نصیحت کرنے سے دین اور علماء دین دونوں کا وقار مجروح ہوتا ہے اور تجربہ بتاتا ہے کہ اس کے بعد موعظت کی قدر و قیمت گھٹ جاتی ہے اور اس سے کوئی فائدہ نہیں حاصل ہوتا۔

۲۔ یہ موعظت کا ایک پہلو ہے، ورنہ جیسا کہ عرض کیا گیا مخاطب کو دین کی طرف لانے کے لیے بھی موعظت ہو سکتی ہے بلکہ ہونی چاہیے۔ لیکن اس کی نوعیت اس سے مختلف ہے۔

۴۔ وعظ و نصیحت میں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ مخاطب اکتاہٹ نہ محسوس کرے مخاطب کی اکتاہٹ سے وعظ و تذکیر کا فائدہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ اکتاہٹ روز روز کی نصیحت سے بھی ہو سکتی ہے اور طول طویل نصیحت سے بھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہفتہ میں ایک بار جمعرات کو تذکیر فرمایا کرتے تھے۔ ایک شخص نے ان سے عرض کیا کہ کاش آپ روزانہ تذکیر فرماتے (تاکہ زیادہ فائدہ ہوتا) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس کے جواب میں فرمایا۔

اما انہ یمنعنی من ذالک انی اکرہ ان امتکم انی اتخولکم بالموعظۃ کما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتخولنا بہا مخافۃ السآمۃ علینا [1]	اس پر عمل کرنے میں یہ بات مانع ہے کہ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ تمہیں اکتاہٹ میں ڈال دوں۔ میں موعظت کے معاملہ میں تمہارا خیال رکھتا ہوں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس معاملہ میں ہمارا خیال رکھتے تھے کہ کہیں ہمارے اندر اکتاہٹ نہ پیدا ہو جائے۔

حضرت عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا لوگوں کو حدیث ہفتہ میں ایک مرتبہ سناؤ، اگر تم یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہو تو دو مرتبہ بیان کرو۔ اگر بہت زیادہ کرنا چاہو تو تین مرتبہ بیان کرو۔ اس کا خیال رکھو قرآن مجید سے لوگوں کے اندر اکتاہٹ نہ پیدا ہونے پائے۔ ایسا ہرگز نہ ہو کہ جب کچھ لوگ کسی گفتگو میں مصروف ہوں تو تم ان کی گفتگو کاٹ کر اپنی بات (نصیحت) کا شروع کر دو اور وہ تمہاری اس حرکت سے اکتاہٹ اور بیزاری محسوس کرنے لگیں۔ ایسے موقع پر خاموش رہو جب تم سے کہا جائے تو اپنی بات رکھو۔ صرف اس وقت تک گفتگو جاری رکھو جب تک کہ ان کے اندر رغبت پائی جائے۔ دعا میں مسجع الفاظ استعمال کرنے سے بچو، میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اس سے احتراز کرتے تھے۔[2]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی اس نصیحت میں موعظت کے بڑے اہم آداب بیان ہوئے ہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ ان کی پابندی سے موعظت میں جان پڑ جاتی ہے اور اس کا صحیح فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ جہاں ان کی پابندی نہیں ہوتی واعظ خطابت کے ذریعہ اپنے ذہن کا بوجھ تو ہلکا کر لیتا ہے لیکن سننے والوں پر اپنا کوئی اثر نہیں چھوڑتا۔ واعظ کا فرض ہے کہ بے نتیجہ وعظ سے ہمیشہ پرہیز کرے۔

---

[1] مشکوٰۃ، کتاب العلم بحوالہ بخاری و مسلم [2] مشکوٰۃ، کتاب العلم، بحوالہ بخاری

مقالات:

پردیس کی زندگی اور اسلام

سلطان احمد اصلاحی

ہندوستانی سماج کے مسائل کی اگر کوئی مختصر سے مختصر فہرست بھی بنائی جائے تو "پردیس کی زندگی" کو اس میں سرفہرست مقام حاصل ہوگا۔ ہندوستان بلکہ تیسری دنیا کا یہ وہ اہم ترین مسئلہ ہے جس سے ہر گھر اور ہر خاندان کا واسطہ ہے۔ اپنے اہل و عیال سے طویل وقفوں کی مستقل جدائی نے برصغیر کے چپے چپے اور اس کے ذرّے ذرّے کو ایسے کرب سے آشنا کیا ہے کہ اس سرزمین کے ہر بن مو سے اس کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ کرب انگیزی ہندوستان کے نغمہ اور اس کی موسیقی کا ناگزیر جزء بن گئی ہے۔ جس نے واقعہ ہے کہ نغموں کی دنیا میں اسے ایک بالکل ہی نئے اور منفرد رنگ اور آہنگ سے آشنا کیا ہے۔ بے شمار افراد اور بے شمار بچھڑے ہوئے خاندانوں کا یہ واحد سہارا ہے جس کے ذریعہ وہ اپنا غم غلط کرتے اور صبح کی شام کرتے ہیں۔ ہندوستان کے خاص معاشی حالات اور مخصوص معاشرتی پس منظر میں "پردیس کی زندگی" ایک ایسی جانی اور مانی ہوئی حقیقت ہے جس کے سلسلے میں مزید غور و فکر کر کے شاید ذہن کو تھکانے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ لیکن اسلام کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ہم کو یہ دیکھنا ضرور ہے کہ اسلام پردیس کی زندگی کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کے مطلوبہ معاشرتی نقشہ سے یہ چیز کس قدر ہم آہنگ ہے۔ کہاں تک یہ اس کے لیے قابل قبول ہے۔ اور کس مرحلہ پر پردیس کی زندگی اس کے لیے ناقابل تسلیم بن جاتی ہے۔

ہندوستان کا مخصوص معاشی اور معاشرتی پس منظر:

ہندوستان بنیادی طور پر ایک زراعتی ملک رہا ہے۔ آج بھی اس کی آبادی کی عظیم اکثریت شہروں اور قصبوں کے بجائے دیہاتوں

میں رہتی ہے۔ پھر ہندو طرز معاشرت کے غلبہ کے باعث مشترکہ خاندانی نظام یہاں کے معاشرتی نظام کا بڑا مقدس اور ناگزیر جز رہا ہے۔ ان دو گونہ معاشی اور معاشرتی عوامل کے نتیجے میں پردیس کی زندگی، خاص طور پر ہندوستان کی دیہی آبادی کا لازمی حصہ قرار پائی۔ زراعتی گھرانوں کی بڑی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے کچھ افراد گھر پر رہ کر کھیتی باڑی کا کام سنبھالیں تو دوسرے افراد پردیس کا رخ کرکے نقد رقم کے ذریعہ خاندان کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے میں معاون ہوں۔ خاص طور سے اس صورت میں جبکہ زراعتی بنیاد کی حامل آبادی کی غالب اکثریت برائے نام زمینوں ہی کی مالک ہوا کرتی ہے۔ اس طور پر کہ اگر پورا خاندان صرف زرعی آمدنی پر انحصار کرے تو گھر کے پھیلے ہوئے مسائل کے لیے یہ چیز کسی طرح کفایت نہیں کرسکتی ہے۔ اس پس منظر میں مشترکہ خاندانی نظام پردیس کی زندگی کے لیے اور زیادہ راہ ہموار کرنے والا ثابت ہوا۔ اسلام کے پسندیدہ طرز معاشرت کی پیروی میں، جو مشترکہ خاندانی نظام کو ناپسند کرتا اور چھوٹے چھوٹے خاندانوں اور ہر شخص کے لیے الگ مکان کی تائید کرتا ہے، اگر ہر شخص اپنے بیوی بچوں کے ساتھ الگ الگ رہ رہا ہوتا تو پردیس کی زندگی اختیار کرنے میں یہ چیز کسی قدر رکاوٹ بنتی۔ آدمی مستقل طور پر تنہا باہر بسر کرنے سے پہلے بیوی بچوں کے لیے فکرمند ہوتا۔ اور پردیس کی زندگی اس کے لیے زندگی کی آخری پسند اور آخری چارہ کار ہوتی۔ لیکن ہندو طرز معاشرت کے پسندیدہ مشترکہ خاندانی نظام میں جس میں پھیلا ہوا خاندان بلکہ بسا اوقات خاندان کے نام پر پورا محلہ ایک گھر کے مرکزی نظام میں کس کر رہتا ہے، ہندوستان کے خاص پس منظر میں پردیس کی زندگی کے لیے یہ چیز کافی معاون بلکہ بسا اوقات شوق دلانے والی اور مہمیز کرنے والی رہی ہے۔ جب گھر کا ستر سال کا دادا پوری طرح چاق و چوبند ہو اور اس کے چھ جوان بیٹوں میں سے دو گھر کو سنبھالے اور چار پردیس کی کمائی سے گھر کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے میں لگے ہوئے ہوں تو اگر پوتوں کی پوری نسل گھر کو دن دونی رات چوگنی ترقی دینے کے لیے پردیس کو مستقل طور پر پکڑ لے تو آخر اس میں نقصان اور مضرت کا کون سا پہلو ہے؟ بلکہ اس سے بھی آگے کیا معاشرت کا اس سے بہتر اور اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا آئیڈیل بھی ہوسکتا ہے؟

ہندوستانی آبادی پر ہندو طرز معاشرت کی چھاپ بہت گہری ہے۔ مسلمان قوم پر بھی اس کے قابل لحاظ اثرات صاف طور پر موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی ترجیحات اور اسلام کے مطلوبہ رویہ کو نظر انداز کرکے مسلمان قوم بھی اغیار کی طرح پردیس کی زندگی کی ویسی ہی بلکہ بسا اوقات اس سے کچھ زیادہ ہی رسیا ہے۔ انسانی نفسیات کی مجبوریاں اصلاً کر عدیوں

سے آگے اپنے دین اوراس کے تقاضوں کی نسبت سے اس زندگی کے اختیار کرنے میں اسے شاید ہی کبھی کسی سوچ اورکسی الجھن کا احساس ہوتا ہے۔ معاشی مسائل اور معاشی مجبوریوں کی بڑی اہمیت ہے اوراس میں شک نہیں مسلمان آبادی کی عظیم غریب اکثریت کے لیے زندگی کی ناگزیر ضروریات کو پورا کرنے کی خاص طور پر ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس سے بہتر اور آسان دوسری سبیل نظر نہیں آتی کہ وہ پردیس کو اپنی قسمت سمجھ کر کے اپنے کو اس کے حوالہ کر دے۔ لیکن اس سے ہٹ کر ایسی مثالیں بھی کم نہیں ہیں جہاں ضرورت سے زیادہ بیجا ٹھاٹ باٹ اور نامطلوب روایتی ٹیپ ٹاپ اور آن بان کو باقی رکھنے کے لیے بال بچوں سے دور زندگی بھر کے بن باس، کو پوری طیب خاطر سے گوارا کیا جاتا ہے اور دین اوراس کے تقاضوں کی نسبت سے ذہن میں کبھی کوئی خلش اور اضطراب نہیں پیدا ہوتا ہے۔

یوں تو پردیس کی زندگی تیسری دنیا کے بہت سے ملکوں کی طرح پورے ہندوستان کا مسئلہ ہے۔ لیکن ملک کے بعض علاقوں میں وہاں کے مخصوص معاشی حالات کے باعث، اس کا چلن کچھ زیادہ ہی رہا ہے۔ تازہ اعداد وشمار کے مطابق یوپی میں اس کی آبادی کی اندرون اور بیرون ملک مہاجرت کی جو صورت ہے اس پر خود حکومت یوپی کو تشویش ہے۔ اس رجحان کو کم کرنے کے لیے جو مختلف تدابیر وہ اختیار کر رہی ہے وہ کچھ بہت زیادہ کامیاب نہیں ہیں۔ سب سے زیادہ تشویشناک معاملہ یوپی ہی کے بعض مشرقی اضلاع کا ہے جہاں خاص طور پر مسلمان آبادی کی اندرون ملک سے آگے بیرون ملک مہاجرت اس کی ایک قدیم روایت رہی ہے[1]۔ جون پور، اعظم گڑھ

---

[1] ابھی حال ہی میں حکومت یو.پی. نے اپنے State Planning Institute کے شعبۂ افرادی قوت (Manpower Division) کے ذریعہ ضلع اعظم گڑھ کے دو بلاکوں پھول پور اور مارٹن گنج کے چار گاؤں کا برسرموقع جائزہ لیا ہے۔ اس کی رو سے اس علاقہ میں پردیس مہاجرت سے چھپن فی صدی خاندان متاثر ہیں، مسلمان آبادی اور پسماندہ برادریوں میں اس کا رجحان نسبتہً زیادہ ہے۔ اس مطالعہ کی رو سے متاثر ہونے والے خاندانوں میں اناسی فی صدی مسلمان اور اکیس فی صدی ہندو ہیں۔ ان مہاجرت اختیار کرنے والوں میں ۴۱ فی صدی افراد کی عمر ۱۵ سے ۲۴ سال کے درمیان ہے جبکہ چونتیس فی صدی افراد پندرہ سے چونتیس سال کی عمر کے درمیان ہیں۔ باہری ملکوں میں جانے کا رجحان اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ تقریباً پینسٹھ فی صدی افراد خلیجی اور مشرق وسطیٰ کے ملکوں، سعودی عرب، دوبئی، بحرین، مسقط، نیز یورپی اور ایشیائی ممالک (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور اس کے گرد و پیش کے علاقہ کے مسلمانوں کا پردیسی مرکز بمبئی اور کلکتہ کے علاوہ خاص طور پر برما تھا۔ وہاں کا سلسلہ ختم ہوا تو سنگاپور اور ملیشیا نے اس کی جگہ لی۔ ان ملکوں میں اس کے امکانات تنگ ہوئے تو خلیجی ریاستوں کا دروازہ کھلا۔ جس نے اس سلسلہ کے اب تک کے تمام رکارڈ کو مات کر دیا اور اس دائرے کی تمام رہی سہی کسر پوری کر دی۔ سنگاپور اور ملیشیا میں مسلمانوں نے پردیس کی زندگی ایسی گزاری کہ بیوی بچوں کو وطن میں تنہا چھوڑ کر یک دفعہ چار چار، چھ چھ بلکہ بیشتر اوقات دس دس سال تک وہیں رہ گئے۔ ان عورتوں کی قسمت پر الگ سے ماتم کیجئے جو بیوی ہو کر بھی عملاً بیوگی کی زندگی بسر کرتی رہیں اور جو شوہر والی ہوتے ہوئے بھی زندگی کا بڑا حصہ بے شوہر کے گزار دیتی رہیں۔ ایسی اولادیں بھی کم رحم کے قابل نہیں جنھیں اپنی جوانی کی بیس پچیس سال کی عمر تک اپنے 'باپ جان' کو دو چار بار سے زیادہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ اپنے ہی جگر گوشوں کے لئے ہر نئے سفر میں باپ کو باپ باور کرانے کے لیے کافی جتن کرانا پڑتا ہے۔ ایسی مثالیں بھی کم نہیں ہیں کہ شوہر پردیس گیا تو وہ سرزمین اسے ایسی پسند آئی اور وہاں کے جال میں وہ ایسا پھنسا کہ دوبارہ وطن پلٹ کر آنے اور بیوی بچوں کی خبر لینے کا اسے کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔ وہ اگر یہاں آیا بھی تو زندگی کے آخری چند ایام گزار کر مرنے ہی کے لیے آیا۔ جبکہ بہت سے وہ رہے جو وہیں کی خاک کا پیوند ہو رہے۔ اور ان کے نام پر زندگی بھر کے لیے خاک ہو جانے والی بیوی کے لیے ان کا آخری دیدار بھی نصیب نہ ہو سکا۔ تازہ صورت حال میں خلیجی ملکوں کے مخصوص ضوابط کی برکت سے پردیس کی اس طرح کی عبرت ناک مثالیں تو کم ہیں۔ البتہ ایسے نمونے بہت دیکھنے کو آتے ہیں کہ جوان لڑکے کی شادی ہوئی اور اس کے دو دن اور چار دن بعد وہ سال دو سال کے لیے خلیج کے صحرا میں جا کر گم ہو گیا۔ لڑکے کے علاوہ دینی لحاظ سے نئی نویلی دلہن کی کمزوریوں اور مجبوریوں کا احساس نہ لڑکے کے والدین کو ہوتا ہے نہ لڑکی ہی کے ماں باپ کو۔ انسانی احساس کی لو کہیں جگتی بھی ہے تو معاشی مسابقت اور زندگی کے خود ساختہ معیارات کے پر تند طوفان میں وہ بہت جلد بجھنے کے لیے مجبور ہو جاتی ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جس پر دیندار اور غیر دیندار ہر ایک کا اشتراک ہے۔ نوجوان لڑکے اپنی تعلیم اور تعمیر کی عمر میں

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ کا) جیسے برطانیہ، سنگاپور اور ملیشیا وغیرہ کی طرف ہجرت کر چکے ہیں، اندرون ملک دوسری ریاستوں میں مہاجرت کا اوسط صرف پینتیس ۳۵ فی صد ہے۔ جس میں مہاراشٹرا، دہلی، پنجاب، گجرات، راجستھان، بہار اور آسام قابل ذکر ہیں۔ اندرون یوپی کے مختلف علاقوں منتقلی کا اوسط کل ایک فی صد ہے، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ہندوستان ٹائمس نئی دہلی، ۲۰ دسمبر ۱۹۸۵ء۔ خبر

Bid to check villagers emigration fails

دوسروں کی چاکری اور وقت سے پہلے کمائی کی نت نئی صورتوں میں لگے ہوئے ہیں، دیندار افراد اور دیندار گھرانے بھی اس پر اسی طرح قانع و مطمئن بلکہ پوری طرح خوش اور مگن ہیں۔

پردیس کی زندگی کے نقصانات: اس صورت میں پردیس کی زندگی اور گھر کے ذمہ دار افراد کی اہل وعیال سے مسلسل دوری اپنے اندر جو چند در چند نقصانات رکھتی ہے، خاص طور پر اسلام کے نقطۂ نظر سے، اسے، تھوڑے سے غور وفکر سے آسانی کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ نفسیاتی نقصان: پردیس کی اس طرح کی زندگی جس میں آدمی طویل وقفوں کے لیے مسلسل اپنے بیوی بچوں اور بے تکلف دوست احباب سے دور رہے، اس کا سب سے پہلا نقصان ذہنی اور نفسیاتی ہے۔ انسان کوئی مشین کا پرزہ یا محض جانور نہیں ہے کہ محض اس کا پیٹ بھر دینے سے اس کی تمام ضروریات پوری ہو جاتی ہوں۔ وہ ایک ذی شعور اور ذی ارادہ ہستی ہے۔ کھانے پینے اور پیٹ بھرنے کے علاوہ اس کی دوسری ذہنی اور نفسیاتی ضروریات بھی ہیں۔ جو لیسا اوقات اس کی مادی ضروریات کے مقابلہ میں بھی زیادہ اہم ہوتی ہیں۔ دن اور رات میں کام کے اوقات کے بعد اس کی اہم ترین نفسیاتی ضرورت ہے کہ اس کا کچھ وقت اپنے بیوی بچوں اور بے تکلف دوست اور احباب کے ساتھ گزرے۔ ضرورت کے تقاضے سے ہفتے دو ہفتے یا مہینے دو مہینے کے لیے اس معمول میں خلل آجائے تو چنداں ہرج نہیں کہ اس کے بغیر زندگی کی گاڑی کا چلنا مشکل ہے، البتہ طویل وقفوں کے لیے اس سے مسلسل محرومی اس کی شخصیت کو غیر معمولی طور پر متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی ہے۔ ناخواندہ اور جاہل افراد جن کے احساسات عام طور پر جانوروں سے قریب تر ہوتے ہیں، اگر وہ اس معصیت کو محسوس کیے بغیر، اپنے زندگی کے دن پورے بھی کر لے جائیں تو سمجھ دار، پڑھے لکھے اور باشعور انسانوں کے لیے یہ وہ بھاری بوجھ ہے جسے وہ آسانی کے ساتھ نہیں اٹھا سکتے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اکثر و بیشتر ناخواندہ اور ان پڑھ افراد بھی اپنے کو اس مصیبت کے اثرات سے بچانے میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ چنانچہ معلوم ہے کہ اس وقت ہندوستان اور دوسرے ایشیائی ممالک کے مزدور پیشہ لوگ جو خاص طور پر خلیجی ممالک میں پردیس کی زندگی گزار رہے ہیں، بال بچوں سے دوری اور وہاں کی زبان اور ماحول کی اجنبیت کے نتیجہ میں طرح طرح کے نفسیاتی عوارض کا شکار ہیں۔ اور معاشی خوش حالی انھیں زندگی کا سکون فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ عام طور پر لوگوں کو اگر معاشی آسودگی کے پردے میں ان کی ذہنی ناآسودگیوں کی جھلک نہ بھی دکھائی دے سکے تو چہ

اور دراک طبیعتوں کے لیے ان کے چہروں پر محرومی اور مایوسی کی لکیریں صاف طریقے پر پڑھنے میں آجاتی ہیں۔

۲۔ بیوی کی مظلومیت : پردیس کی اس زندگی میں بیوی کی جیسی کچھ مظلومیت ہے وہ بالکل سامنے کی حقیقت ہے۔ وہ شوہر والی ہوکر بھی اپنی زندگی کا بڑا حصہ عملاً بے شوہری میں گزار دیتی ہے۔ ظاہر ہے پردیس کی یہ صورت کہ آدمی باہر سے دو دو چار چار بلکہ بسا اوقات آٹھ آٹھ دس، دس سال کے بعد چند ماہ یا زیادہ سے زیادہ ایک آدھ سال کے لیے وطن بال بچوں میں آئے، جیسا کہ یوپی کے بعض پوربی اضلاع میں خاص طور پر سنگاپور اور ملیشیا کے مسلمان پردیسیوں کا معمول رہا ہے، اس صورت میں یہ تو ہو جاتا ہے کہ بیوی بے اولاد نہیں رہتی ہے، لیکن اس سے ہٹ کر ازدواجی زندگی کی جو راحتیں اور مسرتیں ہو سکتی ہیں، ان سے اسے برائے نام ہی حصہ ملتا ہے۔ پردیس کا زمانہ عام طور پر آدمی کی جوانی اور تندرستی کا زمانہ ہوتا ہے جبکہ وہ خوب کام کرنے اور کمانے کے قابل ہوتا ہے۔ پھر انسان کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ سن شعور کو پہنچنے کے بعد وہ روزی روٹی کے جس راستے پر لگ جاتا ہے، زندگی کے آخری ایام تک اکثر و بیشتر وہ اس راستے کو بدلنے میں کامیاب نہیں ہو پاتا ہے۔ اس طرح یہ غریب پردیسی اپنی پوری عمر باہر گزار کر بال بچوں میں مستقل قیام کی غرض سے واپسی کا ارادہ بالعموم اسی وقت کر پاتے ہیں جبکہ کسی کام کے قابل نہ رہ کر صرف زندگی کے آخری دنوں کے منتظر ہوتے ہیں۔ حال میں جو خلیجی ممالک کی طرف مہاجرت کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے جس میں پردیسیوں کی غالب اکثریت نوعمروں اور نوجوانوں کی ہے، بسا اوقات دیکھنے میں آیا ہے کہ شادی کے دس بیس دن بلکہ کبھی کبھی تو دو چار دن کے بعد ہی نئے شوہر بیویوں کو

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہٗ بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

کی کیفیت میں چھوڑ کر سال سال دو دو سال بلکہ بسا اوقات اس سے لمبے وقفوں کے لیے غائب ہو جاتے ہیں۔ مثل اپنے اندر حقیقت رکھتی ہے کہ 'مرگ انبوہ جشنے دارد' کہ سو آدمی ساتھ مر جائیں تو ہارت کی بیڑ اکٹھا ہو جاتی ہے۔ مذکورہ آبادیوں میں پردیس کا ایسا چلن ہے کہ بیوی کی اس مظلومیت اور ازدواجی زندگی کی ان محرومیوں پر دکھ اور اضطراب تو کجا اس کے احساس سے بھی ذہن و دماغ تقریباً خالی ہیں۔ یہاں تک کہ عقلیں ایسی اوندھی ہوئی ہیں کہ اس صورت حال کو کمی اور کمزوری تسلیم کرکے اس کے ازالہ کے لیے فکرمند ہونے کے بجائے اس پردیس پر فخر کیا جاتا ہے۔ اور جو گھر اپنے جتنے زیادہ مردوں سے محروم ہے گرد و پیش میں اس کی بڑائی کے چرچے

بھی اس قدر بڑھے ہوئے ہیں۔ عام مسلمان ہی نہیں ان کا روایتی دین دار طبقہ بھی اور روایتی علما بھی اس صورتحال پر ایسے ہی مگن ہیں۔ وعظ و تذکیر کی کسی مجلس میں اس کی طرف توجہ مبذول کرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی ہے۔ حالانکہ کتنی ہی عورتیں ہیں جو اس کے نتیجے میں مستقل امراض کا شکار ہو جاتی ہیں جہاں تک ذہنی و نفسیاتی بیماریوں کا تعلق ہے اس کا تو خیر کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔

۳۔ **حدود اللہ کے ٹوٹنے کا مسلسل اندیشہ:** گھر بار سے مسلسل دوری کی اس زندگی میں بیوی نہیں شوہر بھی اسی طرح مظلوم ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں خاص طور پر ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے شوہر اور بیوی دونوں ہی ایک ایسی صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں جس سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز ان کے لیے فی الحقیقۃ تشویش انگیز نہیں ہو سکتی۔ اور وہ یہ کہ ایک دوسرے سے دور رہنے کے باعث زندگی کے طویل ترین عرصے میں وہ دونوں اپنی طرف سے حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کے اندیشے میں گھرے ہوتے ہیں۔ جنس (sex) کے معاملے میں اسلام جیسا کچھ حساس ہے معلوم ہے۔ یہی وجہ ہے جو اس نے اپنے نظام زندگی میں بھرپور جنسی زندگی کی سہولت بہم پہنچائی ہے اور اس کے لیے کشادہ راہوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی رشتۂ ازدواج سے باہر جنسی تعلق اس کے نزدیک اتنا ہی مبغوض ہے۔ اور ایسے مجرموں کے لیے اس نے سخت ترین سزائیں تجویز کی ہیں۔ شادی سے پہلے کمسنوں کو وہ زیادہ سے زیادہ معصوم اور جنسی معاملات سے بے بہرہ دیکھنا چاہتا ہے[1]۔ بلوغت کے بعد کسی بڑی رکاوٹ کے بغیر وہ جلد شادیاں کر دینے کو پسند کرتا ہے۔ شادی کے بعد بیوی کا مکان الگ ہونا چاہیے تاکہ زن و شو کی ذہنی و نفسیاتی تسکین کے علاوہ جنسی تعلق کے سلسلے میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ رہے۔ بیوی کا بستر علحدہ کرنے کو اس کے حق میں سزا قرار دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہا گیا کہ اگر آدمی کی نگاہ کسی نامحرم پر پڑ جائے اور اس کے جنسی داعیہ کو مہمیز ہو جائے تو فوراً گھر آکر اپنی بیوی سے اپنی ضرورت پوری کر لے[2]۔ چار ماہ سے زیادہ عدت سے جنسی

---

[1] اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہمارا مضمون "جنسی تعلیم کا مسئلہ اور اسلام" مطبوعہ زندگی نو دہلی اپریل ۱۹۸۰ء [2] تفصیلات کے لیے دیکھا جائے ہمارا مقالہ "مشترکہ خاندانی نظام اور اسلام" مطبوعہ تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، اپریل۔جون، جولائی۔ستمبر ۱۹۸۶ء

تعلق کے قطع کرلینے کی قسم (ایلاء) کو ناجائز قرار دیا گیا۔ اگر آدمی کی ضرورت ایک بیوی سے پوری نہ ہوتی ہو تو حدود اللہ کی رعایت کے ساتھ بیک وقت چار چار بیویاں رکھنے کی اجازت دی گئی۔ کہاں جنسی لحاظ سے انسان کو بے راہ روی سے بچانے کے یہ تحفظات اور کہاں یہ صورت کہ اکثر و بیشتر آدمی اپنی جوان بیوی کو اس کی کمزوریوں کا لحاظ کیے بغیر تنہا چھوڑ کر سال دو سال کے لیے نہیں بسا اوقات آٹھ آٹھ، دس دس سال کے لیے غائب ہو جائے۔ ایسی مثالیں بھی کم نہیں کہ شوہر جوانی میں پردیس کو سدھارا تو زندگی بھر کے لیے اس کو گھر پلٹنا نصیب نہ ہو سکا۔ بیوی نے ایک اولاد کو لے کر پوری زندگی خاک کردی۔ اور ایسا بھی ہوا کہ بیجا رسم و رواج کی زنجیروں نے اسے دوسری شادی کے لیے آزاد نہ کیا اور وہ بے راہ ہونے سے نہ بچ سکی بسا اوقات "وفادار شوہر" نے چار شادیوں کی گنجائش کا فائدہ اٹھا کر پردیس میں دوسری اور تیسری شادی رچالی۔ اور وطن کے علاوہ پردیس میں بھی اپنے الگ خاندان بسا لیے۔ البتہ بدقسمت بیوی حسب دستور مجبوری اور مہجوری کی زندگی بسر کرتی رہی۔ اس کے قدم لڑکھڑا گئے تو وہ سماج کی نظروں میں ذلیل و خوار ہوئی۔ البتہ شوہر کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں جو فی الحقیقہ اسے اس انجام تک پہنچانے کا ایسا ہی مجرم ہے۔ خلیجی ممالک کی طرف بھگدڑ کے طوفان میں یہ فتنہ اور بھی پھیلا اور ثمر بار ہوا ہے، لیکن مجبوری سے آگے مادیت اور رفاہیت پسندی کے مقابلہ کی دوڑ میں اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حدوں اور اس کی عائد کردہ پابندیوں کا کسے ہوش ہے!

۴۔ <u>اولاد کی بے راہ روی</u>: ظاہر ہے جب گھر کا سردھرا اور اس کا سربراہ ہی وہاں سے غائب ہو تو ماتحت اولاد کو بے راہ روی سے کون سی چیز بچا سکتی ہے۔ مسلمان معاشرے میں بھی بیوی کے حقوق کی کل دوڑ نان و نفقہ اور اس کے متعلقات تک محدود ہے۔ بیوی کی دینی و اخلاقی تربیت اور نگرانی اسے علم دین سے آراستہ کرنا اور اسے حدود اللہ کا پابند بنانا، ان امور کا خیال شاذ و نادر ہی ذہنوں میں آتا ہے۔ البتہ اولاد کی نسبت سے باپ کی ان ذمہ داریوں کا احساس کسی قدر زندہ اور بیدار ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ باپ کی طرف سے اولاد کی تربیت و نگرانی کا فرض اسی وقت انجام دیا جا سکتا ہے جبکہ ان کے درمیان اس کی مسلسل موجودگی رہے اور اگر وقفہ غیر حاضری کا ہو بھی تو ایسا کہ اسے محسوس نہ کیا جا سکے جیسا کہ حدیث میں کہا بھی گیا ہے کہ اولاد کے اوپر سے ادب کی چھڑی کبھی نہ اٹھنی چاہیے اور اللہ

کے بارے میں انھیں برابر ڈرائے رکھا جانا چاہئے[1]۔ طویل وقفوں کی پردیس کی مسلسل زندگی خاص طور پر اسلام کے نقطۂ نظر سے تربیت اولاد کی اس اسکیم کو بالکل خاک میں ملا دیتی ہے۔ اسلام ہی نے نہیں فطرت نے بھی مرد کو گھر کا سردار اور نگراں بنایا ہے۔ گھر پر اس کی موجودگی نہ رہے۔ تو خاص طور پر اولاد کا کمسنی اور نوجوانی کے زمانہ میں بگڑ جانا یقینی ہے۔ یک رخی معاشی خوشحالی کی چکاچوند میں ہو سکتا ہے خاندان کو اس پہلو سے اپنی محرومی اور ناداری کا احساس نہ ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ باپ کے ہوتے ہوئے اس کی عدم موجودگی میں اولاد کی اٹھان خودرو پودے کی اٹھان ہے جو اتفاق کے نتیجے میں شجر سایہ دار و ثمردار بھی ہو سکتا ہے ورنہ عام حالات میں اکثر و بیشتر اس کا جھاڑ جھنکاڑ کی صورت میں نمودار ہونا یقینی ہے۔ اولاد کی تربیت اور اس کی دینی و اخلاقی نگہداشت میں ماں کے رول کی اہمیت کے پورے اعتراف کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ اولاد اور وہ بھی خاص طور پر نرینہ اولاد کے اوپر اس کی گرفت ڈھیلی اور کمزور ہوتی ہے۔ عمر کے ابتدائی مراحل میں اگر یہ گرفت کچھ مضبوط اور گہری بھی ہو تو نوجوانی کے آغاز اور اس سے آگے کے مرحلے میں ماں بالخصوص نرینہ اولاد کی نسبت سے اپنے کو بڑی حد تک بے بس اور مجبور پاتی ہے۔ پیدائشی ہیروں اور کندنوں کو مستثنیٰ کر کے ننانوے فی صدی اولاد کے سلسلے میں یہ بات پورے اطمینان سے کہی جا سکتی ہے۔ نتیجہ ہوتا ہے کہ اولاد باپ کی ادب کی چھڑی سے آزاد ہو کر بے نکیل پھرتی اور اکثر و بیشتر آوارہ گردی اور نکمے پن کے سوا اس کا دوسرا انجام نہیں ہوتا ہے۔ بیرون ملک کا پردیس عام طور پر اپنے ساتھ وہ معاشی فارغ البالی لاتا ہے جس کی وجہ سے اس طرح کا خاندان اپنے پاس پڑوس کے غیر پردیسیوں یا اندرون ملک پردیسیوں کے مقابلے میں نمایاں حیثیت اختیار کر لیتا ہے باپ کی نگرانی و نگہداشت سے محرومی کے ساتھ کچی عمر کی اولاد کو جو غیر متوازن مالی سہولیات حاصل ہو جاتی ہیں وہ اس کے لیے بگڑنے کے امکانات اور اس کی رفتار کو بہت تیز کر دیتی ہیں۔ ماں اگر سنجیدہ اور سمجھدار ہو جب بھی خاص طور پر اولاد کے سیانے ہونے کے بعد مضبوط نگرانی رکھنے اور عائلی پابندیاں عائد کرنے میں کامیاب نہیں ہو پاتی۔ لیکن بیجا ممتا کی کمزوری کے ساتھ اگر وہ اس سلسلے میں نسبتہً زیادہ ڈھیل کا مظاہرہ

---

[1] مسند احمد ۵/۲۳۸ نیز: مشکوٰۃ المصابیح، جلد ا۔ کتاب الایمان، باب الکبائر و علامات النفاق فصل ثالث

کردے تو پھر تو اولاد کے بگڑنے کی رفتار تیز سے تر ہو جاتی ہے، باہری پردیسیوں کے سلسلے میں یہ تک بھی دیکھا گیا ہے کہ نگرانی سے محروم ناشائستہ اولاد قابو سے باہر تو ہوتی ہی ہے، ان کی ناہنجاری اس حد تک آگے بڑھتی ہے کہ اپنے لیے والدین کی بے پناہ قربانیوں کا کچھ لحاظ کیے بغیر بسا اوقات وہ اپنی ہی ماں کو زدوکوب کی ناقابل معافی حرکت کے ارتکاب سے بھی نہیں چوکتے ہیں، ماں کا ماں ہونا اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اکثر و بیشتر وہ اولاد کی اس طرح کی زیادتیوں کو مسلسل برداشت کرتی اور دوری اور مجبوری کی صعوبت کے ساتھ اس مصیبت کو بھی اسی طرح اشک ریز کرتی رہتی ہے۔ اس طرح گھر پردیس کی اس کمزوری اور ناہمواری کا احساس بسا اوقات ہوتا بھی ہے لیکن خاندان خاص معیار زندگی کے جس دام کا اسیر ہو چکا ہوتا ہے اور جس کے بندھن سے رہائی اس کے لیے آسان نہیں ہوتی ہے، خاکستر کے اس ڈھیر میں احساس کی یہ ہلکی چنگاری بھی بالآخر خاکستر ہی ہو کر رہ جاتی ہے۔ واقعہ ہے کہ صالح بیوی کے بعد دنیا کی سب قیمتی متاع صالح اولاد ہے۔ اگر یہ صحیح تربیت اور صحیح نگرانی کے ذریعہ دین و دنیا کے کام کی بن کر ماں باپ کے نگاہوں کی ٹھنڈک بن سکے تو زندگی میں اس سے بڑھ کر ان کے لیے کوئی دوسری کامیابی نہیں۔ اگر اولاد ناکارہ اور بے راہ ہو جائے تو حساس والدین کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی صدمہ نہیں جو زندہ رہ کر بھی تادم آخر انہیں موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا رکھے۔ ناخواندہ، جاہل، روح دین سے بے بہرہ بے حس والدین کے لیے ہو سکتا ہے مختصر مدتی (SHORT TERM) معاشی چکاچوند میں اس طرح کی کسی کشمکش کا سامنا نہ ہو لیکن دین آشنا اور حساس والدین کے لیے "یہ وہ صدمہ ہے جو ان کی ہڈیاں گھلا دینے والا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ماں باپ کی پوری نگرانی اور نگہداشت کے باوجود بھی اولاد بگڑ جاتی اور بے راہ ہو جاتی ہے لیکن بہر حال اس صورت میں آدمی کو عند اللہ و عند الناس یہ کہنے کے لیے اطمینان رہتا ہے کہ اس نے اپنے بس بھر تو تربیت و تعلیم میں کوئی کمی نہ رکھی۔ آگے اگر قسمت ہی کا نہ لکھا ہو تو اس کا کیا کیا جا سکتا ہے؛

۵۔ نمائشی زندگی: اس پس منظر میں خاص طور پر بیرون ملک پردیس کا ایک بڑا نقصان مصنوعی اور نمائشی زندگی ہے۔ ہندوستان اور اس جیسے دوسرے ملکوں کے لیے غریبی اور بیکاری کے علاوہ بیرون ملک پردیس

کا بڑا محرک بڑھے ہوئے زرمبادلہ (FOREIGN EXCHANGE) کا حصول ہے. بال بچوں کو چھوڑ کر اس طرح کا تنہا پردیس اختیار کرنے والے عام طور پر کمزور اور بے سہارا لوگ ہی ہوتے ہیں. ہندوستان جیسے ملکوں میں رہ کر جن کی عام طور پر اوسط آمدنی بہت ہی ناقابل لحاظ ہوتی ہے. بیرون ملک پردیس کے مراکز کے سکّے (Currency) ہندوستان یا پاکستان اور بنگلہ دیش وغیرہ کے مقابلے میں کافی بڑے ہوتے ہیں. اس کا نتیجہ ہے کہ ان ملکوں میں جن لوگوں کی آمدنیاں تھوڑی اور معمولی تھیں، اس زرمبادلہ کی بدولت ان کا نیا اوسط بہت بڑھ جاتا ہے. یہ تو اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ حکومت کے مقرر کردہ معروف طریقے (PROPER CHANNEL) سے رقمیں اپنے لوگوں کو ارسال کی جائیں. لیکن اگر اس سے ہٹ کر حکومت سے نگاہیں بچا کر بلیک وغیرہ کا طریقہ اختیار کیا جائے. ملازمت پیشہ اور چھوٹے کاروباری لوگوں میں جس کا رواج نسبتہً زیادہ بلکہ عام چلن ہے، تو آمدنی کے اس اوسط میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے[1]. جواز اور عدم جواز سے قطع نظر مقامی سطح پر یہ چیز جس معاشی عدم توازن کو جنم دیتی ہے اس کا اندازہ آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے. وہی خاندان جس کی معاشی لحاظ سے اس سے پہلے کوئی گنتی نہ تھی، اس پہلو سے اب وہ نمایاں ترحیثیت اختیار کر لیتا ہے اور ہر طرف سے نگاہیں اس کی طرف اٹھنے لگتی ہیں. اچانک معاشی امتحان کو سہار لے جانا عام طبائع کے لیے بھی آسان نہیں. لیکن اس کے ساتھ اگر جہالت، ناخواندگی اور دینی وابستگی کی کمزوری جیسے امراض بھی شامل ہو جائیں تو اس نسبت سے گھر کے بے قابو ہو جانے کے امکانات بہت بڑھ جاتے ہیں. سب سے زیادہ اس کا اثر تو ناقصات عقل و ناقصات دین، عورتوں پر پڑتا ہے، پھر بن سری اولاد کا کیا کہنا جو باپ کی عدم موجودگی میں پہلے ہی سے شتر بے مہار ہو چکی ہوتی ہے. گھر کے دوسرے پختہ کار افراد اس بلا سے محفوظ بھی رہ جائیں تو کمانے والے کے قریبی متعلقین جن کے اوپر فطری طور پر اس کی توجہ کی نظر ہوتی ہے، ان کا اس سے بچ جانا بہت مشکل ہے.

---

[1] اس پر فخر ہی کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی آفات کے سبب پہنچی بعض مشرقی اضلاع میں سے اس ایک سرزمین میلاد [illegible] کا [illegible] ہے اور [illegible] اس [illegible] کاروبار میں سرمایہ کاری کا شرف [illegible] دنیا [illegible] کو حاصل ہے.

ایک طرف تو اس خاندان کے لیے اپنے قریبی ماحول میں روپیوں پیسوں کا فرق پڑتا ہے، دوسری طرف بیرونی کپڑوں اور بیرونی سامانوں وغیرہ کا استعمال جو اس طرح کی پردیس کی زندگی کا لازمہ ہے، اس کے اندر ایک خاص طرح کی نمائشی طرز معاشرت کو جنم دیتا ہے۔ امریکی اور جاپانی مصنوعات میں گھرا ہوا پردیسی کا صاحبزادہ جس طرف سے گزر جائے، استعجاب اور بسا اوقات رشک و رقابت کی نگاہیں اس کی طرف لگ جاتی ہیں۔ خوش قسمتی سے اگر یہ لڑکا اسکول یا کالج میں پڑھ رہا ہو تو اس کی شان و شوکت اور آن بان کو دیکھ کر ہندوستانی طلباء ہی نہیں اکثر و بیشتر ہلکی طبیعتوں کے اساتذہ بھی اس کے مقابلے میں اپنی محرومی "پر کف افسوس" ملتے ورنہ کم از کم جی ہی میں اپنے کو کوستے ہوتے ہیں۔ سامان اور زیور ہو کر روزمرہ کے علاوہ ان کا اظہار دوسرے بہت سے مواقع پر بھی ہوتا ہے۔ مکان اور شادی بیاہ اس پردیس کی زندگی کے دو خاص مظاہر ہیں۔ چرچا یوں ہوتا ہے کہ فلاں نے شادی میں لڑکی کو دو سو جوڑے دئیے جس میں سے ایک بھی ہندوستانی نہ تھا۔ جہیز کے سامان کا غالب ترین حصہ بھی بیرونی مصنوعات پر مشتمل تھا۔ اپنوں ہی نہیں بسا اوقات اغیار میں بھی رشک و رقابت کے جذبات کو پروان چڑھانے کے علاوہ یہ نمائشی طریقہ زندگی طبیعتوں میں جو سطحیت اور اتھلا پن پیدا کرتا ہے، بامقصد، حساس اور صاحب شعور کسی بھی جماعت کے لیے یہ چیز بڑی توجہ طلب ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایسے پردیسیوں کی اولاد میں محنت شقت سے گریز، تساہلی، کام چوری، تعلیم سے محرومی، ٹھوس کاموں سے گھبراہٹ وغیرہ کی جو متعدی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور جن کا سلسلہ نسل بعد نسل مسلسل آگے کو برابر بڑھتا رہتا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اس میں خاصا بڑا دخل اس مصنوعی اور نمائشی زندگی کا ہے تو غالباً کچھ بہت زیادہ غلط نہ ہوگا۔

۵۔ **معاشی عدم استحکام**:۔ ظاہر ہے جس گروہ میں یہ امراض پیدا ہو جائیں اس کے اندر معاشی عدم استحکام کا در آنا یقینی ہے۔ عام طور پر باہری پردیس کی زندگی کی کل دوڑ اس نشانے تک محدود ہوتی ہے کہ آدمی کے بینک کھاتے میں نقد رقم موجود رہے۔ نمائشی زندگی کی اس کمزوری کے ساتھ جس کی اوپر تفصیل گزری یہ چیز عام طور پر اس طرح کے خاندانوں میں خالص صرف کے رجحان کو جنم دیتی ہے۔ ایک طرف باہر سے کچھ لوگ کما کر بھیجتے ہیں۔ دوسری طرف گھر کے لوگ بے تحاشہ صرف بیجا

خرچ کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے اس صورت حال کے ہوتے ہوئے کوئی معاشرہ معاشی استحکام سے کبھی ہم کنار نہیں ہو سکتا۔ مضبوط معاشی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے پاس قابل اعتماد مستقل معاشی ذرائع ہوں۔ زراعت، تجارت، صنعت و حرفت ملازمت آدمی کا جو بھی ذریعہ معیشت ہو مستقل ہو اور وہ پورے انہماک اور پوری ذہنی یکسوئی کے ساتھ اپنے کام میں لگا ہوا ہو۔ جس کے نتیجے میں یک طرفہ طور پر صرف پیسہ خرچ نہ ہو رہا ہو بلکہ آمد و صرف دونوں کا سلسلہ پورے توازن کے ساتھ قائم ہو۔ ایک طرف اگر تیزی سے پیسہ خرچ ہو رہا ہو تو دوسری طرف اسی تیزی سے پیسہ پیدا بھی ہو رہا ہو۔ صرف خرچ کے رجحان کی حامل بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کرنے والی پردیس کی زندگی معاشی استحکام کی اس صحیح ترتیب کو بالکل الٹ دیتی ہے۔ جہاں پیسہ پیدا کرنے کی صورتوں پر ذہن لگانے کے بجائے صرف پیسہ خرچ کرنے کی نت نئی صورتیں نکالنے پر پوری دماغی قوت صرف ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی بھر پردیس کمانے کے بعد آدمی جب آخری عمر میں گھر واپس آتا ہے تو یا تو وہ خالی ہاتھ ہوتا ہے یا بہت جلد ہو جاتا ہے۔ یکمشت نقد بڑی جمع رقم کے اندر، خاص طور پر ایک مسلمان کے لیے، زکوٰۃ وغیرہ کی ادائیگی کے پہلو سے آزمائش کی جو صورت ہے وہ اپنی جگہ، غیر نمو پذیر رقم کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ بہت جلد فنا ہو جاتی ہے۔ اس طرح کی رقم رکھنے والے مسلمانوں کے ہاں زکوٰۃ وغیرہ کی ادائیگی کا کیا اوسط ہے، اس کا صحیح اندازہ تو اعداد و شمار ہی بتا سکیں گے لیکن عام اندازہ کے مطابق بھی اس وقت اس پہلو سے جو صورت حال ہے وہ تشویش ناک ہی ہے۔ سالانہ زکوٰۃ کی ادائیگی تو اپنی جگہ رہی ایسے مسلمانوں کی بھی کمی نہیں جو جمع رقم پر ملنے والے سود کے استعمال اور کسی نہ کسی درجہ میں اس میں ملوث ہونے سے اپنے کو بچانے میں کامیاب نہیں ہیں۔ دوسرا بڑا نقصان معاشی عدم استحکام کا چکر ہے جس میں خاندان مستقل طور پر پھنسا رہتا ہے۔ گھر کی جمع شدہ رقم شاذ و نادر ہی آئندہ نسلوں کے لیے کفایت کر سکتی ہے۔ پھر اس طرح کے پردیسیوں کی اولاد عام طور پر غیر تعلیم یافتہ اور ناتراشیدہ رہ جاتی ہے جو عملاً زندگی بھر محنت مزدوری کے سوا کسی دوسرے کام کے قابل نہیں ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ گھر کا نمائشی رنگ اور اسکے آماس زدہ اخراجات دوسرا درد سر ہیں۔ انسان کی یہ کمزوری بھی ہے کہ وہ اپنی روایات اور

گردوپیش کے حالات سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ بیرون ملک کا پردیس جس گھر کی روایت بن جائے اس میں اندرون ملک کی کمائی اور اس سے حاصل ہونے والے اسباب زندگی نگاہوں کو بہت کم جچتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں مل ملا کر ایسی صورت حال پیدا کر دیتی ہیں کہ نئی نسل کے لیے اس سے زیادہ کوئی دوسری راہ آسان نظر نہیں آتی کہ وہ بھی باپ دادا کی پرانی روایت پر عمل کر کے اپنے لیے بھی اسی "بن باس" کا فیصلہ کرے۔ اس طرح مضبوط معاشی وسائل سے محروم رہ کر خاندان معاشی عدم استحکام کے ایسے حصار میں پھنس جاتا ہے کہ اگر وہ اس سے نکلنا بھی چاہے تو آسانی سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

اس طرح کی پردیس کی زندگی میں معاشی عدم استحکام کا دوسرا پہلو بھی ہے حکومت کی دست رس سے باہر زرمبادلہ کی کثرت، جبکہ اس طرح کے علاقوں میں عام طور پر اسی طریقہ کو رواج عام حاصل ہوتا ہے، افراط زر (INFLATION) کو توجنم دیتی ہی ہے جس سے معیشت پر ایک طرح کا غیر فطری آماس پڑھتا ہے، ساتھ ہی یہ چیز اس طرح کے علاقوں میں بڑے پیمانے پر کساد بازاری کا سبب بنتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ اس طرح کے پردیسی نہ صرف یہ کہ باہر سے زرمبادلہ لاتے ہیں بلکہ کپڑے اور دوسری ضرورت کے سامان بھی زیادہ سے زیادہ لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو بسا اوقات خاندان اور رشتہ کی ضروریات سے آگے بڑھ کر قریب کے بازاروں میں برائے فروخت پہنچ جاتے ہیں۔ بلکہ بہت سے لوگ تو یہ سامان اسی مقصد سے لاتے ہی ہیں کہ باہر کم دام میں خرید کر یہاں زیادہ قیمت میں بیچ دیں گے۔ اور کم محنت میں زیادہ منافع حاصل کریں گے۔ اب صرف یہی نہیں ہوا کہ ایک خاندان اپنے بازار سے سامان نہیں خریدتا بلکہ دیسی سامانوں کے بالمقابل باہر کے زرق برق سامان پاٹ کر وہ ملکی دوکانداروں کے لیے سخت آزمائش پیدا کر دیتا ہے۔ اس طرح کے خطے میں صنعت و حرفت کے اضمحلال اور کاروبار و روزگار کے مواقع کی کمی کے باعث اوسط آبادی کی قوت خریدیوں ہی کم ہوتی ہے جس کی وجہ سے بازار مطلوبہ رونق اور چہل پہل سے خالی ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اگر کساد بازاری کے دوسرے محرکات بھی شامل ہو جائیں تو اس کے مندے پن کا جو حال ہوگا ظاہر ہے۔ اس طرح کاروبار کی مختلف صورتیں ابھرتی ہیں جو مسلسل پژمردگی اور خسارے کا شکار ہوتی ہیں۔ اوسط درجے کے کاروبار میں خسارے کو زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح بہت

سے لوگ جو عزم و حوصلہ کے ساتھ خاندان کی تنگ دستی اور مضبوط معیشت کے جذبے سے اپنے لیے کاروبار کو ذریعہ آمدنی بنانے کے آرزومند ہوتے ہیں، کساد بازاری کے مسلسل حملے سے بسا اوقات ان کی ہمتیں بھی پست ہو جاتی ہیں اور خیر اسی میں نظر آتی ہے کہ دو کان بند کرکے پردیس کی راہ لی جائے اور اپنی پسند اور سوچ سے دست بردار ہو کر خود کو ہوا کے رخ پر ڈال دیا جائے۔

اس زندگی میں معاشی خسارہ کا ایک تیسرا پہلو بھی ہے۔ جس شخص کو پردیس میں ہمیشہ ایک روپیہ کو دس روپیہ دیکھنے کی عادت ہو جائے، خواہی نخواہی اولاد پر بھی اس کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ نتیجہ ہوتا ہے کہ سہل پسندی اور محنت سے فرار اس طرح کے خاندانوں کا مزاج بن جاتا ہے۔ اور ذہن ہمیشہ اس سوچ میں لگا رہتا ہے کہ ہیرا پھیری کی کون سی صورت اختیار کی جائے کہ پلک جھپکتے چھوٹا سرمایہ بڑا بن جائے۔ یہ مقصد چوری چھپے امریکی ڈالر بیچنے سے حاصل ہو یا بیرونی زرمبادلہ کی درآمد کی خفیہ ایجنسیوں کے قیام کے ذریعہ۔ باہر کے سامان بیچ کر ایک کا دس کر لیا جائے یا ٹریولنگ ایجنسیوں کی ایجنٹی یا ایجنٹوں کی دلالی کرکے آناً فاناً دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر لی جائے۔ بہر حال کاروبار کی ایسی صورت چاہیے جس میں صرف ہیرا پھیری سے کام چلے ایک روپیہ دس بنے، لگ کر طویل المیعاد محنت و مشقت سے واسطہ نہ پڑے۔ ایسے طبقے کے لیے کاروبار کی وہ صورتیں جن میں ایک روپیہ ایک ہی روپیہ رہے اور بسا اوقات لمبے عرصوں تک ناقابل لحاظ یافت پر سخت جانفشانی کے ساتھ دن رات ایک کر دینا پڑے، کاروبار کی ایسی صورتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس لیے عام طور پر ٹھوس کاروباری جدوجہد یا تو سرد مہری کا شکار رہتی ہے، اور اگر دوکانیں کھلتی بھی ہیں تو جیسی ہی وہ کھلتی ہیں ویسے ہی ان کے بند ہونے کا بھی سلسلہ لگا رہتا ہے۔ مزید براں اس بے دلی کے کاروبار میں اگر نگاہیں اٹھتی بھی ہیں تو اکثر و بیشتر کاروبار کی ان صورتوں کی طرف جنھیں مریضانہ ذہنیت کا ہی آئینہ دار کہا جاسکتا ہے۔ زینت و آرائش کی دکانیں، نئی اسٹوڈیو، فوٹوگرافی کے مراکز وغیرہ۔ اشیائے ضرورت کے کاروبار جن میں سرمایہ لگانے کے ساتھ آدمی کو محنت اور جدوجہد بھی سخت کرنی پڑتی ہے اور دراصل یہی کاروبار ہیں جو مضبوط معیشت کی بنیادیں ہیں ایسے پردیس کے علاقے لوگ ان میں ہاتھ لگانے کی ہمت کم ہی کر پاتے ہیں۔

۷. **ہندوستان کے مخصوص حالات کا تقاضا:** خاص طور پر بیرون ملک پردیس کی زندگی کے ان ضرر بھی نقصانات کے علاوہ، نقصان کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جس کا تعلق بالخصوص ہندوستان کی مسلمان قوم سے ہے۔ اسلام معاشرتی زندگی کے جس نقشے کا قائل ہے، اس میں مرد خاندان کا بہمہ وجوہ سربراہ ہے۔ اس کے ذمہ صرف مالی ضروریات کی فراہمی ہی نہیں۔ خاندان کی ہر طرح سے نگرانی اور نگہبانی اس کے ذمہ ہے۔ بیرون ملک کا پردیس آدمی خاندان کو مالی اعتبار سے جیسا کچھ بھی آسودہ حال کرے، خاندان کی حفاظت اور نگہداشت کے پہلو سے اس کی محرومی بالکل سامنے کی چیز ہے۔ جبکہ آج خاص طور پر ہندوستان کے مسلمان خاندانوں کی نسبت سے یہ مسئلہ جس غیر معمولی اہمیت کا حامل بن گیا ہے اس کے سلسلے میں کچھ مزید کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرٹھ اور ملیانہ کے تازہ واقعات نے بتا دیا ہے کہ مسلمانوں کے لیے نہ صرف یہ کہ اپنے گھروں کو تنہا چھوڑ کر باہر رہنے کا کوئی موقعہ نہیں ہے بلکہ گھر پر رہ کر بھی انھیں صرف کمائی کی مشین بن کر نہیں رہنا ہے۔ بلکہ خاندان کی جان و مال اور اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے اس سے آگے بھی بہت کچھ کرنا ہے۔ حق و انصاف کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اگر انھیں یک طرفہ طور پر دہشت و بربریت کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو اس سلسلے میں اپنے مذہب کی تعلیمات اور اسلام کے عائد کردہ حدود و آداب کی رعایت کرتے ہوئے، ایسا اوقات اپنی جان پر کھیل جانا ان کی اولین ذمہ داری ہے۔ ظاہر ہے کہ صرف پیسوں کی ریل پیل کے لیے اگر آبادیاں مردوں سے بالکل خالی ہوں، جیسا کہ بعض علاقوں میں مسلمانوں کی نسبت سے اس کا عام رواج ہے، تو نازک مواقع پر خاندان کی حفاظت و دفاع کے لیے ننھے بچے اور عورتیں اور بوڑھے لوگ کچھ کرنا بھی چاہیں تو کیا کرسکتے ہیں۔ اس پہلو سے آج مسلمانوں کے لیے اندرون ملک پردیس بھی کچھ کم خطرناک نہیں۔ اور یہ مسئلہ بھی ان کے لیے مسلسل سوچ اور فکر مندی کا ہے کہ وہ معیشت کے ایسے ذرائع پیدا کریں جس میں خاندان بن سرا ہو کر نہ رہے اور روزی روٹی کے حصول کے ساتھ تا بہ حد امکان گھر کی عزت و آبرو کی حفاظت کا بھی سامان رہے۔ لیکن اندرون ملک پردیس کی نسبت سے اگر ان مقاصد کا حصول دشوار ہے تو بیرون ملک کے لیے اسے دشوار تر ہی کہا جاسکتا ہے۔ اندرون ملک پردیس کی زندگی میں گھر سے تعلق اور وہاں

آمدورفت کا سلسلہ نسبتہً جلد لگا رہتا ہے۔ اور مالی تعاون کے ساتھ خاندان کی نگرانی ونگہداشت کی ذمہ داری بھی آدمی کسی نہ کسی قدر ادا کرلیتا ہے۔ جبکہ بیرون ملک کے پردیس میں مالی اطمینان سے ہٹ کر دوسرے تمام پہلوؤں سے آدمی بڑی حد تک بالکل مجبور اور بے بس ہوتا ہے۔ کون نہیں کہے گا کہ اس صورت میں پردیس کی چمک دمک سے خاص طور پر مسلمانوں کی نگاہوں کو خیرہ نہ ہونا چاہئے، بلکہ ایک مسلمان کے لیے اس کی دینی ذمہ داریوں کی نسبت سے دوسرے مسائل بھی ہیں جن پر اسے اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ ہی سوچنے اور فکرمند ہونے کی ضرورت ہے۔

(باقی)

اسلامی تہذیب اور رسم و رواج

محمد مسعود عالم قاسمی

رسم و رواج سماجی زندگی کی علامت ہوا کرتے ہیں۔ اور تہذیب کے اجتماعی پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔ رسم و رواج اور تہذیب میں جسم اور لباس کا تعلق پایا جاتا ہے جس طرح جسم کی ساخت اور تناسب اعضا کے مطابق لباس کی تراش و خراش ہوتی ہے اسی طرح تہذیبی خصوصیات کے مطابق رسم و رواج کی ترکیب ضروری ہے، مثل مشہور ہے کہ انسان اپنے لباس سے پہچانا جاتا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ تہذیب بھی اپنے رسوم و رواج اور سماجی مظاہر سے پہچانی جاتی ہے مشہور مفکر جان ڈیوی نے تہذیب کو رسموں کا نظام قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں "تہذیب ایک پیچیدہ نظام رسوم ہونے کی حیثیت سے اپنے آپ کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہے یہ اپنے آپ کو اس وقت دوبارہ وجود عطا کر سکتی ہے جب کہ وہ اپنے افراد کے خلقی اور جبلی ڈھانچو میں تبدیلی پیدا کر لے"۔ [1]

تہذیب کے مطالعہ میں رسم و رواج کی اہمیت اور افادیت کا ایک بڑا پہلو یہ ہے کہ قوانین کی تمدین سے پہلے رسم و رواج ہی دستور العمل ہوا کرتے تھے، لوگوں کے معاملات زندگی انہی کے ذریعہ طے ہوتے تھے، اور لوگ ملکی دستور کی طرح ان کو واجب الاحترام سمجھتے تھے، قومی ارتقا کے آغاز میں رسم و رواج ہی نے سماج کی مختلف شکلیں اور اوضاع بنائی تھیں، اور ان پر مذہب و اخلاق کی عمارت کھڑی کی جاتی تھی، رومی قوانین کی تاریخ تدوین میں قانون کا اصل ماخذ رسم و رواج ہی تھے، خود اسلام سے پہلے عرب سماج کی تشکیل میں رسم و رواج کا حصہ غالب تھا، یہ الگ بات ہے کہ اب رسم و رواج کی وہ اہمیت باقی نہیں رہی جو کبھی تھی، تاہم اب بھی قوموں میں اپنے رسوم و رواج سے جذباتی وابستگی پائی جاتی ہے اور بعض مواقع پر ان سے وہ بڑا کام لیتے ہیں بلکہ اب بھی یہ بعض قوموں کی شناخت کا ذریعہ ہیں۔

سماجی زندگی کے . . . اصناف کی طرح رسوم و رواج بھی نوعیت کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں،

John Dewey Freedom and Cult p. 19, [1]

بہت سی رسوم، حالات، اتفاقات، ماحول، ملکی آب وہوا، قومی مظاہر اور بڑے ولی بزرگوں کے تعامل کی بنا پر وجود میں آتی ہیں اور ان کے تغیر و تبدل کے اثرات بھی قبول کرتی ہیں۔ لیکن کچھ رسوم ایسی ہوتی ہیں جن کا تہذیب کے داخلی عناصر سے گہرا رشتہ ہوتا ہے، وہ ان اساسی تصورات سے مربوط ہوتی ہیں جن پر تہذیب کا انحصار ہے، ان پر حالات، ماحول اور اتفاقات کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں۔

" رسوم چند اسباب کی بنا پر پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً حکماء کا ان کو مستنبط کرنا اور ان لوگوں کے دلوں میں جو نور ملکی سے موئید ہیں الہام الٰہی کا ہونا، مزید چند اسباب ہیں جن کی وجہ سے یہ رسوم لوگوں میں پھیلتی ہیں، جیسے کسی بڑے بادشاہ کے طریقہ کا رسم ہو جانا جس کے لوگ مطیع ہوں یا ان رسوم کا لوگوں کے ذاتی خیالات کے مطابق ہونا جن کو لوگ اپنی دلی شہادت سے قبول کر لیتے ہیں۔ ان کی سخت ترین پابندی کرنے کے یہی اسباب ہیں کہ ان کے ترک کرنے میں سزا ملنے یا غفلت برتنے میں فساد واقع ہونے کا تجربہ ہوتا ہے، یا عقل سلیم کے مالک حضرات ان کے ترک کرنے پر ملامت کرتے ہیں۔ وغیرہ"[1]

رسم کی تعریف : رسم کی اصطلاح کی تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ اس سے ہم رشتہ کچھ اور اصطلاحوں سے واقفیت حاصل کی جائے اس سلسلہ کی پہلی چیز عادت ہے، عادت فرد کی زندگی کا ایک رویہ ہے جو فرد کے اندر جنم لیتا ہے جب یہ رویہ متعدی ہو کر افراد کی طبیعت کا اصول بن جاتا ہے یا ان کے رویوں میں متعدی ہو جاتا ہے تو اسے رواج کہا جاتا ہے۔ رواج کو جب اجتماعی تعامل کی بنا پر قوت نافذہ حاصل ہو جاتی ہے تو رسم کہلاتی ہے۔ رسم بھی ایک طرح سے مشترک قانون (Common Law) ہوتی ہے، مگر رسم اور قانون میں بنیادی فرق یہ ہے کہ قانون پہلے تحریری شکل میں مرتب ہوتا ہے پھر اس کا نفاذ عمل میں آتا ہے جبکہ رسم پہلے نافذ ہوتی ہے اور بعد میں ضبط تحریر میں آتی ہے، اور قانون کا درجہ حاصل کرتی ہے۔ [illegible] نے رسم کی تعریف اس طرح کی ہے:

"رسم رضاکارانہ عمل کا وہ ضابطہ ہے جو کسی قومی یا قبائلی آبادی میں پروان چڑھتا ہے، رسم افراد کے طریق کار کو خواہ کتنی ہی سختی سے کیوں نہ متعین کرتی ہو فرد بہر حال اس کی پیروی کرنے اور نہ کرنے کے سلسلے میں آزاد رہتا ہے کہ وہ جسے چاہے اختیار کرے، رسم معاشرہ کے عام اجتماعی شعور میں آزادی کا (رضاکارانہ عمل) کو موخر کرتی ہے جبکہ جانوروں میں یہ عادت کے حدود سے آگے نہیں بڑھ پاتی ندرسم انسانیت

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ، باب الرسوم السائرۃ فی الناس

ادراس کی ذیلی انواع کی متعین عادات ہونے کے باوجود اپنی محرکانہ صفت کو برقرار رکھتی ہے، جس کو شعوری طور پر انسان اپنے اوپر لازم کرتا ہے، جبلت عادات کے طور پر کیے جانے والے وہ کام ہوتے ہیں جو غیر ارادی بن چکے ہوں، اور رسم عادت کے طور پر کئے جانے والے وہ کام ہوتے ہیں جو قومی اور اجتماعی بن چکے ہوں[1]

رسم اخلاق کی طرح وجدان پر قائم شدہ احکام اور ریاستی قوانین کی طرح بیرونی بندشوں سے قطعاً مختلف ہوتی ہے اگرچہ تعامل کی حیثیت سے دونوں کا امتزاج بھی جا سکتی ہے۔ اوراسی وجہ سے وہ تہذیبی زندگی کی علامت قرار پاتی ہے۔ رسموں کے سلسلہ میں ایک نقطہ نظر تو یہ ہے کہ وہ جاہلیت کی علامت ہیں، انسانی زندگی کے علمی اور ثقافتی ارتقا میں رکاوٹ ہیں اور معاشرہ کے اجتماعی شعور کو بلند ہونے سے روکتی ہیں۔ جب کہ دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ "رسوم نفس الامر میں درست ہیں کیوں کہ یہ ارتفاقات صالحہ کی محافظ ہیں اور انسان کو انہی کے ذریعہ نظری یا عملی کمال حاصل ہوتا ہے، ان کے نہ ہونے سے اکثر لوگ جانور صفت ہو جاتے ہیں"[2] اس دوسرے نقطۂ نظر کے مطابق رسوم انسانی کا اجتماعی تربیت کا ذریعہ ہیں سماجی قدروں کی محافظ ہیں اور انسان کی ترقی میں حارج نہیں بلکہ معاون ہیں۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ رسمیں ہر حال میں عوامی مصالح اور سماجی قدروں کی محافظ ہی ہوتی ہیں بسا اوقات نقصان دہ اور علمی ارتقا میں رکاوٹ بھی بن جاتی ہیں، اس کی وجہ شاہ ولی اللہ صاحب یہ بیان کرتے ہیں کہ " ان رسوم میں بُری رسمیں بھی داخل ہو جایا کرتی ہیں جن کی وجہ سے لوگوں کو اپنے اچھے طور طریقہ کی تمیز میں اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے، اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ بسا اوقات ایسے لوگ سربرآوردہ بن جاتے ہیں جن پر جزئی رائیں غالب ہو جاتی ہیں جو مصالح کلیہ سے بعید ہوتی ہیں تو وہ درندوں جیسے کام کرنے لگتے ہیں"[3]

اسلام کا نقطہ نظر: رسموں کے سلسلہ میں اسلام کا ایک خاص زاویہ نگاہ ہے اسی سے وہ ان کی خوبی و خامی کو متعین کرتا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ فرد اور معاشرہ کی تربیت کا جو نظام وہ پیش کرتا ہے اس پس منظر میں وہ رسموں کو دیکھتا ہے کہ وہ کس حد تک اس نظام سے ہم آہنگ یا اس کے مخالف ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو رسمیں انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے نقصان دہ ہیں وہ اس نظام سے کسی طرح ہم آہنگ نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ اسلام ان کو مٹا دیتا ہے اور جن رسموں میں اچھے بُرے عناصر کی آمیزش ہوتی ہے ان کو ترمیم و اضافہ کے ذریعہ

---

[1] Encyclopeadia of religion and ethics, custom

[2] حجۃ اللہ البالغہ اول ص۱۲ باب الرسوم السائرۃ فی الناس۔ [3] ایضاً

نظامِ صالح سے ہم آہنگ کر دیتا ہے اور جو بجائے خود موزوں اور مناسب ہوتی ہیں یعنی ایک صحت مند معاشرتی زندگی کی نقیب ہوتی ہیں اسلام اسے نہ صرف یہ کہ باقی رکھتا ہے بلکہ اسے ترقی عطا کرتا ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

" انبیاؑ کی بعثت اگرچہ اولاً اور بالذات وجوہ عبادات کی تعلیم کے لیے تھی لیکن اس میں بری رسموں کا مٹانا اور ارتفاقات کے قیام پر ابھارنا شامل تھا۔ یہی مطلب ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کا کہ میں مزامیر کو مٹانے کے لیے بھیجا گیا ہوں اور اس قول کا کہ میں مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں[۱]

اسی تربیت کا ایک پہلو یہ ہے کہ اسلامی شریعت کچھ ایسی ہدایتیں بھی دیتی ہے جو اگرچہ رسم ورواج کے درجہ میں نہیں ہوتیں تاہم ان پر اجتماعی تعامل سے رسم کی سی نوعیت پیدا ہو جاتی ہے، ایسی چیزوں میں بہت سے سماجی اور اجتماعی مصالح مضمر ہوتے ہیں۔ شلاً آپ یہ دیکھئے کہ جب بہت سے لوگ ایک جگہ بیٹھے ہوں اور ان کو پانی یا اس طرح کی کوئی چیز پیش کرنی ہو تو شرعی اعتبار سے ابتداء دائیں سے کرنی چاہیے اور امیر وغریب اور بڑے چھوٹے کا امتیاز نہیں کرنا چاہئے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں کینہ پرورش نہ پائے اگر اس ضابطہ کی پابندی نہ کی گئی تو شرکاءِ مجلس کے دلوں میں یہ خیال آئے گا کہ جن لوگوں سے ابتدا کی گئی ہے ان کے انتخاب کی وجہ کیا تھی۔ اس لیے دائیں سے ابتدا کرنے کا حکم دیا گیا اور دایاں اسلام میں راست روی اور خیر کی علامت ہے[۲]۔

اسلام میں رسوم ورواج کی حیثیت پر غور کرنے کا ایک دوسرا پہلو یہ ہو سکتا ہے کہ فقہا اسلام نے "عرف" کو اسلامی قانون کے ماخذ میں شمار کیا ہے اور نص صریح کے نہ ہونے کی صورت میں عرف کو بنیاد بنا کر مسائل کا استخراج اور استنباط کیا ہے۔ عرف بعض پہلوؤں سے رسم ہی کا ہم معنی ہے، عرف کی تعریف اس طرح کی گئی ہے :

العرف ما یتعارفہ الناس ویسیرون علیہ غالباً من قول او فعل والعرف والعادۃ فی لسان الشرعیین لفظان مترادفان معناھما واحد[۳]	عرف ہر اس قول وعمل کو کہتے ہیں جس سے لوگ متعارف ہوں اور اکثر وبیشتر اس پر چلتے ہوں۔ عرف اور عادت فقہا کی اصطلاح میں دو مترادف الفاظ ہیں جن کے معنی ایک ہیں۔

۱؎ حجۃ اللہ البالغہ اوّل ص۱۶۹ ۲؎ ایضاً ص۱۰۶ ۳؎ خضری بک، مصادر التشریع الاسلامی فیما لانص فیہ ص۱۴۵۔ قاہرہ

سماجی ضابطہ کی حیثیت سے رسم بھی شرعی احکام و ہدایات کے انعکاس کا ذریعہ ثابت ہوسکتی ہے کیوں کہ عرف کی اصطلاح کم و بیش رسم ہی کے معنی میں استعمال ہوتی ہے، اور رسم کی طرح عرف بھی صالح اور فاسد دونوں طرح کا ہوتا ہے۔ رسموں کی سماجی اہمیت کو تسلیم کرنے کے باوجود اسلام نے انہی رسموں کا اعتبار کیا ہے جن کی تائید شریعت اور مصالح کلیہ سے ہوتی ہو۔ خود ساختہ رسوم اگر صرف ایک سماجی ضرورت کے طور انجام پاتی ہوں تو ان کو گوارا کیا جاسکتا ہے لیکن اگر ان کو مذہبی تقدس بھی حاصل ہو تو اسلام کی نظر میں وہ بدعت شمار کی جائینگی اور ان کو مٹا دیا جائے گا۔

دوسری قوموں کی طرح مسلمانوں میں بھی اس وقت بہت سی رسمیں پائی جاتی ہیں۔ ان میں بعض عمومی نوعیت کی ہیں اور بعض خاص ہیں جو کچھ طبقات میں پائی جاتی ہیں اور کچھ میں نہیں بعض رسمیں علاقائی ہیں جو خاص خاص علاقوں اور خطوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان تمام رسموں میں وہی رسوم اسلامی تہذیب کا حصہ بن سکیں گی جن کی شریعت سے تائید ہوتی ہو ورنہ مسلمانوں نے بھی دوسری تہذیبوں سے اپنے طویل زمانی اور مکانی اختلاط و اشتراک سے بہت سی چیزیں اختیار کر لی ہیں بلکہ بعض دینی رسموں کو بھی اس طرح پیش کرنا شروع کر دیا ہے کہ ان پر غیر اسلامی رنگ غالب آگیا ہے۔ مثال کے طور پر بچے کی پیدائش، شادی اور وفات کی رسموں کو لے لیجئے۔ بچے کی پیدائش خوشی کا موقع ہوتا ہے اس فطری خوشی کی رعایت کرتے ہوئے اسلام والدین کو پانچ باتوں کی ہدایت کرتا ہے (۱) بچہ کے کان میں اذان کہی جائے (۲) اس کی تحنیک کی جائے (بڑے بزرگ سے چھوہارا چبا کر بچہ کے منہ میں ڈالا جائے) (۳) عقیقہ کیا جائے (۴) ختنہ کیا جائے (۵) اچھا نام رکھا جائے۔ مگر آج ان میں بہت سی علاقائی رسمیں شامل ہوگئیں ہیں جو بعض اوقات شرک تک لے جاتی ہیں۔ اسی طرح شادی خوشی کا دوسرا موقع ہوتا ہے۔ شریعت نے یہاں بھی سادہ سی نکاح خوانی اور ولیمہ تک بات محدود رکھی ہے مگر فضول خرچیوں، کھیل تماشوں اور غیر ضروری رسوم کی آمیزش اس میں جس طرح کر دی گئی ہے، وہ مسلم معاشرہ کے لیے ناسور بن گئی ہے۔

وفات خوشی کا نہیں بلکہ غم کا موقع ہوتا ہے، اسلام نے اپنے مزاج کی رعایت سے اس موقع پر غسل و تکفین، نماز جنازہ اور تدفین کا حکم دیا ہے، مگر اس موقع پر غموں کا غیر مناسب اظہار ہوتا ہے، چہلم اور رسم فاتحہ وغیرہ انجام پاتی ہیں، حالانکہ اسلام کے نقطۂ نظر سے اگر رسم کہی جاسکتی ہے تو صرف تکفین و تدفین اور نماز جنازہ ہے۔ ان تینوں مواقع پر غیر اسلامی رسموں کو اسلامی احکام سے ممیز کر کے ان سے دستبردار ہونے کی ضرورت ہے، ان رسموں کے علاوہ چند رسمیں ایسی بھی ہیں جو مسلمانوں میں مشترکہ طور پر پائی جاتی ہیں۔

جن میں کچھ کو دین کی سند حاصل ہے تو دوسری بدعات کے زمرے میں آتی ہیں۔ یہ رسوم عیدالفطر، عیدالاضحیٰ، شب برات، عیدمیلادالنبی و محرم سے متعلق ہیں۔

عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ جنھیں عیدین بھی کہا جاتا ہے اسلامی تہوار ہیں جو سال میں ایک ایک مرتبہ منائے جاتے ہیں۔ ان کا مقصد عیش و عشرت، لطف اندوزی اور رنگ رلیاں منانا نہیں بلکہ ان کے اندر گہری مقصدیت پوشیدہ ہے۔ اگر ان پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام نے تہواروں میں بھی تہذیب و تربیت کا ایک پہلو رکھا ہے۔ یہ عیدین مسلمانوں کی تعلیم و تربیت میں اہم رول ادا کرتی ہیں۔ ایثار و قربانی اور خود سپردگی کے جذبات ابھارتی ہیں، فلاح عام کا رجحان پیدا کرتی ہیں، رشتہ اخوت کو مضبوط کرتی ہیں، سادگی اور پاکیزگی کا سبق دیتی ہیں، بے جا اسراف اور فخر و مباہات سے روکتی ہیں، اخلاقی اصولوں کی پابندی کا سبق دیتی ہیں، تعلق باللہ کی اہمیت واضح کرتی ہیں۔ نظم و نسق کی پابندی پر زور دیتی ہیں، سلیقہ و شائستگی پیدا کرتی ہیں۔ اور فکر و عمل کو معتدل بناتی ہیں۔ اسلامی تہواروں کا مقابلہ دوسری تہذیبوں کے تہواروں سے کیجئے تو ان کی افادیت کا اندازہ ہو سکے گا کہ وہاں کس طرح تخریبی حرکات، اخلاق باختگی، غیر سنجیدگی اور عیاشی کا سبق ملتا ہے۔

عیدین اصل میں جاہلیت کے تہوار تھے جن کو اسلامی انداز میں تبدیل کیا گیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو دو دن اہل مدینہ کے لیے ایسے تھے جن میں وہ لہو و لعب میں مشغول رہتے تھے تو آپؐ نے پوچھا۔ یہ دونوں دن کیسے ہیں؟

قالوا كنا نلعب فيها فى الجاهلية فقال قد ابدلكم الله بهما خيرا منهما يوم الاضحى ويوم الفطر[۱]

حضرات صحابہؓ نے جواب دیا جاہلیت میں ہم ان دنوں میں کھیلتے کودتے تھے تو آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان کے بدلہ میں یوم اضحیٰ اور یوم فطر کے بہترین دن مقرر کئے ہیں

حضرت شاہ ولی اللہؒ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ان دونوں کو اس لیے بدلا کہ لوگوں میں کوئی دن خوشی کا نہیں ہوتا مگر اس کے پائے جانے کا سبب شعائر دین کی تعظیم یا ائمہ مذہب کی موافقت یا اسی قسم کی کوئی بات ہوتی ہے تو

---

[۱] بخاری، کتاب العیدین۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا خوف ہوا کہ اگر ان کو اسی حالت پر چھوڑ دیا گیا تو شعائر جاہلیت کی تعظیم یا ان کے اسلاف کے طریقہ کی ترویج پائی جائے گی۔ اس لیے آپ نے ان کے بدلے دو اور دن ٹھہرا دیئے کیونکہ ان میں ملت حنیفہ کے شعائر کی تعظیم پائی جاتی ہے۔[1]

شب برات: یہ رسم مسلمانوں میں بڑے پیمانہ پر منائی جاتی ہے۔ ۱۵ رشعبان کی رات کو مسلمان شب گزاری کرتے ہیں۔ نماز اور تلاوت کا اہتمام کرتے ہیں اور قبرستان جاکر اپنے مردوں کے لیے دعا مغفرت کرتے ہیں۔ اہل تشیع اس رات کی اہمیت کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ یہ حضرت ولی العصر امام مہدی کی شب پیدائش ہے اور اہل سنت والجماعت کے نزدیک اس شب کی فضیلت کی وجہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اقوال اور اعمال ہیں جو حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ شب برات اصلاً عبادت و تلاوت تسبیح و اذکار اور دعا و استغفار کی رات ہے، مگر زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ہی مسلمانوں نے دوسری قوموں کے اثر سے اس کو لہو لعب کا ذریعہ بنالیا ہے، دن کو حلوہ کھانا اور رات کو آتش بازی کرنا ہی شب برات کا مصرف رہ گیا ہے اس کے بڑے بھیانک اثرات مسلمانوں کی تہذیب و اخلاق پر پڑے ہیں بعض مواقع پر تو جانیں بھی ضائع ہو جاتی ہیں، غالباً اس بے جا اسراف لہو ولعب اور فضولیات ہی کے پیش نظر بعض علماء نے شب برات کی اہمیت کا انکار کیا ہے، اگرچہ شب برات کے نام پر کی جانے والی فضولیات کی حرمت اپنی جگہ مسلم ہے مگر شب برات کی فضیلت کا ثبوت موجود ہے۔ امام ابن تیمیہ جو بدعات کے معاملہ میں انتہائی سخت ہیں اس باب میں لکھتے ہیں کہ:

لکن الذی علیہ اکثر اہل العلم واکثرھم فی اصحابنا وغیرھم علی تفضیلھا وعلیہ یدل نص احمد لتعدد الاحادیث الواردۃ فیھا وما یصدق من الآثار السلفیۃ وقد روی بعض فضائلھا فی المسانید والسنن[3]

"اہل علم اور ہمارے اصحاب وغیرہ کی اکثریت شب برات کی فضیلت کی قائل ہے امام احمد کا منصوص مسلک بھی یہی معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ اس باب میں متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں اور سلف کے آثار سے بھی اس کی تصدیق ہوئی ہے اس کی بعض فضیلتوں کا ذکر مسانید اور سنن میں آیا ہے۔"

ذیل میں ان میں سے بعض روایات کا تذکرہ کیا جاتا ہے

---

[1] حجۃ اللہ البالغۃ جلد ۲ باب عیدین [3] اقتضاء الصراط المستقیم صد ۳۰۲ مصر ۱۳۶۹ھ

عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

يطلع الله عزوجل الى خلقه ليلة النصف من شعبان فيغفر لعباده الا اثنين كافر و قاتل نفس[1]

اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی طرف متوجہ ہوتا ہے نصف شعبان کی رات کو اور اپنے بندوں کی مغفرت کرتا ہے سوائے دو آدمیوں کے وہ کافر اور قاتل ہیں۔

مکحول کثیر بن مرہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

فى ليلة النصف من شعبان يغفر الله عزوجل لاهل الارض الا لمشرك او مشاحن[2]

نصف شعبان کی رات کو اللہ تعالیٰ تمام اہل ارض کی مغفرت کرتا ہے سوائے مشرک اور کینہ جو کے۔

معاذ بن جبل روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

يطلع الله على جميع خلقه ليلة النصف من شعبان فيغفر لجميع خلقه الا لمشرك او مشاحن[3]

نصف شعبان کی رات کو اللہ اپنی تمام مخلوق کے روبرو آتا ہے اور اپنی تمام مخلوق کو بخشتا ہے سوائے مشرک اور کینہ پرور کے۔

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک رات میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو موجود نہیں پایا تو میں آپ کی تلاش میں نکلی، آپ جنت البقیع میں تھے آپ نے مجھے دیکھکر فرمایا۔

اكنت تخافين ان يحيف الله عليك ورسوله قلت يارسول الله ظننت انك اتيت بعض نسائك فقال ان الله تبارك وتعالى ينزل ليلة النصف من شعبان الى السماء الدنيا فيغفر لاكثر من عدد شعر غنم كلب[4]

کیا تمہیں اندیشہ تھا کہ اللہ اور اس کے رسول تم پر ظلم کریں گے میں نے کہا اے اللہ کے رسول میں نے سوچا کہ آپ بعض ازواج کے پاس تشریف لائے ہوں گے آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نصف شعبان کی شب کو سماء دنیا پر آتا ہے اور قبیلہ کلب کی بھیڑوں کے بالوں سے زیادہ تعداد کے لوگوں کی مغفرت فرماتا ہے۔

اس آخری حدیث کو امام ترمذی نے ضعیف کہا ہے مگر دوسری روایات اس مفہوم کی تائید کرتی ہیں اس سے شب برات کی فضیلت ثابت ہے۔ اصول ہے کہ ایک چیز کے سلسلے میں متعدد احادیث مروی

---

[1] مسند احمد [2] رواہ البیہقی وقال ہذا مرسل جید بحوالہ ترغیب وترہیب [3] رواہ الطبرانی فی الاوسط وابن حبان فی صحیحہ والبیہقی وابن ماجہ [4] سنن ترمذی

ہیں تو فی الجملہ وہ چیز تسلیم کی جاتی ہے۔

یوم عاشورہ:- محرم الحرام کی دسویں تاریخ کو مسلمان بالعموم اور شیعہ حضرات بالخصوص یوم ماتم کی حیثیت سے مناتے ہیں۔ اس دن سینہ کوبی کی جاتی ہے، تعزیہ اٹھایا جاتا ہے، اور علی حسین کے نعرے لگائے جاتے ہیں: بعض تاریخی واقعات کی بنا پر یہ دن غیر معمولی اہمیت اختیار کر چکا ہے اس دن کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ حضرت حسینؓ نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن اپنے بہتر ۷۲ ساتھیوں کے ساتھ میدان کرب وبلا میں یزیدی فوج کا مقابلہ کیا اور حق وصداقت کی خاطر جان دیدی آپ کی شہادت کے تین سو سال بعد دسویں محرم کو یوم ماتم قرار دیا گیا اور اس کو ایک رسم کی شکل دی گئی۔ چنانچہ

"۳۵۲ھ کے شروع ہونے پر ابن بویہ معزالدولہ نے حکم دیا کہ ۱۰ محرم الحرام کو امام حسین کی شہادت کے غم میں تمام دکانیں بند کر دی جائیں اور خرید و فروخت بالکل موقوف رہے، شہر اور دیہات کی تمام آبادی ماتمی لباس پہنے علانیہ نوحہ کرے، عورتیں اپنے بال کھولے چہرے کو سیاہ کئے اور کپڑوں کو پھاڑتے ہوئے سڑکوں اور بازاروں میں مرثیہ پڑھتی منہ نوچتی، اور چھاتیاں پیٹتی ہوئی نکلیں۔"[1]

اس کے بعد یہ رسم تمام دنیا میں رائج ہوئی اہل بیت سے مسلمانوں کے جذباتی تعلق نے اس رسم کو مقبول بنانے میں مدد دی اور اب مشرق سے مغرب تک یہ رسم منائی جاتی ہے، حضرت حسینؓ کی شہادت کا اصل پیغام یہ تھا کہ فاسقوں کی اطاعت اور ظالموں کی پاسداری کرنے کے بجائے ان کے خلاف اٹھا جائے اور اپنا خون اس راستے میں بہانے سے بھی دریغ نہ کیا جائے، مگر مسلمانوں نے اس کو بھلا دیا اور رسم کو اپنا لیا۔ دسویں محرم کو یوم عاشورہ بھی کہا جاتا ہے اور اس کی ایک دینی حیثیت بھی ہے مگر وہ اس رسم سے مختلف ہے اس دن دیندار مسلمان روزہ رکھتے ہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس دن روزہ رکھتے اور مسلمانوں کو روزہ رکھنے کی تعلیم دیتے تھے، اس کی کیا وجہ تھی؟ اس سلسلہ میں کئی روایات ہیں ایک روایت حضرت عائشہؓ کی ہے وہ کہتی ہیں کہ،

کان یوم عاشوراء تصومہ قریش فی الجاھلیۃ وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصومہ فی الجاھلیۃ فلما قدم

عاشورا کے دن قریش جاہلیت کے ایام میں روزہ رکھتے تھے اور آنحضور بھی، جب آپ مدینہ آئے تب بھی روزہ رکھا اور روزہ رکھنے کا حکم دیا مگر جب رمضان کا روزہ

---

[1] تاریخ زوال ملت اسلامیہ ص ۱۰۵

المدینۃ صامہ وامربصیامہ فلما فرض رمضان ترک یوم عاشورا فمن شاء صامہ ومن شاء ترکہ[1]

فرض ہوا تو عاشورا کو چھوڑ دیا جس کا جی چاہا رکھا اور جس کا جی چاہا نہ رکھا۔

ایک روایت ابن عباسؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو یہود کو عاشورا کے دن روزہ رکھتے دیکھا آپ نے پوچھا یہ کیا ہے تو انھوں نے جواب دیا یہ ایک مبارک دن ہے۔ یہ وہ دن ہے جس دن اللہ نے بنی اسرائیل کو اپنے دشمن سے نجات دی تو اس دن موسیٰ نے روزہ رکھا، آنحضور نے فرمایا۔

انا احق بموسیٰ منکم فصامہ و امر بصیامہ[2]

میں موسیٰ کی پیروی کا تم سے زیادہ حق دار ہوں چنانچہ آپ نے روزہ رکھا اور روزہ رکھنے کا حکم دیا۔

خارجہ بن زید بن ثابت اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ عاشورا اس دن کا نام نہیں جسے لوگ عموماً کہتے ہیں بلکہ یہ وہ دن تھا جس دن کعبہ کو غلاف پہنایا جاتا تھا اور سال میں ایک مرتبہ ایسا ہوتا تھا عرب اس کے لیے فلاں یہودی کے پاس آتے تھے تاکہ وہ حساب لگا کر بتائے جب وہ مرگیا تو لوگ زید بن ثابت کے یہاں آتے اور ان سے معلوم کرتے[3]

عاشورا کے سلسلے میں یہ تین مختلف روایات ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عاشورا کی فضیلت کے اسباب باہم متضاد ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان میں تطبیق کی صورت نکالی ہے پہلی دو حدیثوں کے متعلق لکھتے ہیں۔

ولا مخالفۃ بینہ وبین حدیث عائشہ ان اھل الجاھلیۃ کانوا یصومونہ کما تقدم اذ لا مانع من توارد الفریقین علی صیامہ مع اختلاف السبب فی ذالک[4]

عائشہؓ کی روایت اور ابن عباسؓ کی روایت میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ اہل جاہلیت اس دن روزہ رکھتے تھے جیسا کہ بیان کیا گیا دونوں فریق کے اس کے دن روزہ رکھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ اگرچہ اس کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں۔

دوسری حدیث کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ:

---

[1] بخاری کتاب صیام یوم عاشورا [2] ایضاً [3] طبرانی [4] فتح الباری جلد ۴ ص ۲۴۷

"واما صیام قریش لعاشوراء فلعلهم تلقوه من الشرع السالف ولهذا كانوا يعظمونه بكسوة الكعبة وغير ذالك [1]"

قریش کے صیام عاشوراء کی وجہ یہ ہے کہ شاید انھوں نے پچھلی شریعت سے لیا ہو اسی لیے وہ خانہ کعبہ کو غلاف چڑھا کر اور دوسرے امور کے ذریعہ اس دن کی تعظیم کرتے تھے۔

مختصر طور پر عاشوراء کی فضیلت کے اسباب یہی ہیں، مگر اس دن روزہ کے علاوہ کسی اور عمل کا کوئی ثبوت نہیں ملتا چہ جائیکہ لہو ولعب اور دیگر چیزوں کی گنجائش نکالی جائے۔

میلاد النبی :- نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا جشن منانے کی رسم بھی مسلمانوں میں زمانہ سے رائج ہے، اس موقع پر مولود شریف کے نام سے ۱۲ ربیع الاول کو ہر سال جلسہ وجلوس کا اہتمام کیا جاتا ہے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات پاک ولادت تا وفات کے واقعات سنائے جاتے ہیں اور کھڑے ہوکر دست بستہ سلام پڑھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ کچھ اور بھی مراسم شامل کرلیے جاتے ہیں۔ یہ رسم اگرچہ ۱۲ ربیع الاول کی ہے لیکن دوسرے خوشی کے ایام میں مثلاً شادی کے موقع پر، مکان کی تعمیر پر اور کسی کے ایصال ثواب کے لیے بھی مجلس کا انعقاد کیا جاتا ہے عام مسلمانوں میں یہ رسم اہل تشیع کی ایک شاخ فاطمین اسماعیلیہ کے ذریعہ داخل ہوئی جس زمانہ میں فاطمین کی مصر پر حکومت تھی اس وقت عیسائی کثیر تعداد میں وہاں موجود تھے، یہ لوگ مختلف مواقع پر مذہبی مراسم بڑے دھوم دھام سے ادا کرتے تھے، اور اپنے تہواروں اور جشنوں کا اہتمام کرتے تھے، مثلاً میلاد یسوع مسیح (CHRISTMAS DAY) میلاد بتول، میلاد عذرا وغیرہ وغیرہ۔ فاطمی خلفاء ان کے میلادی جشنوں سے بہت متاثر ہوئے اور اپنے یہاں بھی انھوں نے محفل میلاد کا انعقاد شروع کردیا۔ بعض علماء نے یہی کہا کہ اہل کتاب اپنے نبی کی ولادت کا جشن مناتے ہیں پھر ہم اپنے نبی کی ولادت کا جشن کیوں نہ منائیں؟ فاطمین چونکہ حرمین پر بھی قابض تھے اس لیے وہاں بھی انھوں نے یہ بدعات شروع کردیں۔ جو ایک عرصہ تک جاری رہیں۔ مکہ اور مدینہ میں میلاد النبی کے انعقاد نے پوری دنیا میں اس رسم کو پھیلا دیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کے جذباتی تعلق نے اس رسم کو پھیلانے میں بڑی مدد دی پھر علماء حرمین شریفین کی قدر ومنزلت نے اس بدعت کو موثر بنادیا اس طرح یہ رسم عالمگیر بن گئی۔ گو کہ اس حیثیت میں اسے شریعت کی تائید حاصل نہ تھی۔ جشن میلاد النبی کو حکمرانوں اور عوام کی تائید جوں جوں حاصل ہوتی گئی اس میں رنگ رلیاں ناچ گانے، کھیل تماشے کا

---

[1] فتح الباری ج ۴ ص ۲۱۲

اضافہ ہوتا گیا۔ میلاد النبی کی رسم مختلف اسباب سے عرب ممالک میں تو کم ہو گئی مگر ایشیائی ممالک میں اس کا بدستور رواج رہا۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے منع فرمایا تھا کہ:

لا تطرونی کما اطرت النصارٰی عیسی بن مریم [1]

مجھے میرے مرتبہ سے زیادہ نہ بڑھاؤ جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم کو ان کے مرتبہ سے بڑھایا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی یاد اور آپؐ کی محبت آپؐ کی شریعت کی پیروی اور آپ کی اطاعت میں ہے نہ کہ ان کے نام پر جشن منعقد کرنے اور ان کا یوم ولادت اور وفات منانے میں یہ وقت اور دولت کا اور صلاحیت کا بے جا استعمال ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ صورت میں یہ رسمیں اسلامی تہذیب کے ساجی پہلوؤں کا تعارف نہیں کراتیں بلکہ ان پر حجاب بن جاتی ہیں اس لیے ان کو اسلامی تہذیب کا حصہ نہیں کہا جا سکتا۔

---

[1] بخاری، کتاب الانبیاء۔

الفضل ما شہدت بہ الاعداء

حضرت فاروق اعظم کی شہادت کی خبر شام پہونچی تو ایک پادری چیخ چیخ کر رونے لگا۔ اس نے عیسائیوں کو اطلاع دی کہ آج امیر المومنین شہید ہو گئے ہیں لہٰذا ہم کو بھی مسلمانوں کے ساتھ مل کر غم منانا چاہئے۔ پھر اس نے ایک پتھر پر حسب ذیل عبارت کندہ کرکے اسے گرجا گھر کے صدر دروازہ پر نصب کر دیا۔

یا عمر ماکنت والیا بل کنت والداً (اے عمرؓ تم ہمارے والی نہ تھے بلکہ والد تھے) (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ازالۃ الخفاء)

یکساں سول کوڈ ۔ تاریخ کے پس منظر میں

پروفیسر عمر حیات خاں غوری

ہندوستان میں ایک طویل عرصے سے مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کے مطالبہ کی گونج سنائی دیتی رہی ہے۔ یہاں تک کہ سپریم کورٹ میں شاہ بانو کے مقدمہ اور اس کے بعد مسلم مطلقہ بل کی منظوری نے ملک میں ایک دوسرا مسئلہ یکساں سول کوڈ کا پیدا کر دیا ہے۔ وزیر اعظم ہند نے بھی مطلع کیا ہے کہ وہ اہل ملک کے لئے یکساں سول کوڈ منظور کرا کے اسے اختیاری طور پر نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ وزیر اعظم کے اس اعلان کے بعد ملک کی اقلیتوں میں نئے سرے سے عدم تحفظ کا احساس شدت اختیار کرتا جا رہا ہے تو دوسری جانب اکثریت کے فرقہ پرست حلقہ میں خوشی کے شادیانے بجتے ہوئے سنائی دے رہے ہیں جس نے اقلیتوں میں نئے نئے شبہات کو پیدا کر دیا ہے۔

مسلمانوں سے مطالبات: حالات کے مطالعے سے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ملک میں دوسرے مطالبوں کی مانند یکساں سول کوڈ کا یہ مطالبہ بھی مسلم معاشرے کی انفرادیت کو ختم کرنے کے لئے وجود میں آ رہا ہے۔ اور شاید اسی وجہ سے ہندوستان کی مسلم اقلیت میں سب سے زیادہ اور شدید ردعمل وجود پذیر ہو رہا ہے۔ یوں تو ہندوستانی مسلمان ملک کی آزادی کے قبل ہی سے یکے بعد دیگرے مختلف مسائل سے دوچار ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ اور اس ملک میں نت نئے مطالبے ان سے کئے جاتے رہے ہیں۔ ان مطالبوں کی صدائیں کبھی ایوان حکومت سے گونجتی ہیں تو کبھی اکثریت کی فرقہ پرست قیادت کی جانب سے۔ کبھی مسلمانوں سے متحدہ قومیت قبول کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو کبھی وحدت ادیان پر ایمان لانے کو کہا جاتا ہے۔ کبھی ان سے اپنے آپ کو قومی دھارے کے حوالے کر دینے کا مطالبہ ہوتا ہے تو کبھی ملک کی وفاداری کے سرٹیفکٹ مانگے جاتے ہیں اور کبھی ان کے بھارتی کرن کا تقاضہ فضا میں گونجتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ملک کی اکثریت کو جتنی زیادہ فکر ہندوستان

یں مسلم پرسنل لا کو ختم کر کے مسلمان عورت کو آزادی سے ہمکنار کرنے کی ہے۔ اس کی عشر عشیر فکر بھی انہیں نوجوان ہندو بہنوں کو زندہ جلائے جانے سے بچانے کی نہیں ہے۔ اب وزیر اعظم نے اختیاری یکساں سول کوڈ کا مژدہ سنا کر ملک کی اکثریت کی خوشنودی حاصل کرنے اور ان کی دیرینہ آرزو پوری کرنے کا جو اعلان کر دیا ہے۔ اس سے اس طبقے میں اور بھی بوکھلاہٹ پیدا ہو چکی ہے۔ پھر یہ بات بھی محل نظر ہے کہ یہ سارے مطالبے صرف مسلمانوں ہی سے کئے جا رہے ہیں اور حکومت سے لے کر اکثریت کے قائدین تک کا روئے سخن ان مطالبوں میں مسلمانوں کی جانب ہے۔ جس کی وجہ سے یہ بات ضروری ہو جاتی ہے کہ ان مسائل پر بڑی سنجیدگی اور ٹھنڈے ذہن سے غور کیا جائے۔ اس غور و فکر کی ضرورت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ مسلمان عام طور سے ہر مسئلہ کو انفرادی مسئلہ کی حیثیت سے دیکھتے رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے انہیں یہ معلوم اور محسوس نہیں ہو پاتا کہ ان کے گرد کون سا جال بنا جا رہا ہے۔ اور وہ کس شکنجے میں کستے چلے جا رہے ہیں۔

تاریخ کا تسلسل: تاریخ کا طالب علم اچھی طرح جانتا ہے کہ دنیا میں جو واقعات و حوادث وقوع پذیر ہوتے ہیں وہ واقعات کے ایک تسلسل کی مختلف کڑیاں ہوتی ہیں اس لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ ان متواتر واقعات کا مطالعہ تاریخ کے تناظر میں کر کے دیکھا جائے کہ ان سارے واقعات کے بنیادی اسباب کیا ہیں اور ان کا اصل مقصود کیا ہے؟

وائسرائے کا مشورہ: ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے پیدا ہونے والے ان مختلف مسائل کا مطالعہ کرنے کے لئے ہمیں تحریک آزادی کے دور میں جانا پڑے گا۔ ۱۹۲۶ میں جب تحریک آزادی زوروں پر تھی۔ تحریک کے سارے قائدین قید و بند میں ڈال دئے گئے تھے اور انگریز حاکموں کو جب یہ یقین ہو چلا کہ اس ملک میں ان کے اقتدار کی زندگی آخری ہچکیاں لے رہی ہے تو انہوں نے اپنی قریب المرگ مملکت کو زندگی کی مزید چند سانسیں فراہم کرنے کے لئے لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی اپنائی۔ چنانچہ اسی زمانے میں اپنی اسی پالیسی کے تحت وائسرے نے ایک ممتاز کانگریسی لیڈر پنڈت شردھانند[1] کو جیل سے وائسرے

[1] اس وقت تک پنڈت شردھانند مسلمانوں میں بھی اتنے مقبول ہو چکے تھے کہ وہ انہیں اپنے اہم قائدین (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ہاؤس میں بلوایا اور ان سے کہا کہ انگریز اگرچہ اس بات پر آمادہ ہیں کہ اس ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں لیکن ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آخر ملک کی آزادی سے یہاں بسنے والی اکثریت کو کیا فائدہ ہوگا اس لئے کہ ہندو قوم اگرچہ اس ملک میں اکثریت میں ہے لیکن اسے حکمرانی کا کوئی علمی تجربہ حاصل نہیں ہے۔ اس کے بالمقابل اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت مسلمان ہیں جو ہزاروں سال کا تجربۂ جہاں بانی رکھتے ہیں۔ اگر موجودہ حالات میں ملک کو آزاد کر دیا جاتا ہے تو مسلمان ملک پر قابض ہو جائیں گے اور تم غلام کے غلام رہ جاؤ گے۔ اسی وجہ سے برٹش حکومت ہندوستان کو آزاد کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہی ہے۔ وائسرے کی ان باتوں سے پنڈت شردھانند نے بھی اتفاق کا اظہار کیا۔ چونکہ خلافت تحریک کے دور میں وہ مسلمانوں کی اجتماعی قوت کا مظاہرہ دیکھ چکے تھے، اس لئے انہیں بھی وائسرائے کی بات پر یقین ہو گیا اور انہوں نے خود وائسرائے سے اس سلسلے میں رہنمائی چاہی۔ چنانچہ وائسرائے نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اس بات کی کوشش کریں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی کم سے کم ہوتی چلے جائے تو دوسری جانب اس بات کی بھی کوشش کریں کہ ہندو ایک عسکری قوت بن کر ابھر سکیں۔ اس کے بغیر ملک کی اکثریت کے لئے آزادی بے معنی بن کر رہ جائے گی۔

شدھی اور سنگھٹن تحریک کا آغاز: اس گفتگو کے بعد پنڈت شردھانند کو جیل واپس بھیج دیا گیا اور چند دن بعد ان کی رہائی عمل آگئی۔ رہائی کے چند ہی دن کے اندر پنڈت شردھانند نے شدھی اور سنگھٹن تحریک کا آغاز کر دیا۔ یہ دراصل دو تحریکیں تھیں جنہیں ایک مشترکہ نام سے وجود بخشا گیا۔ شدھی تحریک کا مقصد تھا ہندوستانی مسلمانوں کو دوبارہ ہندو بنا کر شدھ (پاک) کرنا تو سنگھٹن کا مطلب تھا ہندو قوم کو عسکری قوت میں تبدیل کرنا۔ شدھی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے اس زمانے میں اس بات کو مشہور کیا گیا کہ ہندوستان کے سارے مسلمان بنیادی طور پر ہندو ہیں ان کے

پچھلے صفحہ کا بقیہ۔۔ میں شمار کرتے چنانچہ انہوں نے پنڈت جی کو جامعہ مسجد دہلی میں بلا کر مسلمانوں کو خطاب کرنے کا موقع دیا تھا۔

آبا، واجداد نے مسلم حکمرانوں کے ظلم سے بچنے کے لئے اپنا مذہب تبدیل کر لیا تھا۔ اس لئے اب جب کہ ہندوستان آزاد ہونے والا ہے۔ اور مسلم حکمرانوں کا خطرہ ختم ہو چکا ہے انہیں واپس اپنے آبائی مذہب میں لوٹ آنا چاہیئے۔ اس مطالبے میں مزید قوت پیدا کرنے کے لئے ہندو کی تعریف کو بدلا گیا اور اس بات کو پھیلانے کی کوشش کی گئی کہ ہندو کسی مذہب کا نام نہیں ہے اور نہ کسی خاص مذہب کو ماننے والا ہندو ہوتا ہے۔ بلکہ ہندوستان میں رہنے والے لوگوں کے لئے ہندو کا لفظ وضع کیا گیا ہے۔ اس لئے ہندو کا مطلب ہے ہندوستان کا باشندہ۔ اس تحریک کا مقصد غالباً ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد کو کم سے کم کرنا تھا اس لئے اس تحریک کے دوسرے حصہ سنگٹھن کے لئے اس بات کو لازمی سمجھا گیا کہ ہندو قوم کی نئی نسل کے اندر مسلم دشمنی کے جذبہ کو پوری طرح پیوست کر دیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس نوخیز نسل کے لوگوں کو جسمانی ورزش کے نام پر جمع کیا جانے لگا اور ان کی ذہنی صفائی کر کے مسلم دشمنی کے سانچوں میں ان معصوم ذہنوں کو ڈھالنے کی کوشش کی گئی تاکہ جو لوگ شدھی تحریک سے قابو نہ آئیں انہیں سنگٹھن کی قوت سے یا تو مجبور کر دیا جائے یا راستے سے ہٹا دیا جائے۔[۱]

شدھی و سنگٹھن تحریک کا پہلا ہدف:

پنڈت شردھانند نے اس کے لئے خاص طور پر اپنا ہدف میوات کو بنایا۔ جہاں کے مسلمانوں میں غربت اور جہالت پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دیوی دیوتاؤں کی منتیں مانتے تھے۔ اور ہندو تہواروں میں برابر سے شریک ہوتے تھے۔ اس لئے انہیں امید تھی کہ اس تحریک کو پوری پوری کامیابی حاصل ہو گی۔

تبلیغی جماعت کا آغاز:

یہی وہ زمانہ تھا جب دہلی میں مولانا محمد الیاس رح بقید حیات تھے۔ مسلمانوں کے دین و ایمان کے خلاف کی جانے والی اس سازش نے انہیں جھنجھوڑ کے رکھ دیا ان کی غیرت ایمانی جوش میں آئی اور اپنے چند ساتھیوں کو ساتھ لے کر میوات کے علاقے میں جانے، گھر گھر گشت کر کے مسلمانوں کو مسجد میں جمع کرنے اور ان کے کلمے

[۱] ہندوستان میں ہندو احیاء پرستی کی علمبردار تحریکوں کے لٹریچر میں یہ چیزیں آج بھی اسی طرح موجود ہیں۔ (ادارہ)

درست کرکے انہیں نماز روزے سے لگانے میں لگ گئے۔ مولانا محمد الیاسؒ کی یہی وہ ابتدائی کوششیں تھیں جسے آج تبلیغی جماعت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

پنڈت شردھانند کا قتل: ان دونوں تحریکوں کے آغاز کے بعد ہندوستانی مسلمانوں میں اضطراب و بے چینی کی ایک لہر دوڑ پڑی اور دہلی کے ایک مسلمان نے پنڈت شردھانند کو قتل کر دیا۔ پنڈت شردھانند کے اس قتل کے بعد ہی سب سے پہلے دہلی میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا۔ جس نے ۱۹۲۷ء میں ملک کے ایک بڑے حصّے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہندوستان میں یہ سب سے پہلے فرقہ وارانہ فسادات تھے۔ پنڈت شردھانند کے قتل کے بعد اس تحریک نے دم توڑ دیا تھا۔ بعد میں سنگٹھن تحریک نے راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ (R.S.S.) کی شکل میں اپنے آپ کو منظم کیا جو آج تک اس ملک میں موجود ہے۔ اور جس کے "کارنامے" ملک کی تاریخ کے ہر صفحے پر پھیلے ہوئے ہیں تو دوسری جانب شدھی تحریک مختلف شکلیں بدلتی رہی لیکن اس کی نظریں اپنے نصب العین پر ہمیشہ مرکوز رہیں اور آج بھی مرکوز ہیں۔

حکمراں گروہ کی حمایت: پنڈت شردانند کی اس تحریک کو کانگریس کے ان ہندو لیڈروں کی حمایت حاصل رہی جن کے ذہن و فکر پنڈت جی ہی کی طرح تھے یا جن کے ذہن مغربی فلسفوں کے سانچوں میں ڈھلے ہوئے تھے اور اشتراکی فلسفے پر ایمان رکھتے ہیں۔ ملک کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح عمری "میری کہانی" میں اشتراکی فلسفے کی تائید و حمایت کی ہے۔ لیکن چونکہ اشتراکیت کی اساس خدا بیزاری ہی نہیں بلکہ انکار خدا پر قائم ہے۔ اور ہندوستانیوں کا خمیر مذہب، اخلاق اور روحانیت کے عناصر سے مل کر بنا ہے۔ اس وجہ سے اس گروہ نے ہندوستان کے لئے اشتراکیت کے بجائے سوشلزم کو پسند کیا اور ملک میں سوشلسٹ سماج پیدا کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔

جہاں تک اشتراکیت اور سوشلزم کا تعلق ہے یہ دونوں نام ایک ہی سکّے کے دو پہلو ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اشتراکیت کا قیام خون کے دریا عبور کر کے کیا جاتا ہے

تو سوشلزم قانون کے ذریعہ قومیانے کی پالیسیوں پر عمل کرتے ہوئے وجود پذیر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس گروہ کو بھی شدھی وسنگٹھن کی تحریکوں پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

قوم کی مغربی تعریف: پھر یہ مغرب زدہ گروہ مغرب کی سیاسی اصطلاحوں سے واقف تھا جہاں عیسائی قوم آباد ہے۔ اور اس وجہ سے ان ممالک نے قوم کی تعریف ایک ایسے انسانی گروہ سے کی ہے جس کی زبان، ادب، تہذیب، ثقافت، عقیدہ، طرزِ زندگی، رسم و رواج اور تاریخ ایک ہی ہو اور جو کسی ایک ہی مملکت کے زیرنگیں رہتا ہو۔ لہٰذا اس گروہ نے بھی ان تحریکوں کو اپنے مقاصد کے لئے ممد و معاون سمجھ کر ان کی در پردہ تاکید شروع کر دی تاکہ اس ملک میں مغربی طرز کی قومیت وجود میں آسکے۔

تحریک کی ناکامی اور میوات کی کایا پلٹ: پنڈت شردانند کی شدھی تحریک نے اپنی کار روائیوں کا ابتدائی مرکز امت مسلمہ کے سب سے کمزور عضو یعنی میوات کے مسلمانوں کو بنایا تھا لیکن مولانا محمد الیاسؒ کی ان حکیمانہ اور دردمندانہ مساعی کی وجہ سے کوئی ایک مسلمان بھی الحاد و بے دینی کی گود میں جانے کے لئے آمادہ نہ ہوا بلکہ حالات نے کروٹ لی ہے کہ خود میوات سے علماء اور حفاظ پیدا ہونے لگے ہیں۔

مجرمانہ چشم پوشی پنڈت شردانند کے قتل کے بعد ہندوستان میں سب سے پہلی مرتبہ ہندو مسلم فسادات کا آغاز ہوا۔ جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے اور غالباً تائید و حمایت کی یہی پالیسی ہے جس کی بنا پر آج تک کسی ایک فسادی کو کوئی سزا نہیں دی جا سکی۔ جہاں تک ہندوستانی پولیس کی مہارت کا تعلق ہے تو ایسا نہیں ہے کہ وہ سورج کی روشنی میں ہونے والے قتل و غارتگری کے مجرموں تک نہ پہونچ سکے۔ جب کہ اس کی مہارت کا یہ عالم ہے کہ دہلی کے گٹر میں پائے گئے ایک عورت کے سر کے بالوں سے سراغ لگاتے ہوئے اس کے ہاتھ قاتل کی گردن تک پہونچ جاتے ہیں اور بھوپال میں ایک ڈاکٹر کے قتل کا سراغ درخت کی ایک پتی سے شروع ہوتا ہے اور کئی ماہ

بعد قاتل کی گرفتاری عمل میں آجاتی ہے۔ ایسی پولیس کی موجودگی میں کیا یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ ہندوستانی پولیس نکمی ہے اس لئے فسادیوں تک اس کے ہاتھ پہنچ نہیں نہیں پاتے۔

شدھی اور سنگٹھن کا پُنر جنم: اس کے بالمقابل چونکہ پنڈت شردانند کے قتل کے کچھ ہی عرصہ بعد سنگٹھن تحریک نے آر-ایس-ایس کے نام سے اپنے کام کا آغاز کر دیا تھا۔ اس لئے اس کی ساری کارروائیوں کی جانب سے مسلسل چشم پوشی برتی جا رہی اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ یہ تو تھا سنگٹھن کا معاملہ لیکن جہاں تک شدھی تحریک کا تعلق ہے اس نے پنڈت شردانند کے قتل کے بعد دم توڑ دیا تھا۔ اس کے بعد اس تحریک نے شاید آواگون کے فلسفے پر عمل کرتے ہوتے نئے نئے ناموں اور نئی نئی شکلوں میں جنم لیتی رہی۔

ذہنی وفکری ارتداد کا آغاز:

(۱) وحدت ادیان: عملی ارتداد کی اس ناکامی کے بعد ہندوستان میں ذہنی وفکری ارتداد کے ایک نئے سلسلے کا آغاز ہوا۔ چنانچہ ملک کی فضا میں وحدت ادیان کے فلسفے کی گونج سنائی دینے لگی۔ جس کا منشا یہ تھا کہ دنیا کے سارے مذاہب سچے ہیں سب خدا تک پہنچنے کے مختلف راستے ہیں اس لئے کسی مذہب کو کسی دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے۔ اس نئے فلسفے کا منشاء شاید یہ تھا کہ اگر اہل ملک اس فلسفے کو تسلیم کرلیں اور ملک میں پائے جانے والے سارے مذاہب اس کو سچا تسلیم کرلیں تو پھر جمہوریت کے سہارے اکثریت کے مذہب کو پورے ملک پر نافذ کرنے میں کوئی دشواری باقی نہیں رہے گی۔ اس زمانے میں ہندوستان کے مسلم دانشوراں کو اس حقیقت تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ اور مولانا مودودیؒ اس فکری ارتداد کے خلاف محاذ آرائی کے لئے میدان میں آگئے۔ انہوں نے پہلے مرحلے میں اپنی ضرب کلیمی کا ہدف ان مغربی فلسفوں کو بنایا جنہوں نے اسلامی فکر کو کمزور کر کے رکھ دیا تھا اور جن کے سہارے ہندوستان میں فکری ارتداد کی نئی کوششوں کا آغاز ہو رہا تھا۔ مولانا مودودیؒ نے اپنے بیش بہا مضامین ومقالات کے ذریعہ یہی خدمت انجام دی۔ چنانچہ ان بزرگوں کی مجاہدانہ تحریروں کے نتیجے میں

ہندوستانی مسلمانوں نے اس فلسفہ کو ٹھکرا دیا۔

۲۔ متحدہ قومیت: اس کے ساتھ ہی ۱۹۳۸ء میں ہندوستان کی ممتاز تحریک آزادی نے (راشٹریہ ایکتا) (NATIONAL INTEGRATION) کی قرارداد منظور کی اور پوری قوت کے ساتھ ملک میں اسے نافذ کرنے کا منصوبہ بنالیا گیا۔ اس نیشنل انٹیگریشن کا منشا ایک ویسی ہی قوم پیدا کرنا تھا جیسی کہ قومیں یوروپ میں ہوتی ہیں یا مغربی فلسفوں نے قوم کی جو تعریف کی ہے۔ چنانچہ اس محاذ پر بھی ہندوستان کے مسلم پریس نے شدید مخالفت کی۔ راشٹریہ ایکتا (NATIONAL INTEGRATION) کا ترجمہ اس دور میں متحدہ قومیت کیا گیا تھا جو ان الفاظ کا حقیقی ترجمہ تھا اس لئے اس نظریہ کو شدید مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ علامہ اقبال نے نظم اور نثر کے ذریعے اس کی شدید مخالفت کی۔ مولانا مودودیؒ نے مسئلہ قومیت پر مضامین کا ایک سلسلہ شروع کر دیا اور امت مسلمہ کو اس زہر سے اس حد تک واقف کرا دیا کہ اس نے اس فکری ارتداد کو صاف طور پر مسترد کر دیا۔

۳۔ قومی دھارا اور دیگر مطالبے: اس کے بعد اس تحریک نے پھر رخ بدلا اور قومی دھارے کی نئی اصطلاح کے ذریعے اس منشا کو حاصل کرنے کی کوششوں کا آغاز ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ قومی دھارے کے واعظین کا روئے سخن ہمیشہ مسلمانوں کی جانب رہا ہے۔ قومی دھارے میں آنے کا مشورہ کبھی ملک کی اکثریت کو دیا گیا نہ کسی دوسری اقلیت کو۔ اسی بات کو جب سابق جن سنگھ کے لیڈروں نے دہرانا شروع کیا تو کبھی انہوں نے مسلمانوں سے ملک کی وفاداری کے سرٹیفکٹ مانگے تو کبھی ان کی وفاداریوں کو مشکوک قرار دے دیا۔ اور بالآخر اس منشا کو حاصل کرنے کے لئے ان کے بھارتی کرن کا نعرہ لگا یا گیا۔ اصطلاحیں بدلتی رہیں۔ نئے نئے الفاظ وضع کئے جاتے رہے۔ لیکن اس پوری مدت میں اصل مقصد پر نظریں مرکوز رہیں۔ جو اس کے سوا دوسرا نہ تھا کہ مسلمانوں کو ان کے دینی و مذہبی تشخص سے یکسر محروم کر دیا جائے۔

۴۔ قومی یکجہتی: ایک طویل عرصہ کی خاموشی کے بعد ملک میں پھر راشٹریہ ایکتا یا (NATIONAL

(INTEGRATION) کے نعرے لگائے جانے لگے۔ لیکن اس بار نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس کے اردو ترجمہ کو بدل دیا گیا اور اب وہ متحدہ قومیت کے بجائے جسے ہندوستانی مسلمان ٹھکرا چکے تھے قومی یکجہتی کی شکل میں سامنے آیا۔ ان اصطلاحوں کی یہی رازداری ہے۔ جس کی بنا پر یہ مطالبہ سب کرتے ہیں لیکن مختلف لوگوں کے ذہن میں ان کے مفہوم مختلف ہیں۔ یہاں تک بسا اوقات اس اصطلاح کو فرقہ وارانہ فسادات کی لعنت کے لئے جواز تک فراہم کرنے کے ایک پردے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

قومی یکجہتی کے جارحانہ تصور کے علمبرداروں کی اس سے بڑھ کر کامیابی اور کیا ہوسکتی ہے کہ بہت سے مسلمان بھی اس ———————— کے حق میں صاف بیانات دیئے لگے ہیں۔

۵۔ قانون کا استعمال؛ ملک میں عملی ارتداد کی ناکامی کے بعد فکری و نظریاتی ارتداد کے لئے مسلسل یہ کاروائیاں کی جاتی رہی ہیں تو دوسری جانب ملک کے دستور اور اس میں بننے والے قوانین کو بھی اس مقصد کے لئے مسلسل استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ دستور ہند میں خاص ذہن کے لوگوں نے ملک میں یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کے لئے دفعہ ۴۴ کو شامل کیا تاکہ مسلم معاشرے کی انفرادیت کو ختم کردیا جائے۔ مختلف مذاہب کے ماننے والے افراد کے درمیان شادی کو فروغ دینے اور اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے اسپیشل میرج ایکٹ منظور کیا گیا۔ تاکہ شادیاں مذہب سے بے نیاز ہوکر کی جانے لگیں۔ پھر جب ملک میں تعزیرات ہند (Cr. P C) پر نظرثانی کی جانے لگی تو اس میں بھی دفعہ ۱۲۵ میں ترمیم کرکے مسلم مطلقہ عورت کو بھی تاعقد ثانی سابق شوہر سے

ملہ قومی یکجہتی کا منشا اگر یہ ہو کہ ملک کے سارے گروہ ملک کی فلاح و بہبود اور اس کی ترقی میں بھرپور تعاون دیں اور اس بات کی کوشش کریں کہ عالمی سطح پر ملک کو عزت و وقار کا مقام حاصل ہو تو یہ یکجہتی تو ملک میں پوری طرح موجود ہے۔ کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جو ان معاملات میں ہم زبان نہ ہو لیکن اگر اس کا اصل منشا ایک خاص مفہوم میں متحدہ قومیت کا قیام ہے تو بات بالکل صاف ہے۔

نان ونفقہ حاصل کرنے کا مستحق قرار دے دیا گیا۔ اس طرح ایک غیر محسوس قانونی ارتقار کے ذریعے اس بات کی کوشش کی گئی کہ ہندوستان میں نافذ مسلم پرسنل لا کو کمزور سے کمزور تر کیا جا تا رہا ہے۔ حرامی اور حلال اولاد کو یکساں قانونی مرتبہ بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

۶۔ سیاست اور تاریخ کا استعمال: ان کارروائیوں کے ساتھ ساتھ اس ملک میں فکری ارتداد کو فروغ دینے کے لئے پوری قوت کے ساتھ نصاب کی کتابوں میں قدیم ہندوستانی تہذیب کے نام سے ہندو دیومالا پر مشتمل مضامین شامل کئے جاتے رہے۔ جن کا مطالعہ کرنے کے لئے مسلمان بچے بھی مجبور تھے۔ پھر اسی کے ساتھ ساتھ درسی کتابوں میں تاریخ کو بُری طرح مسخ کرنے کی ایک مہم کا آغاز کیا گیا۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ اس ملک کے مسلمان بادشاہ ظالم اور جابر تھے۔ انہوں نے اپنے دور اقتدار میں ہندوؤں پر بے پناہ مظالم کئے ہیں ان کے مندروں کو توڑ کر مسجد بنایا ہے اور ان کی عورتوں کو زبردستی اپنے حرم میں داخل کیا ہے۔ یہاں تک کہ تاریخ کی عام کتابوں سے آگے تحریک آزادی کو بھی اس طور پر بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ ملک کی آزادی میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کیا ہے بلکہ انہوں نے ہمیشہ آزادی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کیں اور انگریزوں کے اشاروں پر ناچتے رہے۔ حد تو یہ کہ آج لال قلعہ، تاج محل، اور قطب مینار جیسی تاریخی عمارتوں کو ہندو راجاؤں کی تعمیر کردہ ثابت کرنے میں پورا زور صرف کیا جا رہا ہے۔ اور اسے تاریخی تحقیق کہا جا رہا ہے۔

۷۔ اردو زبان کے ساتھ معاندانہ رویہ: گاندھی جی اور ملک کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اگرچہ اپنی تحریروں میں اس بات کا برملا اعلان کر چکے تھے کہ آزاد ہندوستان کی سرکاری زبان ہندوستانی ہوگی جس کو اردو اور ہندی دونوں رسم الخطوں میں لکھنے کی اجازت ہوگی۔ لیکن جب ملک کے لئے قومی زبان کا مسئلہ آیا تو کانگریس کا ایک خاص گروہ اس قدر طاقتور ہو چکا تھا کہ اس نے ان دونوں کی رائے کو ٹھکرا دیا اور صرف ہندی کو دیوناگری رسم الخط میں قومی زبان کا درجہ دیا گیا۔ اس کے بعد ہر سطح پر اردو کے ساتھ معاندانہ رویہ اپنایا گیا اس کی حوصلہ شکنی کی گئی اس کی تعلیم میں رکاوٹیں

پیدا کی گئیں۔ مختلف بہانوں سے اسے نصاب میں غیر اہم قرار دیا گیا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی دو تین نسلوں کو اردو سے بے بہرہ کر کے رکھ دیا گیا۔

اردو کے ساتھ یہ معاندانہ رویہ محض اس بنا پر نہیں اپنایا گیا تھا کہ یہ ہندی کے علاوہ کوئی دوسری زبان تھی اور نہ اس لئے اپنایا گیا تھا کہ یہ مسلمانوں کی زبان تھی بلکہ اس کا بنیادی سبب صرف یہ تھا کہ یہ زبان اسلامی تہذیب و ثقافت اور اسلامی علوم و فنون کی زبان تھی۔ اور اس لئے اس زبان کے فروغ کے ساتھ اس ملک میں مسلم تہذیب و ثقافت اور اسلامی علوم و فنون کو ختم کرنا ممکن نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کو زندگی کے حق سے محروم کرنے والے لوگ خود کروڑوں روپے کی گرانٹ دے کر اردو اکیڈمیاں تشکیل دے رہے ہیں اور وہاں سے اردو ادیبوں اور مصنفوں کو انعامات اور تعاون دیا جا رہا ہے۔ یہ اس لئے نہیں کیا جا رہا ہے کہ لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو چلا ہے بلکہ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ لوگ اسلامی تہذیب کے پس منظر میں تخلیق کردہ اردو کے بجائے اردو زبان میں سیکولر اور سوشلسٹ نظریات کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ اس لئے یہ تمام اکیڈمیاں ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں میں دی گئی ہیں۔ اور وہاں سے تعاون اور ایوارڈ بھی ایسے ہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ تاکہ اردو کا مزاج اور اس کی تہذیب کو بدل دیا جائے۔

۸۔ تہذیبی تبدیلی :

تہذیبی سطح پر بھی اس ملک میں اس بات کی مسلسل کوششیں جاری ہیں کہ یہاں سے اسلامی تہذیب کی ایک ایک علامت کو ختم کر دیا جائے اور بھارتی تہذیب کے نام سے ہندوستان کی قدیم ہندو تہذیب اور ثقافت کو پوری قوت کے ساتھ روبہ عمل لایا جائے۔ اس مقصد کے لئے نصابی کتب ہندی انگریزی اور علاقائی زبانوں کے پریس، سرکاری ادارہ نشر و اشاعت، ریڈیو اور ٹی وی کو پوری قوت سے استعمال کیا جا رہا ہے۔

۹۔ مسلمانوں میں معاشی پس ماندگی پیدا کرنا :

اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں غربت و افلاس پیدا کرنے کے لئے بھی منصوبہ بند طریقے سے کام کیا گیا ہے۔ حکومت کی اعلیٰ ملازمتوں میں ان کا تناسب برائے نام ہے۔ قومی سطح پر سرکاری ملازمتوں میں وہ صرف ۲ فیصد ہیں۔ جس میں کلرک، چپراسی اور چوکیدار تک شامل ہیں۔ سرکاری ٹھیکے انہیں برائے

نام ملتے ہیں۔ سرکاری اسکیموں اور بینک قرضوں میں ان کے نام برائے نام ہی ہوتے ہیں۔ تاکہ مسلمان قوت لایموت فراہم کرنے ہی میں پریشان رہیں[1]۔ اور اسی میں ان کا پورا وقت نکل جائے۔ اور انہیں اس جانب دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملے کہ ملک میں ان کے خلاف کیا کیا سازشیں تیار کی جارہی ہیں۔ یہ تو سرکاری سطح سے ہو رہا ہے۔ لیکن اگر مسلمانوں نے تجارت، صنعت وحرفت کے ذریعہ کسی حد تک اپنی معاشی حالت کو سنبھالنے کی کوشش کی تو فرقہ وارانہ فسادات کے ذریعے ان کی دوکانوں کو لوٹ اور مکانوں میں آگ لگا کر انہیں پھر وہیں پہنچا دیا جاتا ہے۔ جہاں سے کہ انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک اسی ملک میں فرقہ وارانہ فساد کی مرکزیت انہی شہروں کو حاصل رہی ہے جہاں کہ مسلمان معاشی اعتبار سے کسی حد تک سنبھلتے جارہے تھے مثلاً کلکتہ، احمد آباد، علی گڑھ، میرٹھ، جبل پور، بھیونڈی، مالیگاؤں، جلگاؤں وغیرہ وغیرہ[2]۔ گویا کہ اس ملک میں مسلمانوں میں معاشی پس ماندگی پیدا کرنے کی ایک سوچی سمجھی سازش چل رہی ہے۔ تاکہ پیٹ کا مسئلہ انہیں دوسری کسی جانب دیکھنے کا موقع ہی نہ دے۔

(باقی)

---

[1] یہ بات جس خاص پس منظر میں کہی جارہی ہے وہ پیش نظر رہے۔ یہاں جواز عدم جواز و مسئلہ زیر بحث نہیں ہے۔ (ادارہ)

[2] گریش ماتھر نے بھی جب ملک کے فرقہ وارانہ فسادات کا تجزیہ کیا تو وہ بھی اسی نتیجہ پر پہنچے کہ یہ فسادات خالص معاشی رقابت کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے کہ تجارت اور صنعت وحرفت کو اپنانے نیز عرب ممالک میں روزگار کے مواقع پیدا ہونے کی وجہ سے جب مسلمانوں کی معاشی حالت نے سنبھالا لیا تو ہندو تاجروں میں رقابت کے جذبات بھڑک اٹھے اور انہوں نے فرقہ وارانہ فسادات میں بنیادی کردار ادا کیا اور کر رہے ہیں (دکن ہیرالڈ۔ سنڈے ایڈیشن ۲۱ ستمبر ۱۹۸۶ء)

ڈاکٹر اقبال ——— ایک الہامی شاعر

مولانا امین احسن اصلاحی۔

سوال:۔ علامہ اقبالؒ کے افکار و خیالات کو ہمارے ہاں بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ علامہ کی شاعری سے آپ کے اساتذہ بالخصوص مولانا فراہیؒ بھی متاثر تھے یا نہیں؟

جواب:۔ علامہ اقبالؒ نے جو تعلیم اپنے شعروں کے ذریعہ سے دی ہے اس کے بارے میں میرا تاثر شروع سے یہ ہے کہ وہ نہایت پاکیزہ، نہایت زندگی بخش اور نہایت ایمان پرور ہے۔ شعر کی قید میں نے اس وجہ سے لگائی ہے کہ علامہ اقبالؒ کے کچھ افکار و نظریات اُن کے خطبات کے ذریعے سے بھی ہم تک منتقل ہوئے ہیں۔ ان افکار و نظریات کے بعض حصوں کو میرے ذہن نے قبول نہیں کیا، لیکن اپنے شعروں میں ڈاکٹر صاحب نے جو درس دیئے ہیں ان کو تو میں (اِلاّ ماشاء اللہ) الہام سمجھتا ہوں۔ میں شاعروں کے الہامی ہونے کے عام خیال کو سچ پوچھئے تو محض شاعرانہ تعلّی پر محمول کرتا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب کے کلام کے مطالعہ کے بعد اس بات کا قائل ہو گیا کہ ہمارے شاعروں میں سے کوئی اور شاعر الہامی ہو یا نہ ہو لیکن ڈاکٹر اقبالؒ ضرور الہامی شاعر ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو فرمایا ہے کہ "شعر میں حکمت ہوتی ہے اور بیان میں جادو" یہ دونوں باتیں ڈاکٹر صاحب کے کلام پر صادق آتی ہیں۔

یوں مجھے دلچسپی تو غالب، حالی، شبلی، اکبر اور حسرت کے کلام سے بھی بہت رہی ہے لیکن ایمان تازہ کرنے کے لیے میں یا تو جوہر کی غزلیں پڑھتا رہا ہوں یا اقبالؒ کی نظمیں۔ مولانا حالی سے بھی مجھے بڑی عقیدت ہے لیکن ان کے مسدس سے میری قومی انا کو کچھ غذا مل جاتی ہے مگر روح تشنہ رہ جاتی ہے۔ روح کو سیرابی و آسودگی صرف ڈاکٹر صاحب کے خُمِ معرفت سے حاصل ہوتی ہے۔ مجھے ایک زمانے میں مولانا روم کی مثنوی سے بھی بڑی دلچسپی رہی۔ ڈاکٹر صاحب بھی ان کو اپنا مرشد مانتے ہیں، اور وہ ہیں بھی بجا طور پر اس منصب کے اہل لیکن جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے ڈاکٹر صاحب کی تعلیم کو اپنے ذوق، اپنی ذات، اپنی روح اور اپنے قرآنی فکر سے زیادہ ہم آہنگ و ہم رنگ پاتا ہوں۔ وہ جب فطرت و معرفت کے اسرار کھولتے ہیں تو بار بار دل میں خیال گزرتا ہے کہ یہ باتیں تو روح القدس کے فیض کے بغیر کسی کو نہیں حاصل ہو سکتیں، پھر ڈاکٹر صاحب جو معروف معنوں میں نہ کوئی صوفی تھے نہ سالک، اسرارِ معرفت کے یہ تارے کہاں سے توڑ کے لاتے ہیں؟ ؎

سِرِّ خدا کہ سالک و عارف بکس نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

لیکن یہاں یہ ظاہر کر دینا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ میں اپنے لیے ڈاکٹر صاحب کے کلام کا شارح خود ہی ہوں، ان کے نئے شارحوں اور مفسروں پر مجھے اعتماد نہیں ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ڈاکٹر صاحب حضرت حسینؓ سے زیادہ مظلوم اس دور میں قرآن کو سمجھتے تھے، اس لیے کہ اس زمانے میں وہ لوگ اس کی تفسیریں لکھ رہے ہیں، جو ان کے خیال میں اس کام کے اہل نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس دور میں علامہ اقبالؒ بھی کچھ کم مظلوم نہیں ہیں اس لیے کہ آج ان کے کلام کے نئے شارحین ان کے شعروں کو وہ وہ معانی پہنا رہے ہیں جو کبھی ان کے وہم و گمان میں بھی نہ گذرے ہوں گے۔ اگر ان کو زندگی میں یہ پتہ چل جاتا کہ لوگ ان کے شعروں پر یہ ظلم کریں گے تو شاید وہ شعر کہنے ہی سے توبہ کر لیتے۔

یہ رجحان بھی میرے نزدیک کچھ صحیح نہیں ہے کہ ایک گروہ آج پورے دین کا ڈھانچہ ڈاکٹر صاحب کے تصورات کی روشنی میں کھڑا کرنا چاہتا ہے اور ان تصورات ہی کو اس نے حق و باطل کی کسوٹی قرار دے دیا ہے یہ اندازِ فکر فرطِ عقیدت کی پیداوار ہے اور اس سے وہی مضر نتائج پیدا ہو رہے ہیں اور پیدا ہوں گے جو شخصی عقیدت کے غلو سے ہمیشہ پیدا ہوئے ہیں، اگرچہ اس عقیدت کا مرکز کتنی ہی بڑی شخصیت کیوں نہ رہی ہو۔ ڈاکٹر صاحب کا مقام بہت اونچا ہے لیکن وہ معصوم نہیں ہیں۔ ان کے کلام اور ان کے فکر کی روح اسلامی اور قرآنی ہے لیکن لغزشوں، بے اعتدالیوں اور خامیوں سے پاک نہیں ہے اس وجہ سے ان کو اور ان کے کلام کو بلند سے بلند مقام دینے کے باوجود ان کو غیر معصوم عارفین و حکماہی کے درجہ و مقام میں رکھنا چاہیے، حق و باطل کی کسوٹی قرآن اور پیغمبرؐ ہی کو ماننا چاہئے اس سے علامہ اقبال کے درجے اور ان کے کلام کے مرتبے میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ اسلام میں کسی بڑے سے بڑے آدمی کا درجہ بھی اس سے زیادہ نہیں ہے صرف پیغمبرؐ ہی کا درجہ اس سے اونچا ہے۔

میں نے جن لوگوں کے درمیان آنکھیں کھولیں اور جن کے فیضِ تعلیم و تربیت سے اکتساب کیا ان سب کو ڈاکٹر صاحب کے کلام کی عظمت کا مداح و معترف پایا۔ ان سب کا اعتراف اسی پہلو سے تھا کہ ڈاکٹر صاحب کا کلام دلوں کو گرمانے اور روحوں کو تڑپانے والا ہے۔ میرے ایک محبوب استاد نے جن کی ذہانت اور وسعتِ نظر کے ان کے اکابر تک مداح و معترف تھے میرے دل میں ڈاکٹر صاحب کی تعلیمات کی عظمت اس زمانے میں پیدا کی جب میں ان کے کلام کو اچھی طرح سمجھ بھی نہیں سکتا تھا، انہی نے مجھے حالیؔ اور اقبال کی تعلیم کا یہ فرق بتایا کہ حالیؔ کی دعوت یہ ہے کہ "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" اقبال کی دعوت یہ ہے کہ "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز"۔ میں خود فطرۃً چونکہ اسی ذہن کا آدمی ہوں اور اسلام میرے نزدیک یہی ذہن پیدا کرتا ہے۔ اس وجہ سے میں حالیؔ سے عقیدت کے باوجود شروع ہی سے اقبالی بن گیا اور اب تک اقبال ہی کے آستانۂ فکر کا مجاور ہوں۔ میرے استاد مولانا فراہیؒ شعر و سخن کا نہایت اعلیٰ مذاق رکھتے تھے۔ لیکن جس دور میں ان کی صحبت اٹھانے کا شرف مجھے حاصل ہوا ہے اس دور میں وہ دوسری تمام چیزوں سے منقطع ہو کر کلیتہً قرآن کے زاویے میں معتکف ہو چکے تھے۔ شعر و شاعری کا ذکر ان کی مجلس میں ہوتا بھی تو بات یا تو عرب شعراء تک محدود رہتی اور اگر کسی پہلو سے کچھ مزید وسعت اختیار کرتی تو مولانا روم، حافظ، سعدی سے شروع ہو کر غالبؔ پر ختم ہو جاتی۔ ڈاکٹر اقبال کے متعلق مولانا کا خیال مجھے متعین

الفاظ میں معلوم نہ ہو سکا کہ میں اس کی روایت کر سکوں۔ لیکن مولانا نے اپنی کتاب جمہرۃ البلاغۃ میں اعلیٰ کلام کے لیے جو معیار قرار دیا ہے اس پر رکھ کر کسی کو پرکھتا ہوں تو اس معیار میں اگر ہمارے شاعروں میں کسی کا کلام بتمام وکمال پورا اترتا ہے تو وہ ڈاکٹر صاحب کا کلام ہے اس لیے کہ روح اور نفسِ ناطقہ کا ترجمان حقیقی معنوں میں انہی کا کلام ہے۔ اپنے اساتذہ کے سوا ان اکابر علم و ادب کو بھی میں نے ڈاکٹر صاحب کا معترف بلکہ گرویدہ پایا جن سے میرے نیازمندانہ و خادمانہ تعلقات رہے ہیں مثلاً مولانا سلیمان ندوی مرحوم، مولانا عبدالسلام، ندوی مرحوم اور مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم۔ ان حضرات نے ڈاکٹر صاحب کی شاعری اور ان کی تعلیمات پر جو خراجِ تحسین ان کو پیش کیا ہے وہ تمام اہل علم کے سامنے ہے۔ بعض لوگوں کو میں نے ڈاکٹر صاحبؒ کا نکتہ چین بھی پایا ہے۔ لیکن صرف زبان کے حد تک۔ ان کی تعلیم و دعوت کو بحیثیت مجموعی سب ہی نے مزاجِ اسلام سے بالکل ہم آہنگ قرار دیا ہے جو لوگ ڈاکٹر صاحب کی زبان پر نکتہ چینی کرتے ہیں ان کو میں یہ جواب دیا کرتا ہوں کہ جس عالم میں پہنچ کر وہ شعر کہتے ہیں وہاں صرف معانی کا سکہ رواں ہے، الفاظ کی حکومت وہاں ختم ہو جاتی ہے۔ میرے استاد مولانا فراہیؒ زبان کو بڑی اہمیت دیتے تھے لیکن وہ بھی اس بات کے قائل تھے کہ بعض مرتبہ الفاظ شاعر کی بلند پروازی کا ساتھ نہیں دے سکتے اس وجہ سے ان کو وہ پیچھے چھوڑ جانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

(بشکریہ تدبر، لاہور، پاکستان سلسلہ نمبر ۱۸، جولائی ۱۹۸۶ء) (ترتیب: خالد مسعود)

اسلام کا تصورِ مساوات

از: سلطان احمد اصلاحی

اردو زبان میں اپنے موضوع پر پہلی مفصل کتاب جس میں 'مساوات' کے رائج الوقت تصور کی کمزوریوں اور خامیوں کی نشاندہی اس کے مآخذ کی روشنی میں کی گئی ہے۔ معاصر دنیا کے جائزہ کے ساتھ اس سلسلے میں سیکولر نظریات کی طرح دوسرے معروف مذاہب کی ناکامی کو واضح کیا گیا ہے۔ اس کے بعد انسانی سماج میں آزادی و مساوات کی آبیاری میں اسلام کے امتیازی کردار کو پوری تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ اور اس کے اخلاقی، قانونی اور تاریخی پہلوؤں پر علمی و تحقیقی انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔ آخر میں ان ممکنہ اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو اسلام کے تصورِ مساوات پر کیے جا سکتے ہیں۔ آفسٹ کی دیدہ زیب اور روشن کتابت و طباعت متوسط تقطیع صفحات ۲۴۴ قیمت ۲۰ روپے، شائع کردہ مرکزی مکتبہ اسلامی ۱۳۵۴ چتلی قبر، دہلی۔ اسلامک پبلیکیشنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ، لاہور پاکستان سے بھی یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔

تنقید وتبصرہ:

موجودہ اسلام اور مسلمان ــــ ایک جھلک۔ تجزیہ ونظریہ؛ ڈاکٹر کمال احمد آفاقی۔ ترتیب وتزئین؛ نعیم احمد۔ صفحات ۲۰۹ شائع کردہ نعیم احمد۔ اپر کلی، جھریا (دھنباد) بہار۔ آفسٹ کی عمدہ صاف ستھری کتابت وطباعت اور عمدہ کاغذ۔ بطور عطیہ بھی طلب کی جاسکتی ہے اور Rs 25/- کا تعاون پیش کرکے بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔

اس کتاب کے مصنف مرحوم ومغفور جناب ڈاکٹر کمال آفاقی جنھوں نے ۱۲ مئی سنہ ۱۹۸۴ء کو داعی اجل کو لبیک کہا ایک دردمند مسلمان تھے۔ جو اپنی مطب کی مصروفیات کے ساتھ دینی وملی مسائل کے تجزیہ وتحلیل اور اس کے لیے رائے عامہ ہموار کرنے میں برابر منہمک رہتے تھے۔ ان کا مطب ایک طرح سے مذاکرہ کی مجلس بنا رہتا تھا۔ ان مسائل پر غور وفکر میں مصنف نے پچیس تیس سال کا عرصہ گزرا۔ عمر کے آخری دس بارہ سال جبکہ وہ اپنے اصل مستقر جھریا سے کلکتہ منتقل ہوچکے تھے، وہاں انھوں نے یہ زمانہ اپنے ان خیالات کو قلمبند کرنے میں صرف کیا۔ مصنف کی اصل کتاب ضخیم اور طویل ہے۔ موجودہ اسلام اور مسلمان، الخ کی صورت میں جناب نعیم احمد صاحب نے جنھیں مصنف سے جھریا کے قیام کے زمانہ میں غیرمعمولی تعلق اور شیفتگی ہوگئی تھی، ان کے انتقال کے بعد مرحوم کے متعلقین کے تعاون سے اس پھیلی ہوئی کتاب سے چیدہ مضامین کا گلدستہ تیار کیا ہے۔ تاکہ اصل کتاب کے منظر عام پر آنے سے پہلے اہل ذوق ونظر اس کی اس خوشبو سے مشام جاں کو معطر کرسکیں۔ مصنف نے یہ کتاب کسی مالی اور دنیوی منفعت کے محرک کے بغیر خالص قومی اور ملی جذبہ کے تحت لکھی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس کاوش کو شرف قبول سے نوازے اور انھیں جنت الفردوس میں بلند ترین درجات سے نوازے۔ آمین۔

یہ کتاب کوئی باقاعدہ تصنیف یا مختلف مسائل پر سیر حاصل اور مبسوط ومفصل مضامین کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ مختلف عنوانات کے تحت چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں جن میں علمی مواد کے ساتھ مصنف کا سوز دروں اور ان کے احساسات بھی اسی طرح شامل ہیں۔ اخبارات ورسائل کے تراشے، دینی کتابوں کے اقتباسات، اہل فکر ونظر کے اقوال اور منتخب اشعار کو نقل کرتے ہوئے مصنف ان پر تبصرہ کرکے یا مختصر نوٹ لگا کر بھی ایک مضمون بنا دیتے ہیں۔ جسے آدمی مختصر وقت میں پڑھ سکتا ہے۔ کتاب کے سرورق پہ شاعر مشرق کا یہ مشہور شعر درج ہے

ملا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت ۔ ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد
اسی تسلسل میں آگے یہ اشعار پڑھنے کو ملتے ہیں:

راز کہہ دیتا ہوں کہ ہمراز ہوں دوستو! میں وقت کی آواز ہوں
برق سے کہتی ہے جگنو کی چمک تو جو دِ خاک، میں پرواز ہوں

نیز:

سالہا سال کی تلاش کے بعد زندگی کے چمن سے چھانٹے ہیں
آپ کو چاہئے تو پیش کروں میرے دامن میں چند کانٹے ہیں

اور:

دیر و حرم میں کوئی نہیں تیرے دین پر کافر نئے نئے ہیں مسلمان نئے نئے

ان اشعار سے کتاب کے رُخ اور اس کے مندرجات کے رنگ و آہنگ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مضامین کے کچھ عنوانات ہیں ا۔ سیکنڈ ہینڈ اسلام ص ۸۰ ۲۔ قوم کے رہنماؤں کی خدمت میں ص ۸۶ ۳۔ ائمہ مساجد کی خدمت میں ص ۹۱ ۴۔ یا اللہ! ہمارے مولویوں کو نیک راہ دکھا۔ ص ۱۱۱ ۵۔ مسلم لیڈر شپ کا فقدان۔ الخ ص ۱۴۲۔ ان عنوانات کے تحت جذبات کی شدت میں کہیں کہیں قلم جادۂ اعتدال سے ہٹتا نظر آتا ہے لیکن فی الجملہ مصنف کے تاثرات اور تبصرے (OBSERVATIONS) حقیقت سے خالی نہیں۔ مسلم لیڈر شپ کے سلسلے میں مصنف کے اس تاثر کی صداقت سے مشکل ہی سے انکار کیا جا سکتا ہے:

"حصول آزادی کے بعد گذشتہ ۴۲ سالوں کی (آزاد ہندوستان) کی تاریخ کا یہ المیہ نہیں ہے تو اور کیا ہے کہ اس مدت میں جو قائدین ملت بھی مسلمانوں کے درمیان آئے انھوں نے قوم و ملت کے لیے کچھ بھی نہیں کیا بلکہ قوم کے تئیں ان کی پالیسی ہمیشہ یہی رہی کہ "تم آؤ گے تو کیا لاؤ گے اور میں آؤں گا تو کیا کھلاؤ گے۔" یعنی ہمیشہ انھوں نے قوم کی تاریخ اور تقدیر کی سودے بازیاں کیں اور ہمیشہ ان کا رول کچھ ایسا ہی منافقانہ اور مفاد پرستانہ رہا کہ آج قوم کے لیے "جائے ماندن و پائے رفتن" کی گنجائش بھی باقی نہیں ہے۔ آج تک سکھوں کی طرح ایک مسلمان عہدے دار ایک ممبر پارلیمنٹ ایک اسمبلی کا ممبر یا وزارت کا عہدہ دار قوم و ملت کی خاطر اور دین و ایمان اور ضمیر کا و خودی کے واسطے اپنے عہدوں سے الگ نہ ہو سکا اور عہدے کی لالچ میں مبتلا رہا اور چند روز کے

آرام کی خاطر اس کرسی وزارت سے دست بردار نہ ہوگا اور ہر قسم کی شرم و حیا کو دھو کر پی گیا۔ اگرچہ دنیا اس کی ایسی پست ذہنیت، بے غیرتی و بے حسی پر ہنستی بھی رہی اور سخت تعجب بھی کرتی رہی مگر ہمارے قائدین ملت کا باستثنائے چندیہی حال رہا اور یہی حال ہے کہ ان کے سروں پر جوں تک نہیں رینگتی ہے اور وہ اس وقت تک اپنا الو سیدھا کرنے میں لگے رہتے ہیں جب تک انھیں انتخاب کی سیاست مہلت دیتی ہے۔ یا حیات مستعار باقی ہے" ص ۱۴۳، ۱۴۴۔ یہی معاملہ کتاب کے دوسرے مضامین کا بھی ہے جذبات واحساسات کے تلاطم میں مصنف کے یہاں ہو سکتا ہے کہیں سختی بے جا اور تنقید میں جارحیت آگئی ہو لیکن فی الجملہ ان کے خلوص اور ان مضامین کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ص ۱۴۴ ۱۴۸ پر مولانا ابوالکلام آزاد علیہ الرحمہ کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے مبالغہ آمیز ہے۔ مولانا مرحوم کی زندگی کے آخری ایام بڑی ذہنی اذیت اور کشمکش میں گذرے۔ کانگریس کے اندر فرقہ پرست ذہنیت کے لیڈروں کے رویہ سے وہ سخت دل گرفتہ اور اپنی سابقہ زندگی پر مایوسی کا شکار تھے۔ یہاں تک کہ بسا اوقات وہ وزارتی کونسل کی میٹنگوں میں شرکت سے بھی گریز کرتے تھے۔ اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ وہ اپنے دس گیارہ سالہ دور وزارت میں لوک سبھا کے سب سے کم بولنے والے ممبر رہے۔ ص ۸۳ پر "کدھر جائیں" کے عنوان کے تحت تصویر کے ذریعہ ایک مسلمان کو مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کے بیچ حیران و پریشان دکھایا گیا ہے کہ وہ کدھر جائے۔ چار جماعتوں کا نام لیا گیا ہے ۱۔ جمعیۃ العلماء ہند ۲۔ جماعت اسلامی ہند ۳۔ تبلیغی جماعت ۴۔ اور مسلم لیگ۔ ان کے سب دفتر پر ایک عقال بند سنتری کھڑا ہے اور حیران مسلمان کو آواز دے رہا ہے کہ یہاں آؤ کامیابی، بقا اور سلامتی یہاں ہے؟ ہمارے خیال میں مسلمان جماعتوں اور ان کی قیادت پر تنقید میں اس حد تک آگے بڑھنا مناسب نہیں۔ صورت حال کی یہ مبالغہ آمیز تصویر ہے جو حقیقت سے میل نہیں کھاتی۔ مسلمانوں میں قوم و ملت کا درد رکھنے والے اصحاب فکر و نظر کی یہ عام طور پر کمزوری دیکھنے میں آتی ہے کہ اکثر و بیشتر ان کی تنقیدیں اعتدال و توازن سے ہٹ کر غیرصحت مندانہ رخ اختیار کر لیتی ہیں۔ بیک جنبش قلم پوری مسلمان قیادت، مسلمان جماعتوں، مدارس اور اداروں پر سے اعتماد اٹھا دینا کوئی دینی وملی خدمت نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ اپنی تنقیدوں کو مثبت اور تعمیری رخ دے کے وسیع تر دائرے میں مسلمانوں کو دین کی بنیادوں پر منظم کرنے کا سامان کیا جائے۔ یہ کام

مخلصانہ انجام پا جائے تو انشاء اللہ مسلمانوں میں قیادت کا خلا خود بخود پُر ہو جائے اور انشاء اللہ ان کے بڑ ۹۵ فی صدی مسائل حل ہو جائیں گے۔

ان معروضات سے قطع نظر کتاب معلومات افزا اور مفید ہے۔ امید ہے کہ دین و ملت کا درد رکھنے والے لوگ بہ یہ نہیں قیمتاً اس کی پذیرائی کریں گے۔ جس سے مصنف کی اصل کاوش کے منظر عام پر آنے کا سامان ہو سکے گا۔ جناب نعیم احمد صاحب شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے بڑی سلیقہ مندی سے اس علمی گلدستہ کے افادۂ عام کا سامان کیا۔ اصل کی اشاعت کی خدمت بھی وہی زیادہ بہتر انجام دے سکتے ہیں۔ مصنف مرحوم کا ان کے اوپر یہ قرض ہے جسے انھیں ادا کرنا چاہیے۔ آخر میں ہم کتاب کے مصنف کے لیے پھر اعلیٰ علیین میں بلند درجات کی دعا کرتے ہیں۔ آمین۔ کتاب میں تصویروں کا استعمال محل نظر ہے (س)

(۴) نماز کے تقاضے۔ اس کی دعاؤں کی روشنی میں۔ محمد اسحاق خاں رام نگری۔ بار اول۔ اکتوبر ۱۹۸۶ء۔ صفحات ۴۰۔ قیمت : ۲/-۔ شائع کردہ۔ دینی کتاب گھر نیو مارکیٹ رام نگرا مغربی چمپارن۔ بہار۔

یہ کتابچہ لکھ کر مصنف نے بڑی مفید خدمت انجام دی ہے اور ایک بڑی دینی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ قرآن کی طرح نماز کو بھی بے سمجھے پڑھنے کا ہمارے ہاں جو عام رواج ہے اس کی وجہ سے عام طور سے لوگ نماز میں پڑھی جانے والی دعاؤں کے مفہوم و معنی سے واقف نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ اسی ناسمجھی کی نمازیں بالعموم پوری پوری عمریں گزر جاتی ہیں۔ مصنف نے نماز کی تمام ضروری دعاؤں کی تفہیم و تشریح سادہ اور سلیس انداز میں کردی ہے۔ آخر میں کتابوں کی ایک فہرست دی ہے جو مصنف کے خیال میں صحیح دینی شعور بیدار کرنے والی ہیں۔ ہم آل انڈیا مساجد کونسل اور مسلمانوں کے اس طرح کے دوسرے اداروں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اسے بڑے پیمانے پر مفت تقسیم کرنے کا اہتمام کریں۔ یہ رسالہ اس قابل ہے کہ تمام مساجد میں اسے مہیا کیا جائے اور ائمہ مساجد نمازیوں کو اس کی تفہیم کرائیں۔ عام مسلمانوں کو بھی اپنے گھروں اور اپنے قریبی حلقوں میں اس کا تعارف اور تفہیم کرانے کی ضرورت ہے۔ آفسٹ کی صاف ستھری طباعت اور قیمت مناسب ہے۔ (س)

ماہنامہ **زندگیِ نَو** نئی دہلی

جلد ۷ اکتوبر ۱۹۸۷ء مطابق صفر، ربیع الاول ۱۴۰۸ھ شمارہ ۴

فہرست مضامین

ادارتی امور کے لئے خط وکتابت کا پتہ: مدیر "زندگی نو" پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ترسیلِ زر وانتظامی امور کے لئے: منیجر ماہنامہ زندگی نو، ۱۵۲۵، سوئیوالان نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

● سالانہ زرتعاون -/۵۵ روپے ● (بیرون ہند) -/۲۲۵ روپے انڈین ● فی شمارہ = 5/ روپے ●

سرخ نشان، علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لئے فوری زر سالانہ ارسال فرمائیں یا اگلا شمارہ کسی اطلاع کے نہ ملنے پر بذریعہ وی۔ پی ارسال کیا جائے گا۔

پرنٹر و پبلشر محمد حبیب اللہ قادری نے دعوت ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی جانب سے جمال پرنٹنگ پریس، جامع مسجد، دہلی ۶ میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ "زندگی نو" ۱۵۲۵، سوئیوالان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔ فون: ۲۷۳۲۴۸ ★ ۲۶۵۳۱۳

اشارات:- بسم اللہ الرحمن الرحیم

جدید ہندوستان میں مسلمانوں کے مسائل

(۲)

سید جلال الدین عمری

یہ ساری کوششیں امت کے بقا اور تحفظ کی ہیں۔ یہ اس لیے ہیں تاکہ اس ملک میں مسلمانوں کا وجود باقی رہے، ان کا اثاثہ محفوظ رہے، ان پر کسی طرف سے کوئی حملہ نہ ہو، وہ معاشی، تعلیمی اور سیاسی لحاظ سے کسی گراوٹ اور پستی میں مبتلا نہ ہوں بلکہ ترقی کریں اور آگے بڑھیں۔ یہ ایک بہت ہی پاکیزہ مقصد ہے۔ اس کی اہمیت سے کوئی بھی ایسا فرد جسے ملت سے تھوڑی سی بھی ہمدردی ہو انکار نہیں کرسکتا لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے جو کوششیں کی جارہی ہیں وہ بظاہر حالات ایک طویل جدوجہد کی طالب ہیں۔ ہم نے چالیس برس کے عرصہ میں بہت تھوڑا سا راستہ طے کیا ہے اس کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ منزل بہت دور ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ کسی وقت یہ سارے مسائل حل ہو جائیں گے تو سوال یہ ہے کہ کیا کچھ اور مسائل اسی نوعیت کے یا ان سے سخت نوعیت کے پیدا نہیں ہوسکتے؟ کیا ہمارا کام صرف ان مسائل کو حل کرنا ہے۔ ان کے علاوہ کوئی دوسرا کام اس امت کے سامنے نہیں ہے؟

یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ جس امت کے بقا و تحفظ کی کوشش ہورہی ہے اس کا ایک مقصد حیات ہے۔ اسی نے اسے ایک امت بنایا ہے اور اسی میں اس کے بقا کا سامان بھی ہے۔ قوموں کو نہ تو مسائل زندہ رکھتے ہیں اور نہ وسائل۔ ان کی زندگی ان کے اعلیٰ مقاصد سے وابستہ ہوتی ہے۔ جو قوم اپنے مقصد حیات کو فراموش کر بیٹھے اس کے بقا کی ساری جدوجہد ناکام ہو جاتی ہے۔ اس لیے اصل توجہ اس پر ہونی چاہئے کہ امت اپنے مقصد حیات کو نہ بھولے بلکہ اس کی طرف پیش قدمی کی جدوجہد کرتی رہے۔ اس جدوجہد میں اس کا مرنا ہی اس کی کامیابی ہے۔

کہا جاسکتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس وقت اصل مسئلہ امت کے بقا و تحفظ کا ہے۔ دوسرے

مسائل اس کے بعد کے ہیں۔ جس شخص کی جان پر بن آئے اور جو شدید کشمکش حیات سے دوچار ہو یا فقر و فاقہ نے جس کی کمر توڑ رکھی ہو اس کے سامنے مقصد حیات کی بحث کرنا فضول ہے۔ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر اس پر غور و فکر کے لیے تیار ہی نہیں ہوگا۔

ہماری درخواست صرف یہ ہے کہ اس کے خیر خواہ اور مخلص اس کی جان بچانے کی ضرور فکر کریں اور اس کی غربت و افلاس کا علاج بھی ڈھونڈیں لیکن ساتھ ہی اس کے دین و اخلاق کی طرف بھی توجہ دیں ورنہ اس کا امکان ہے کہ صحت یاب ہونے کے بعد وہ اس زوال یافتہ معاشرہ کا ایک عام فرد ثابت ہو اور وسائل حیات فراہم ہو جانے پر تو اس کا بھی خطرہ ہے کہ وہ دوسروں سے بدتر نکلے۔ امت کا ہر فرد اس کا بڑی قیمتی طبقہ ہے۔ اس کے لیے اس کی اس طرح تربیت ہونی چاہئے کہ امت کے مقاصد کو وہ ہمیشہ پیش نظر رکھے اور کسی قیمت پر اس کے مفاد کو نقصان نہ پہونچنے دے۔

اس معاملہ میں فرد اور قوم کے درمیان فرق کرنا بھی ضروری ہے، مسائل و مشکلات ہو سکتا ہے کسی فرد کو کچل کر رکھ دیں لیکن بامقصد قوموں کو حیات تازہ عطا کرتی ہیں، حالات کی ہر چوٹ ان کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہے اور وہ زیادہ قوت کے ساتھ اپنی منزل کی طرف پیش قدمی کرتی ہیں۔ اقبال تو ہر فرد سے کہتے ہیں۔ اگر خواہی حیات اندر خطر زی۔ یہ اصول فرد سے زیادہ قوموں پر منطبق ہوتا ہے۔ بامقصد قوم کی راہ میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی۔ بلکہ رکاوٹ جتنی بڑی ہوتی ہے اتنی ہی اس کی دفاعی قوت بڑھ جاتی ہے اور وہ آگے بڑھنے کی راہیں خود بخود نکالتی چلی جاتی ہے۔ جو قوم مسائل و مشکلات میں الجھ کر اپنے مقصد حیات ہی کو بھول جائے وہ تا دیر باقی نہیں رہ سکتی۔

اس امت کا مقصد حیات کیا ہے؟ اس کا جواب خدا اور رسولؐ نے بہت واضح الفاظ میں دیا ہے۔ اسے دو دفعات میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ ایک اسلام کی طرف بازگشت اور دوسرے اسلام کی دعوت۔

اسلام کی طرف بازگشت یہ ہے کہ اسلام کی طرف، جس سے ہم بہت دور ہو چکے ہیں، پھر سے ہم پلٹ آئیں اور اس طرح پلٹ آئیں کہ اپنی پچھلی بے راہ روی کی تلافی ہو جائے، اس طرح اسے سینہ سے لگائیں اور اس طرح چمٹیں جیسے عزیز ترین متاع گم شدہ اچانک ہاتھ آگئی ہو۔ اپنی شخصیت کو بے چوں و چرا اور بالکلیہ اس کے حوالہ کر دیں۔ تاکہ اس پر اس کا اور صرف اسی کا حکم چلے۔ اپنے

معاملات کی زمام اس کے ہاتھ میں دے دیں اس کے ذرا سے اشارہ پر دوڑ پڑیں، اور جس طرف بڑھنے سے وہ منع کرے اس طرف اٹھے ہوئے قدم بھی رک جائیں۔ ہماری پوری زندگی اسی کی فرماں روائی ہو اور زندگی کا کوئی گوشہ اور کوئی پہلو اس سے آزادانہ رہنے نہ پائے۔ اس کی حکومت ہماری شخصیت پر ہو، ہمارے فکر و عمل پر ہو، ہمارے بیوی بچوں اور خاندان پر ہو، ہمارے لین دین اور کاروبار پر ہو، ہمارے اداروں اور ہماری تنظیموں پر ہو۔ غرض یہ کہ جہاں تک ہمارا بس چلے ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی میں اسلام ہی اسلام نظر آئے اور جن دائروں میں ہم اسلام قائم کرسکتے ہیں ان میں عملاً اسلام قائم ہو جائے۔ اس راہ میں جان، مال، جذبات تعلقات، جاہ و منصب رسوم و رواج ہر چیز کا نقصان برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

یہ بازگشت اسلام کو ماننے کا ایک فطری تقاضا ہے۔ اس کے بغیر اسلام کا دعویٰ کھوکھلا دعویٰ ہوگا۔ اس سے بہتر ثمرات کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ پھر اسی بازگشت کے ذریعہ امت کو ایک نقطہ پر جمع کیا جاسکتا ہے۔ امت کے اندر اسلام کا شعور جتنا زیادہ ہوگا اور ان کی زندگیوں میں وہ جس قدر نمایاں ہوگا اس کی صفوں میں اتحاد و اتفاق پیدا ہوگا۔ اور افتراق و انتشار کی ماری ہوئی یہ امت ایک نقطہ پر جمع ہو سکے گی۔ یہی اتحاد اس کے موجودہ مسائل کے حل کا قوی ترین اور موثر ترین ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ ان مسائل کے حل کی کوئی اور صورت نہیں ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ امت صرف اسلام ہی کی بنیاد پر متحد اور متفق ہو سکتی ہے۔ کسی اور بنیاد پر متحد ہونا اس کے مزاج اور فطرت کے خلاف ہے۔ اس طرح کا اتحاد وقتی طور پر پیدا ہو بھی جائے تو وہ دیرپا نہیں ثابت ہوتا اور بہت جلد ختم ہو جاتا ہے۔

یہ اسلام جسے ہماری زندگی میں پوری طرح اتر جانا چاہیے اور جس کا ہمیں عملی نمونہ بن جانا چاہیے اسی کی ہمیں دوسروں کو دعوت دینی ہے۔ اس کا مطلب وعظ و تبلیغ اور فضائل و مناقب کا بیان نہیں ہے بلکہ اسلام کو اس طرح پیش کرنا ہے کہ وہ جدید ہندوستان کے سوالوں کا جواب بن جائے آج ہندوستان گوناگوں مسائل اور مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔ آپ کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ اسلام ان مسائل و مشکلات سے اسے نکال سکتا ہے۔ انسان کی زندگی اس کے عقائد کے تابع ہوتی ہے۔ اس ملک کی اکثریت الحاد و دہریت، شرک اور اصنام پرستی اور متعدد خرافات کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام توحید خالص کا صاف ستھرا عقیدہ پیش کرتا ہے۔ یہ عقیدہ ایک طرف تو عقل و منطق کی میزان پر

پورا اترتا ہے اور انسان کے دل و دماغ کو مطمئن کرتا ہے اور دوسری طرف خدا سے اس کائنات اور انسان کے رشتہ کو واضح کرتا ہے۔ اس رشتہ کو کھولنے سے جدید اور قدیم فلسفے عاجز ہیں۔ آپ عقیدۂ توحید کو ہندوستان میں اس طرح پیش کریں کہ وہ اس کے عقائد و افکار کا بدل بن جائے۔

اسلام کے پاس عبادات کا بہترین نظام ہے جو انسان کو خدا سے اس طرح جوڑتا ہے کہ دنیا سے اس کا رشتہ نہیں ٹوٹتا، جو مادی دنیا میں پھنسے ہوئے انسان کو روحانی سکون فراہم کرتا ہے اور پاکیزہ روح انسان کو امور دنیا کے قابل بناتا ہے۔

یہ ملک سیاسی، سماجی، تہذیبی اور لسانی لحاظ سے افتراق کی طرف بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے ایک طبقہ دوسرے طبقہ سے شاکی اور ایک حصہ دوسرے حصے سے برسرپیکار ہے۔ دل پھٹ چکے ہیں، منافرت اور تعصب کی آگ ہر طرف بھڑک رہی ہے۔ ان حالات میں بظاہر اس ملک کو متحد اور ایک وحدت بنائے رکھنے والی کوئی طاقت نہیں ہے۔ البتہ اسلام اس ملک کو جوڑنے والی طاقت بن سکتا ہے۔ وہ یہ تصور دیتا ہے کہ سارے انسان رنگ، نسل اور زبان کے اختلاف کے باوجود ایک خدا کے بندے اور ایک آدم کی اولاد ہیں۔ سب کی نجات اسی ایک خدا کی عبادت اور بندگی میں ہے۔ آپ کو ثابت کرنا ہوگا کہ اسی تصور کے ذریعہ ملک کو اختلاف اور انتشار سے بچایا جا سکتا ہے اور اس کے اتحاد کو باقی رکھنا ممکن ہے۔

ہندوستان نے سیاست میں مغرب کے جمہوری نظام کو اختیار کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دور کے انسان کی رسائی یہیں تک ہو سکی ہے۔ اس سے آگے وہ سوچ نہیں سکا ہے۔ لیکن انسانی فکر کبھی لغزشوں سے پاک نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس کا سوچا ہوا جمہوری نظام بھی خوبیوں کے ساتھ اپنے اندر بہت سی خامیاں بھی رکھتا ہے۔ ان خامیوں کا اعتراف خود مغربی مفکرین کو ہے لیکن اس کا کوئی بدل ان کے پاس نہیں ہے۔ ان ہی خامیوں کی وجہ سے علامہ اقبال نے کہا۔

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

اسلام جمہوریت کو اللہ تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ کا پابند بناتا ہے اور فرد اور ریاست دونوں کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ٹھہراتا ہے۔ یہ تصور ان خرابیوں سے پاک ہے جو موجودہ جمہوریت میں پائی جاتی ہیں۔ آپ کا فرض اور ملک کی بہی خواہی کا تقاضا ہے کہ آپ ہر سطح اور ہر موڑ پر اس کی بھرپور وکالت کریں اور اس کی حقانیت کا ثبوت فراہم کریں۔

ہندوستان نے معاشی میدان میں سوشلزم کی راہ اختیار کی ہے۔ اس کے ساتھ وہ سرمایہ دار نظام سے اپنا رشتہ توڑنا بھی نہیں چاہتا۔ اس بحث سے قطع نظر اپنی ساری کوششوں کے باوجود اس کے معاشی مسائل حل نہیں کر سکتے ہیں آپ کو بتانا ہوگا کہ سوشلزم اور سرمایہ داری کے مقابلہ میں اسلام معیشت کی بہترین بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ اس کو اختیار کرکے انسان اس راہ کی ناہمواریوں سے بچ سکتا ہے اور چین و سکون سے انسان کی بنیادی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح موجودہ قانون کے مقابلہ میں اسلامی قانون کی اور موجودہ ضابطہ اخلاق کے مقابلہ میں اسلام کے ضابطہ اخلاق کی غرض زندگی کے ہر گوشہ میں اسلام کی برتری ثابت کرنا آپ کا فرض ہے۔

اس طرح آپ اسلام کو ایک متبادل نظام کی حیثیت میں ہندوستان کے سامنے پیش کر سکیں گے اور یہ ثابت کر سکیں گے کہ آپ کے پاس وہ دولت ہے جو ہندوستان کی کسی قوم کے پاس نہیں ہے۔ پھر ایک وقت آئے گا کہ ہندوستان یہ سوچنے پر مجبور ہوگا کہ آپ کا مقام قیادت اور رہنمائی کا ہے آپ اس سے اپنے حقوق کے طالب ہی نہیں ہیں بلکہ زندگی کے ہر میدان میں اسے کچھ دینے کی بھی پوزیشن میں ہیں۔ اس سے آپ کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوگی۔ عظمت اور برتری آپ کے ساتھ چلے گی۔ آپ برابر کی سطح سے بلکہ اونچی سطح سے بات کر سکیں گے۔ یہ ملک آپ کو قائد اور رہنما کی حیثیت سے دیکھے گا اور آپ، اللہ نے چاہا تو اس کے محسن اور نجات دہندہ ثابت ہوں گے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ اس طرح کی جد و جہد شروع ہوتے ہی اس ملک میں امت کے موجودہ مسائل ختم ہو جائیں گے۔ اس وقت بھی مسائل ہوں گے، موجودہ مسائل سے زیادہ ہوں گے اور شدید تر ہوں گے آپ کی دعوت کو چیلنج کیا جائے گا، اعتراضات کی بوچھاڑ ہوگی، آپ کی چھوٹی بڑی ایک ایک کوتاہی زیر بحث آئے گی اور رکاوٹ بنے گی، آپ پر مسلمانوں کی حکومت قائم کرنے کا الزام عائد ہوگا۔ آپ پر سختیاں ہوں گی، حتیٰ کہ دار و رسن ہوگا۔ لیکن اسی میں اسلام کے ساتھ آپ کے تعلق اور خلوص کا امتحان بھی ہوگا اور اسی سے امید ہے بدگمانیاں دور ہوں گی اور اسلام کے فروغ کی راہیں کھلیں گی۔ دعا ہے کہ ہم اس امتحان میں کامیاب ہوں۔

مقالات:

قرآن میں الوسیلہ کا مفہوم

مولانا محمد سلیمان قاسمی

تحریف ایک لفظی ہوتی ہے اور ایک معنوی ہوتی ہے یہودیوں اور عیسائیوں نے اللہ کی کتابوں، توریت اور انجیل کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا اور جس کے نتیجہ میں ان پر اللہ کا غضب لوٹا اور وہ گمراہ قرار دیئے گئے وہ دونوں قسم کا تھا انھوں نے لفظی اور معنوی دونوں قسم کی تحریفیں کیں۔ دونوں طرح سے کتاب اللہ میں ترمیم کی اور دونوں طرح سے اس کا حلیہ بگاڑا۔

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهِ يَقُولُونَ إِنْ أُوتِيتُمْ هَٰذَا فَخُذُوهُ وَإِنْ لَمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوا (المائدہ: ۴۱)

کتاب اللہ کے الفاظ کو ان کا صحیح محل متعین ہونے کے باوجود اصل معنی سے پھیرتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر تمہیں یہ حکم دیا جائے تو مانو اور اگر نہیں تو نہ مانو (یعنی جو مطلب ہم بتا رہے ہیں یہی بتائیں تو مان لو ورنہ محمدؐ اگر دوسرا مطلب بتائیں تو مت مانو)

مگر قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی ہے اس لیے اس میں تحریف لفظی یا ایسی تحریف معنوی کہ صحیح مفہوم مراد لینے والے صحیح مفہوم سمجھنے، سمجھانے والے اور اسے اجاگر کرنے والے مفقود ہو جائیں، ناممکن ہے۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝

(قرآن مجید) ہم ہی نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کے دونوں ذرائع شروع ہی سے پیدا فرمائے حفظاً اور تحریراً۔ دونوں طرح قرآن مجید ہمیشہ سے اور ہمیشہ کے لیے محفوظ کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم پر جس قدر قرآن مجید نازل ہوتا تھا آپؐ اسی وقت اسے لکھوا دیتے تھے آپؐ اسے خود بھی حفظ فرما لیتے تھے اور صحابہ کرامؓ بھی حفظ کر لیا کرتے تھے اور حضورؐ کے مبارک زمانہ سے آج تک قرآن کی حفاظت کے یہ دونوں طریقے قائم اور دائم اور رائج ہیں اور انشاء اللہ قیامت تک اس کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اس انتظام اور اہتمام کے باوجود قرآن میں معنوی تحریفات کا سلسلہ جاری ہے مگر ساتھ ہی جب بھی کوئی تحریف معنوی کسی طرف سے رونما ہوئی ہے ہمیشہ علماء کرام اور فقہاء عظام اس کے تدارک کے لیے میدان میں آئے ہیں حتی کہ اس تحریف معنوی کا تدارک ہو گیا۔ تحریف معنوی کی ایک مثال بعض حلقوں میں وسیلہ کا تصور ہے۔

لفظ وسیلہ قرآن کی مندرجہ ذیل آیت سے ماخوذ ہے[1]:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ	اے ایمان لانے والو اللہ سے ڈرو، اور
وَابْتَغُوْا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ وَ	اس کی جناب میں باریابی کا ذریعہ تلاش کرو، اور
جَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ لَعَلَّكُمْ	اس کی راہ میں جدوجہد کرو شاید کہ تمہیں کامیابی
تُفْلِحُوْنَ (المائدہ، آیت ۳۵)	حاصل ہو جائے۔

اس آیت پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ایک مختصر نوٹ لکھا ہے۔

"یعنی ہر اس ذریعہ کے طالب اور جویاں رہو جس سے تم اللہ کا تقرب حاصل کر سکو اور اس کی رضا کو پہونچ سکو (تفہیم القرآن اول ص۴۶۶)

امام نسفیؒ "الوسیلہ" کی وضاحت کرتے ہیں۔

ھی کلّ ما یتوسل بہ ای	(وسیلہ لغت میں) ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے
یتقرب من قرابۃ او صنیعۃ	توسل اور تقرب حاصل کیا جائے رشتہ داری یا عمل وغیرہ
او غیر ذلک فاستعیر لما	پھر یہ لفظ عاریۃً لے لیا گیا ان چیزوں کے لیے جن سے
یتوسل بہ الی اللہ من فعل الطاعات	اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کیا جائے یعنی اطاعتیں اور
و ترک السیئات۔ (تفسیر مدارک التنزیل ص۲۱۱)	گناہوں کو چھوڑنا۔

مفسر الصابونی لکھتے ہیں،

ای خافوا عقابہ واطلبوا ما	یعنی ڈرو اس کے عذاب سے اور طلب کرو وہ کام
یقربکم الیہ من طاعتہ وعبادتہ	یا چیزیں جو تمہیں اس سے قریب کر دیں یعنی اس کی اطاعت

[1] لفظ الوسیلہ سورۃ اسراء کی آیت ۵۷ میں بھی آیا ہے جسے ہم آگے ذکر کریں گے۔

قَالَ قَتَادَۃُ تقربوا الیہ بطاعتہ اور عبادت. قتادۃ نے کہا اس کی اطاعت اور اس
وَالعَمَلِ بِمَا یرضیہٖ (صفوۃ التفاسیر ۳۱۹) کو راضی کرنے والے عمل کے ذریعہ اس کا تقرب حاصل کرو۔
مفسر ابن کثیرؒ لکھتے ہیں :۔ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو اپنے تقویٰ کا حکم دیتا ہے
اور لفظ تقویٰ جب طاعت کے ساتھ متصل ہو تو اس سے مراد حرام سے بچنا اور ممنوعات کا چھوڑنا
ہوتا ہے. اس کے بعد فرمایا " وَابتغوا الیہ الوسیلۃ" ابن عباسؓ نے کہا یعنی قربت
(تقرب) اور قتادہ نے کہا اس کا تقرب حاصل کرو اس کی اطاعت کے ذریعہ اور ایسے عمل
کے ذریعہ جس سے وہ راضی ہوتا ہے اور وسیلہ وہ چیز ہے جو مقصود حاصل ہونے کا ذریعہ ہو
اور وسیلہ جنت کے اعلیٰ مقام کا نام بھی ہے اور وہ مرتبہ و مقام ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کا ۔ اور آپؐ کا مکان ہے جنت میں، جو جنت کے مکانوں میں عرش سے سب سے زیادہ
قریب ہے ۔ صحیح بخاری میں ہے کہ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا، فرمایا رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نے اذان سننے کے بعد کہا " اے اللہ اس کامل دعوت
اور قائم نماز کے رب عطا فرما محمدؐ کو وسیلہ اور فضیلت اور ان کو مقام محمود میں پہنچا جس کا تو نے
ان سے وعدہ فرمایا ہے " تو اس کے لیے قیامت کے دن میری شفاعت حلال ہو جائے گی۔
ایک دوسری حدیث صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا جب تم موذن
سے اذان سنو تو وہی الفاظ کہتے جاؤ جو موذن کہے پھر میرے اوپر درود بھیجو تو جس شخص نے
مجھ پر ایک بار درود بھیجا اللہ تعالیٰ اس پر دس بار درود بھیجتا ہے پھر میرے لیے وسیلہ طلب
کرو کیونکہ وہ جنت میں ایک مرتبہ ہے جو اللہ کے بندوں میں سے صرف ایک بندہ کو ملے گا
اور میں توقع رکھتا ہوں کہ وہ بندہ میں ہوں، تو جس نے میرے لیے وسیلہ طلب کیا اس کے لیے میری
شفاعت حلال ہو گئی۔ ایک اور حدیث ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
جب میرے اوپر درود بھیجو تو میرے لیے وسیلہ مانگو، عرض کیا گیا یا رسول اللہ وسیلہ کیا ہے فرمایا جنت
میں سب سے اعلیٰ مقام ہے۔ وہ صرف ایک آدمی کو حاصل ہوگا اور میں توقع رکھتا ہوں کہ وہ آدمی میں ہوں۔
(ایک اور حدیث) ابن عباسؓ سے روایت ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ میرے لیے وسیلہ
مانگو کیونکہ جو شخص بھی دنیا میں میرے لیے وسیلہ کی دعا کرے گا میں اس کے لیے قیامت میں گواہ اور
سفارشی بنوں گا۔ (مختصر تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۵۱۳، ۵۱۴)

اس سلسلہ میں دوسری آیت ملاحظہ فرمایئے :-

أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ۔
(بنی اسرائیل آیت ۵۷)

جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ خود اپنے رب کے حضور رسائی حاصل کرنے کا وسیلہ تلاش کر رہے ہیں کہ کون اس سے قریب تر ہو جائے اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے خائف ہیں۔

مولانا مودودیؒ اس پر نوٹ لکھتے ہیں، یہ الفاظ خود گواہی دے رہے ہیں کہ مشرکین کے جن معبودوں اور فریادرسوں کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے ان سے مراد پتھر کے بت نہیں ہیں بلکہ یا تو فرشتے ہیں یا گذرے ہوئے زمانہ کے برگزیدہ انسان مطلب صاف صاف یہ ہے کہ انبیاؤں یا اولیاء یا فرشتے کسی میں بھی یہ طاقت نہیں ہے کہ تمہاری دعائیں سنے اور تمہاری مدد کو پہونچے تم حاجت روائی کے لیے ان کو وسیلہ بنا رہے ہو اور ان کا حال یہ ہے کہ وہ خود اللہ کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے خائف ہیں اور اس کا زیادہ سے زیادہ تقرب حاصل کرنے کے وسائل ڈھونڈ رہے ہیں۔ تفہیم القرآن (دوم صفحہ ۶۲۵)

امام نسفیؒ لکھتے ہیں :-

وکانہ قیل یحرصون ایھم یکون اقرب الی اللہ وذالک بالطاعۃ وازدیاد الخیر ویرجون رحمتہ ویخافون عذابہ کغیرھم من عباد اللہ فکیف یزعمون انھم الھۃ (تفسیر مدارک التنزیل صفحہ ۲۷۴)

تو گویا کہ کہا گیا وہ حرص کرتے ہیں کہ وہ اللہ کا زیادہ سے زیادہ تقرب حاصل کرلیں اور یہ اس کی اطاعت اور بھلائی کے زیادہ سے زیادہ کام کر کے ہی ہو سکتا ہے اور وہ اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں جیسے دوسرے اللہ کے بندے ڈرتے ہیں پھر وہ ان کو معبود کس طرح ٹھہراتے ہیں۔

الصابونی لکھتے ہیں :

ای اُولٰئک الالھۃ الذین یدعونھم من دون اللہ ھُم انفسھم یبتغون القرب الی اللہ ویتوسلون الیہ بالطاعۃ والعبادۃ فکیف تعبدونھم معہ ویرجون

یعنی وہ معبود (فرشتے یا بزرگ انسان) جن کو وہ اللہ کے علاوہ پکارتے ہیں وہ خود اللہ کا تقرب تلاش کرتے اور چاہتے ہیں اطاعت اور عبادت کے ذریعہ۔ پھر کیسے تم ان کی عبادت اللہ کے ساتھ کرتے ہو؟ اور وہ اللہ کی رحمت کی توقع رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں یعنی اس

رحمتہٗ ویخافون عذابہٗ ای یرجون بعبادتہٖ رحمتہٗ تعالیٰ، ویخافون عقابہٗ و یتسابقون الیٰ رضاہٗ (صفوۃ التفاسیر ص۱۷۴)

کی عبادت کے ذریعہ اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں اور اس کی رضا کے لیے مسابقت کرتے ہیں۔

ابن کثیرؒ لکھتے ہیں: ابن عباسؓ نے کہا اہل شرک کہتے تھے ہم فرشتوں، مسیح اور عزیر کی عبادت کرتے ہیں اور یہی ہیں وہ لوگ جن کو وہ معبود سمجھ کر پکارتے ہیں یعنی فرشتے، مسیح، اور عزیر۔ اور بخاریؒ نے عبداللہ بن مسعودؓ سے " اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ" کے بارے میں روایت بیان کی ہے کہ جنات میں سے کچھ (غیراللہ کی) عبادت کرتے تھے وہ اسلام لے آئے اور ایک روایت میں ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنات کے کچھ لوگوں کی عبادت کرتے تھے تو جنات نے اسلام قبول کرلیا۔ اور ان لوگوں نے ان کا دین اختیار کرلیا۔ اور قتادہؒ نے ابن مسعودؓ سے روایت بیان کی ہے۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ کے بارے میں کہ عرب کے کچھ لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جو جنات کے کچھ لوگوں کی عبادت کرتے تھے تو جنات نے اسلام قبول کرلیا اور انسان جو ان کی عبادت کرتے تھے ان کو ان جنات کے اسلام قبول کرنے کا علم نہیں تھا تو یہ آیت اتری۔ اور ابن مسعودؓ سے ایک روایت ہے کہ وہ فرشتوں کی ایک قسم ہے جن کو جنات کہا جاتا ہے ان کی عبادت کرتے تھے تو ان کا ذکر قرآن نے کیا ہے اور ابن عباسؓ نے کہا وہ عیسیٰ، عزیر اور شمس و قمر ہیں۔ مجاہدؒ نے کہا وہ عیسیٰ عزیر اور فرشتے ہیں۔ یبتغون الیٰ ربّھم الوسیلہ کے سلسلہ میں ابن جریرؒ نے ابن مسعودؓ کے قول کو پسند کیا ہے کہ یہ انداز بیان ماضی کا نہیں ہے اس لیے اس میں عیسیٰ عزیر اور فرشتے داخل نہیں ہوسکتے، اور وسیلہ قربت کو کہتے ہیں اسی لیے کہا ایّھم اقرب۔ (مختصر تفسیر ابن کثیرؒ)

غرض کہ جن لوگوں کی وہ عبادت کرتے تھے اس سے یہاں پتھر مراد نہیں ہیں بلکہ جاندار مخلوق ہی مراد ہے اسی لیے کہا گیا کہ وہ تو خود تقرب بارگاہ الٰہی اور وسیلہ کی تلاش میں رہتے ہیں تم ان کو وسیلہ اور ذریعہ تقرب کیسے بناتے ہو؟

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی المایدہ کی آیت ۳۵ پر لکھتے ہیں: تقویٰ کا مفہوم ہم مختلف مقامات میں ظاہر کرچکے ہیں کہ خدا کے حدود و احکام کی پوری مستعدی کے ساتھ

نگہداشت اور ان کی خلاف ورزی کے نتائج سے ڈرتے رہنا ہے۔" وابتغوا الیہ الوسیلہ" وسیلہ کے معنیٰ قربت کے ہیں اور الیہ کی تقدیم سے حصر کا مضمون پیدا ہوگیا ہے یعنی خدا ہی کا تقرب ڈھونڈو جس کا طریقہ یہ ہے کہ خدا کے احکام و حدود کی پوری پوری پابندی کرو! اور ان کی خلاف ورزی کے نتائج سے ڈرتے رہو خدا اور بندوں کے درمیان واسطہ اور وسیلہ جیسا کہ آیت واعتصموا بحبل اللہ (الآیہ) کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں کتاب اللہ اور شریعت ہی ہے اس وجہ سے کتاب اللہ اور شریعت کو مضبوطی سے تھامنا ہی خدا سے قربت کا واسطہ ہے۔ گویا آیت میں تنبیہ ہے کہ جن لوگوں نے خدا اور اس کی شریعت سے بے پرواہ ہوکر دوسروں کا تقرب ڈھونڈا اور ان کو اپنی نجات و فلاح کا ضامن سمجھے بیٹھے ہیں وہ بڑی غلط امیدوں اور بڑے ہی غلط سہاروں پر جی رہے ہیں۔ فوز و فلاح کی راہ یہ ہے کہ خدا ہی سے ڈرو اور اسی کا تقرب ڈھونڈو۔ قرآن میں دوسری جگہ اس بات کی تصریح ہے کہ فرشتے جن کو نادانوں نے خدا کی قربت کا ذریعہ سمجھ کر معبود بنایا ہے وہ خود ہر لحہ خدا کے قرب کے لیے ساعی و سرگرم اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّہِمُ الْوَسِیْلَۃَ اَیُّہُمْ اَقْرَبُ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَہٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَہٗ اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ کَانَ مَحْذُوْرًا ۝	وہ لوگ جن کو مشرکین پکارتے ہیں خود اپنے رب کے قرب کے حصول کے لیے ساعی رہتے ہیں کہ کون زیادہ سے زیادہ قرب حاصل کرتا ہے اور اس کی رحمت کی امید کرتے اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں بے شک تیرے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے۔
(سورہ اسراء آیت ۵۷)	(تدبر قرآن جلد دوم صفحہ ۲۸۲)

مولانا اشرف علی تھانویؒ ذیل کی آیت کی تفسیر کرتے ہیں:

یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ فِیْ سَبِیْلِہٖ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝	اے ایمان والو، اللہ تعالیٰ (کے احکام کی مخالفت) سے ڈرو (یعنی معاصی چھوڑ دو) اور (طاعات کے ذریعہ سے) خدا تعالیٰ کا قرب ڈھونڈو

(یعنی طاعات ضروریہ کے پابند رہو) اور (طاعات میں سے بالخصوص) اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا کرو امید ہے کہ اس طریقے سے) تم (پورے کامیاب ہو جاؤ گے (کامیابی اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنا اور دوزخ سے نجات ہے) ربط۔ اوپر طاعات کا امر اور معاصی سے نہیں ہے طاعات

ہیں سب سے بڑا عمل ایمان اور معاصی میں سب سے بدتر عمل کفر ہے، سو گویا اوپر عام عنوان میں انکا امر و نہی بھی آگیا لیکن اہتمام شان کے لیے آگے بالتخصیص کفر کا ضرر بتلاتے ہیں جس سے ایمان کا نفع بھی خود معلوم ہو جاویگا۔ اور اہتمام شان کی وجہ ظاہر ہے کہ سب سے اعظم ہے اور تبلیغ انبیاء میں سب سے مقدم و نیز مجموعہ آیتین سے یہ ثابت کرنا ہے کہ اصل وسیلہ طاعات ہیں بلا طاعات تمام دنیا بھر کے خزائن بھی وسیلہ نہیں بن سکتے۔ (تفسیر بیان القرآن جلد ۳ صفحہ ۲۷)

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی سورۂ بنی اسرائیل کی مذکورہ آیت ۵۷ کی تفسیر بیان کرتے ہیں :۔ یہ لوگ کہ جن کو مشرکین (جلب منفعت یا دفع مضرت کے لیے) پکار رہے ہیں وہ خود ہی اپنے رب کی طرف پہونچنے کا) ذریعہ ڈھونڈ رہے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرب بنتا ہے (یعنی خود ہی طاعت و عبادت میں مشغول ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کا قرب میسر آجاوے اور چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ قرب ہو جاوے) اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے (درصورت نافرمانی کے) ڈرتے ہیں (اور) واقعی معبود کیونکر ہوں گے اور جب وہ خود ہی منفعت یعنی رحمت میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں اوروں کو کیا منفعت دے سکتے ہیں اسی طرح جب وہ خود مضرت یعنی عذاب سے بچنے میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں تو اوروں سے مضرت کو کیا دفع کر سکتے ہیں۔ پھر آپ کا معبود و معین ہونا محض باطل ہوگا۔

وسیلہ سے متعلق مذکورہ دونوں آیات کی تفسیر مندرجہ ذیل تفسیروں سے آپ کے سامنے آئی۔

۱۔ تفسیر ابن کثیر۔ از امام حافظ عماد الدین ابو الفداء اسماعیل ابن کثیر دمشقی المتوفی ۷۷۴ھ

۲۔ تفسیر صفوۃ التفاسیر از علامہ محمد علی الصابونی استاذ کلیۃ الشریعہ و درسات الاسلامیہ جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ،

۳۔ تفسیر مدارک التنزیل و حقایق التاویل از علامہ عبداللہ بن احمد بن محمود النسفی الحنفی رح

۴۔ تفسیر مکمل بیان القرآن از مولانا اشرف علی صاحب تھانوی

۵۔ تفسیر تفہیم القرآن از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

۶۔ تفسیر تدبر قرآن از مولانا امین احسن صاحب اصلاحی مدظلہ

اور اس سے معلوم ہوا کہ وسیلہ سے اعمال صالحہ۔ اعمال خیر۔ طاعات اور عبادات مراد ہیں کہ ان چیزوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ چنانچہ مشہور تابعی

ماہر قرآن حضرت قتادہ فرماتے ہیں اس سے تقرب بارگاہ الٰہی مراد ہے۔ (اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تقرب اس کے احکام پر چلنے اور اس کی معصیت سے بچنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے) نظم کلام پر غور کرنے سے بھی رہنمائی حاصل ہوتی ہے ؛ کہ وسیلہ سے اعمال خیر او امر و احکام پر چلنا نواہی اور ممنوعات سے بچنا اور اجتناب کرنا ہی مراد ہے کیونکہ اللہ کے تقرب کا ذریعہ تلاش کرو سے پہلے فرمایا: اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، اس کے حکموں پر چلو اس نے جن کاموں سے روکا ہے ان سے رک جاؤ۔ اور اس کے بعد فرمایا :۔ اس کے راستہ میں جدوجہد اور جان توڑ کر کوشش کرو! اس طرح بتا دیا کہ وسیلہ یہی تقویٰ اور جہاد ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی جو احادیث امام ابن کثیرؒ نے نقل فرمائی ہیں اور جو حضرت جابرؓ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابن عباسؓ جیسے بزرگ صحابہ کرام سے منقول ہیں ان سے معلوم ہوا کہ الوسیلہ جنت کا سب سے بلند مقام ہے اور اس کی حضورؐ کے لیے اذان کے بعد دعا کرنا چاہیئے کہ محمدؐ کو الوسیلہ عطا فرما۔

اصل میں مشرکین فرشتوں بزرگ انسانوں اور جنات کو معبود بناتے تھے ان سے کہا گیا صرف اللہ کا تقرب تلاش کرو اور اس تقرب کے لیے اس کی اطاعت اور بندگی اور عبادت کو وسیلہ بناو ! مذکورہ تفسیروں سے یہ بھی ثابت ہوا کہ انبیاء اولیاء عظامؒ اور بزرگان دینؒ کو وسیلہ بنانا مندرجہ ذیل بزرگوں میں سے کسی نے بھی مراد نہیں لیا ہے۔

۱. حضرت عبداللہ ابن عباسؓ ۲. حضرت مجاہدؒ ۳. حضرت قتادہؒ ۔ ۴. حضرت ابوہریرہؓ ۵. حضرت جابر بن عبداللہؓ ۵. حضرت ابن مسعودؓ ۷. امام بخاریؒ ۷. امام مسلمؒ ۔ ۹. ابن کثیرؒ ۱۰. امام نسفیؒ ۱۱. علامہ صابونی ۱۲. مولانا تھانویؒ ۱۳. مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ ۱۴. مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ المایدہ کی آیت ۳۵ سے بزرگان دین اور اولیاء اللہ کو اللہ کے تقرب کا وسیلہ بنانا جو لوگ مراد لیتے ہیں وہ درحقیقت قرآن مجید میں تحریف معنوی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے تمام بھائیوں کو توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العٰلمین

راہ وفا میں جب رہ رہ کر پاؤں کے نیچے کانٹے آئے
کتنے ہی ارباب عزیمت ساتھ مرا دیکھ پچھتائے
کوئی ذرا ان سے یہ پوچھو راہ وفا کی آساں کب تھی
اہل عزیمت کی راہوں میں دنیا نے کب پھول بچھائے

مولانا عامر عثمانیؒ

اسلام کا نظریۂ تعلیم

جناب محمد جیب الدین احمد

قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں اور خصوصیت کے ساتھ ملت اسلامیہ کی چودہ سو سالہ تاریخ شاہد ہے کہ اس کی ملی خصوصیات اور دین و ثقافت کی بقا کے لیے قانون و آیئن اور حقوق کی دفعات کبھی ضمانت نہیں بن سکیں۔ قومیں اپنے عقائد و روایات اور ملی خصوصیات کے لیے اپنے عزم و ارادہ، ایثار و قربانی اور قوت عمل کی بنیاد پر زندہ رہتی ہیں۔ خصوصاً مسلمانوں کی زندگی تو دین کے لیے ہمیشہ خدا پر بھروسہ، ایثار و قربانی اور آرام و آسائش کو تج دینے پر منحصر رہی ہے اور آج بھی یہی چیزیں ملت اسلامیہ کو ایک غیرت مند اور با حوصلہ قوم اور ملک کے با عزت شہریوں کی حیثیت سے زندہ رکھ سکتی ہیں۔ آج زمانہ کے اس نازک موڑ پر ہمارے ایمان، عزم و ہمت اور قوت عمل کی آزمائش ہے۔ اور اگر ہم اس آزمائش میں پورے اترتے ہیں تو ہماری آئندہ نسلیں محفوظ اور ان کا مستقبل روشن بن سکتا ہے۔ لیکن اگر بے حسی اور غفلت شعاری کا یہی حال رہا یا صرف ستم ہائے روزگار کا ماتم اور حق تلفیوں کا شکوہ کرتے رہے تو مستقبل کا مورخ یہ لکھنے پر مجبور ہو گا کہ یہ وہ قوم تھی جس نے اپنی موت کے پروانے پر اپنی دستخط ثبت کی اور اپنے ہی ہاتھوں اپنی نسلوں کی تباہی کا باعث بنی۔

آج ملت اسلامیہ میں ذہنی غلامی اور بے عملی کے نتیجے میں فکری اور عملی اعتبار سے تین قسم کے گروہ پیدا ہو گئے ہیں جو ایک دوسرے کے متضاد نظریات کے حامل ہیں۔ پہلا گروہ دین و مذہب کا دل دادہ ہے لیکن اسلام کی وہ انقلابی روح ان میں مفقود ہے جس نے حقیقتاً مسلمانوں کو مسلمان بنایا تھا۔ یہ گروہ دین کی فروعات میں بے حد الجھا ہوا ہے اور دین کے مہمات امور سے غافل ہے۔ دین و دنیا کی غلط تقسیم کی ابتدا بھی دراصل اسی گروہ کی پیداوار ہے جس کے نتیجے کے طور پر ان کی سعی و جہد کے محور اندھیری کوٹھریاں اور مدرسے کی دیواریں رہ گئی ہیں۔

دوسرا گروہ جو اس وقت مسلمانوں میں بڑھتا اور پھیلتا جا رہا ہے، وہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جنھوں نے آج تک اپنے آبائی دین کا نہ مطالعہ کیا اور نہ ہی سنجیدگی سے اس بات کی کوشش کی کہ جس دین کا قلادہ ان کی گردنوں میں پڑا ہوا ہے وہ ان سے کیا چاہتا ہے۔ دین کے ظاہری مناسک عبادات میں یہ اپنے لیے کوئی کشش نہیں پاتے۔ چنانچہ بڑی حد تک یہ گروہ اپنے مذہب سے برگشتہ ہے اور ان کی برگشتگی کی ذمہ داری بڑی حد تک ان تعلیم گاہوں پر جاتی ہے جہاں سے انھوں نے دین کا علم مغربی ناقدین کے ذریعہ سے حاصل کیا اور ان ناقدین نے اسلام کی جس طور پر ترجمانی کی ہے وہ صاف ظاہر کرتی ہے کہ ان کے نزدیک اسلام اس قابل نہیں کہ وہ موجودہ عمرانی نظریات کا مقابلہ کر سکے۔ اس طرز تعلیم نے ان میں اپنے دین کے تعلق سے احساس کمتری اور مرعوبیت کو جنم دیا ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کے معاملات کی باگ ڈور زیادہ تر ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں میں ہے اور وہ امت مسلمہ کی گاڑی کو الحاد و فسق و فجور کے راستے پر سرپٹ لیے جا رہے ہیں۔ تیسرا گروہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو مذکورہ بالا دونوں گروہوں کی کوتاہیوں اور غلط رہنمائی کے نتائج کا شکار ہے۔ یہ گروہ تخلیقی فکر سے عاری اور مقلدانہ ذہن سے سوچنے کا عادی ہے۔ ان میں مرکزیت اور ڈسپلن کا فقدان ہے اور مسائل حاضرہ کا جائزہ لینے اور ان سے پنجہ آزمائی کا حوصلہ ختم ہو گیا ہے جس کی وجہ سے یہ مایوسی، اضمحلال اور پراگندگی کا شکار ہیں۔ چنانچہ وہ بڑے بڑے علماء و صاحبان سیاست جن کی طرف ملت بڑی ہی امید کے ساتھ نظریں جمائے ہوئے ہے ابھی تک حالات کی سنگینی کا کما حقہٗ اندازہ نہیں کر سکے ہیں اور خود کو کسی عظیم مقصد کے لیے تیار ہی کر سکے ہیں۔ اگرچہ چند مخلص حضرات کچھ کر بھی رہے ہیں تو اجتماعی روح کی کمی اور سمت سفر کے غلط تعین سے کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ لیکن چند ایسے دردمند انسان جو صورت حال کا صحیح شعور رکھتے ہیں اور موجودہ نامساعد حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ رکھتے ہیں ان صاحبان سیاست اور حاملین شریعت کو اس طرف متوجہ کریں، ان کو دعوت فکر و عمل دین اور ان کے صحیح مقام اور ذمہ داریوں کا احساس دلائیں تو اس بات کا یقین ہے کہ یہ حضرات امت میں سرگرمی عمل پیدا کریں گے۔ خلوص سے دی ہوئی صدا انشاء اللہ صدا بصحرا ثابت نہیں ہوگی۔

اگر آج ہمارے ملک میں پائی جانے والی تعلیم گاہیں اور ان میں تربیت پانے والے

طلبار کا فکری لحاظ سے جائزہ لیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طلبار کے اندر پائی جاتے والی موجودہ اخلاقی خرابیاں ان کی زندگی کے کسی ایک گوشہ میں نہیں بلکہ پوری زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہیں آج ہمارے طلبار بہ حیثیت مجموعی ایک شدید فکری اور ذہنی انتشار سے دوچار ہیں آزادی کے بعد سے اب تک کوئی قابل لحاظ کوشش اس بات کی نہیں کی گئی ہے کہ نوجوان نسل کے لیے تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کیا جائے جس سے ان کے اندر بنیادی اخلاقی صفات پیدا ہوں اور وہ ملک کے ایک بار دار شہری بن سکیں۔

یہ فکری انتشار اور کج روی دراصل نتیجہ ہے کسی واضح مقصد زندگی سے خالی الذہن ہونے کا اور یہ ذہن اس نظام تعلیم کا پیدا کردہ ہے جس کا خمیر ہی بے مقصدیت سے اٹھایا گیا ہے۔ اس بے مقصدیت اور فکری انتشار کے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں وہ ہماری ملی زندگی کے ہر گوشے میں موجود ہیں۔ بے مقصدیت جو ذہنی خلا پر کرتی ہے اس کے اثرات طلبار میں اخلاقی دیوالیہ پن، تعلیم سے عدم دلچسپی اور تخریب پسندی جیسے مکروہ مشاغل کی مختلف صورتوں میں واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ فطرت کہیں بھی خلا کو پسند نہیں کرتی اور انسان کی فکری زندگی میں تو خلا کا وقوع بالکل ہی ناممکن ہے۔ اگر انسانی ذہن میں اچھے اور نیک خیالات نہ ہوں گے تو وہ خالی نہیں رہے گا بلکہ برے اور گندے خیالات ان کی جگہ پر کر دیں گے۔ یہ اخلاقی خرابیاں طلبار کی انفرادی زندگی میں ہی نہیں بلکہ اجتماعی طور پر ان کی تنظیموں میں بھی پوری طرح موجود ہیں جو وقتاً فوقتاً ان میں بنتی رہتی ہیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے انتخابات میں جو ہتھکنڈے امیدوار طلبار عام طور پر استعمال کرتے ہیں وہ اس اخلاقی فساد کی کھلی ہوئی علامت ہے جو ہمارے قومی معاشرے سے متعدی ہو کر تعلیمی اداروں میں سرعت سے پھیل رہا ہے۔ ملکی سیاست میں جس طرح دھونس دھاندلی اور ظلم و زیادتی کے آزادانہ استعمال کے شاہکار سامنے آتے ہیں ان کا پورا عکس ان مستقبل کے شہریوں کی درس گاہوں میں بھی نظر آئے گا۔ طلبار کی ایک بڑی اکثریت کو کوئی نہ کوئی مشغلہ درکار ہے۔ جو نغمۂ شادی میں نہ ملے تو نوحۂ غم میں ہی سہی۔ انھیں بہر حال ایک ہنگامہ ضرور چاہیے۔ ہپی ازم اور ٹیڈی ازم ہماری سوسائٹی کے لیے لعنت بن چکے ہیں۔ یہ وبا لٹریچر اور فلموں کے ذریعہ ہمارے ملک میں آئی اور والدین و اساتذہ کی عدم توجہی کی بنا پر تیزی سے پھیلتی جا رہی ہے۔

جہاں ایک طرف مخلوط اور مادہ پرستانہ بے مقصد تعلیم ان تمام خرابیوں کا باعث بنی ہے تو دوسری طرف مختلف سیاسی تنظیموں اور انتہا پسند عناصر کی سرگرمیاں اس فکری انتشار کو اور بھی بڑھاوا دینے کا باعث بنی ہیں۔ پھر دوسرا سبب عوام کی وہ بے حسی ہے جو اس تمام اخلاقی فساد کو دیکھتے ہوئے بھی ان کی زبانوں کو گنگ رکھتی ہے اور ان کی طرف سے اس صورت حال کے خاتمہ کا مطالبہ نہیں ہوتا۔ جب تک یہ محرکات باقی رہیں گے کوئی تعلیمی و اخلاقی اصلاح کی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے طلبا عوام اور حکومت ان تینوں کا تعاون ازبس ضروری ہے۔ ملک کی سیاسی جماعتیں خواہ وہ صاحب اقتدار ہوں یا نہ ہوں اپنے سیاسی عزائم کی تکمیل میں طلباء کو آلہ کار بناتی ہیں۔ ان جماعتوں کو طلبا کا بہ حیثیت شہری اپنے کچھ رجحانات رکھنا کوئی بری بات نہیں لیکن عملی سیاست میں ان خود غرض سیاسی بازی گروں کا آلہ کار بننا قطعی نامناسب ہے۔ یہ امر نہایت ہی افسوس ناک ہے کہ طلبا بھی ان ہی سیاسی جماعتوں اور ان کے طریقہ کار سے متاثر ہوکر اپنے مطالبات کو منوانے اور دیگر سرگرمیوں میں ہڑتالیں، دھرنا، گھیراؤ اور متشددانہ کاروائیاں اختیار کرتے ہیں۔ طلبا یونین ایک نہایت ہی اہم ادارہ ہے اور اسے طلبا میں مفید کام انجام دینا چاہیے۔ لیکن آج طلباء یونین کو ٹریڈ یونین کے طور پر ہڑتالوں کے لیے استعمال کیا جانے لگا ہے۔ لیکن بظاہر ان مایوس کن حالات اور ناامیدی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں الحمدللہ چند تعلیمی ادارے ایسے بھی ہیں جو ٹمٹماتے ہوئے دیوں کی طرح تاریکی کا سینہ چیرتے ہوئے ماحول کو منور کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ ان درس گاہوں سے وابستہ طلبا کی ایک بڑی تعداد اسلام کو شعوری طور پر اپنی زندگیوں کے نصب العین کی حیثیت سے پسند کرچکی ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جو اپنی مختلف تنظیموں اور تحریکوں کے ذریعہ دوسرے ساتھی طلبا میں بے حسی، بے راہ روی اور فکری انتشار دور کرنے اور ان میں مقصد زندگی کا شعور پیدا کرنے کے سلسلے میں سرگرم عمل ہے اور یہ ایک صالح معاشرہ وجود میں لانا چاہتا ہے۔

۱۔ اسلامی نظریۂ تعلیم:۔

اسلامی نقطۂ نظر سے انسانیت نے اپنے سفر کا آغاز تاریکی و جہالت سے نہیں بلکہ علم و روشنی سے کیا ہے۔ تخلیق آدم کے بعد خالق کائنات نے انسان اول کو سب سے پہلے جس چیز سے سرفراز فرمایا وہ علم اشیاء رہا ہے۔ اور علم ہی وہ قوت ہے جس کی بنا پر کائنات کی دوسری تمام مخلوقات پر انسانیت کو فوقیت حاصل ہے۔

علم کا تصور یہ ہے کہ اس کا حقیقی سرچشمہ رب السمٰوات والارض کی ذات ہے۔ حقیقت اشیاء کا علم بھی اور ہدایت وضلالت کا علم بھی اسی کا دیا ہوا ہے۔ حواس اور عقل وتجربہ بڑے اہم ذرائع علم ہیں لیکن وحی سب سے اعلیٰ سرچشمۂ علم ہے۔ نیز یہ کہ علم کا تعلق لوازمات حیات ہی سے نہیں بلکہ مقاصد حیات سے بھی ہے اور یہی زیادہ اہم ہے۔ اس سے اسلامی تعلیم کا جو مزاج تشکیل پاتا ہے وہ یہ کہ اس میں غلبہ دین کی تعلیم، رب کی معرفت اور الہامی ہدایات کی روشنی میں فرد اور تمدن کی صورت گری کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ علم اشیاء کی تعلیم سے انسان کے دنیاوی سفر کے آغاز سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی اولین ضرورت علم ہے اور انسان کو انسان بنانے والی چیز تعلیم ہے۔ اس لحاظ سے قرآن حکیم تعلیمات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپ کی قائم کردہ روایات کی روشنی میں علم اور تعلیم کے جو مقاصد متعین ہوتے ہیں وہ حسب ذیل حقائق پر مبنی ہیں

۱۔ خدا کی ذات و صفات کی حقیقی معرفت علم کے بغیر ناممکن ہے اور جب تک حقیقی معرفت حاصل نہ ہو تقویٰ اور پرہیزگاری کی زندگی نہیں حاصل ہوسکتی۔ اللہ تعالیٰ کے وہ بندے جو علم کی دولت سے مالامال ہیں وہی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء اللہ سے وہی بندے ڈرتے ہیں جن کو علم کی دولت میسر ہے۔ وہ شخص جسے دین کا صحیح علم حاصل نہ ہو وہ شریعت کے اوامر و نواہی اور احکام سے نابلد رہ جائے گا۔ اور دنیا میں ضلالت و گمراہی کا شکار ہو کر آخرت میں ناکامی و نامرادی سے دوچار ہوگا۔ اس کے برعکس وہ شخص جو دین کا علم رکھتا ہے دنیا میں ہدایت یافتہ اور آخرت میں فائز المرام ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں طرح کے لوگ خدا کی نگاہ میں یکساں مقام حاصل نہیں کرسکتے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

قل ھل یستوی الذین یعلمون — کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ لوگ

والذین لا یعلمون ہ — جو علم نہیں رکھتے مساوی ہیں۔

اسی لیے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "حصول علم مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے" "اور علم حاصل کرو کیونکہ جس نے خدا کی راہ میں علم حاصل کیا اس نے (بلاشبہ ایک عظیم) نیکی کی جس نے علم کی بات کی اس نے خدا کی حمد و ثنا کی، جس نے علم کی جستجو کی اس نے خدا کی عبادت کی، جس نے اس سے ہدایت پائی اسے گویا ایک عظیم نعمت مل گئی اور جس نے اسے دوسروں تک پہنچایا اس نے گویا اپنے آپ کو خدا کے لیے وقف کردیا"

حضورؐ نے ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

"صاحبان علم اور مجاہدین مقام نبوت سے قریب ترین ہیں کہ صاحبانِ علم بھی لوگوں کو ان ہی تصورات ومقاصد کی ترغیب دیتے رہتے ہیں جن کے لیے انبیاء مبعوث کیے گئے اور مجاہد بھی اسی مقصد کے لیے اپنی تلوار اٹھاتا ہے۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسا مشن ہے جس کے لیے انبیاء معبوث کیے گئے۔ ایک ایسا مشن جو صاحبان علم اوران علمی اداروں کو انجام دینا ہے۔ قرآن حکیم کے مطابق یہ مشن اسلام کے پیغام کی اشاعت وتبلیغ اور ایک عادلانہ اور صحتمند اجتماعی نظام کا قیام ہے۔ قرآن کہتا ہے :

"وہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول خود ان ہی میں سے اٹھایا جو انھیں اس کی آیات سناتا ہے، ان کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے" (۶۲:۲)

اور

"لا ریب ہم نے پیغمبروں کو عیاں شواہد کے ساتھ بھیجا اوران کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ سیدھے رہیں انصاف پر"

پس اسلامی تہذیب وثقافت کے پس منظر میں تعلیم کا بنیادی مقصد ان پیغمبرانہ وائف کی بجا آوری، انسانوں کو مذہب اسلام کی تعلیم دینا، ان میں مذہب کی سچی روح پیدا کرنا اور انھیں ایک مکمل زندگی کے لیے تیار کرنا ہے۔ چنانچہ اسلامی نظام تعلیم کی چند بنیادی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

اسلام نے تعلیم کو انسان کی بہت سی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت نہیں بلکہ اولین اور بنیادی ضرورت قرار دیاہے اور علم کی طلب کو مسلمانوں کا فریضہ حیات قرار دیتا ہے۔ جس چیز کی طلب کو اسلام مسلمانوں کا فرض کہتا ہے اس کے حصول کی ذمہ داری بھی فرد اور معاشرہ دونوں پر عاید کرتا ہے۔ اسلام کا یہ اصول ہے کہ جو چیز ملت پر فرض ہو اس کی فراہمی کی اولین ذمہ داری فرد پر اور آخری ذمہ داری معاشرے اور ریاست پر عاید کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کا قیام اسلامی ریاست کے وظایف میں شامل ہے۔ تعلیم کے سلسلے میں خود حضورؐ نے جو روایت قائم کی وہ اصحاب صفہ کی درس گاہ میں نظر آتی ہے۔ اصحاب صفہ میں سے کچھ

اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے خود ہی تگ و دو کرتے تھے۔ پھر مسلمانوں کے اہل ثروت ان کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے دل کھول کر عطیات و وظایف دیتے تھے اور حضورؐ خود بھی ان کی ضرورتیں پوری فرماتے تھے۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں تعلیم مفت رہی ہے چنانچہ آج کا یہ "مفت اور لازمی تعلیم" کا نظریہ UNIVERSAL FREE AND COMPULSORY EDUCATION کوئی نیا نظریہ نہیں بلکہ اسلام کا ہی عطا کردہ ہے۔

مسلمانوں کے نظام تعلیم میں علم اور تربیت ہمیشہ ساتھ ساتھ رہے ہیں اور یہ بھی حضور اکرمؐ کے تتبع میں ہی تھا کہ بہ حیثیت معلم جہاں آپ تعلیم کتاب و حکمت کی ذمہ داریاں ادا فرماتے وہیں تزکیہ نفوس کا کام بھی انجام دیتے۔ مسلمانوں کے تعلیمی نظام کا مخصوص مزاج ان دونوں عناصر کے حسین امتزاج سے تشکیل پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود عرف عام میں اس مزاج کا اظہار علم و فضل کی اصطلاح سے ہوا ہے جو علم اور نیکی میں بڑے ہوئے ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔

ایک اور اہم خصوصیت تعلیم اور مسجد کا باہمی تعلق ہے۔ تعلیم کا دینی مزاج اس بات کا متقضی تھا کہ دینی زندگی کے محور، مسجد سے اس کو مربوط کیا جائے۔ مسجد نبوی میں پہلی تعلیم گاہ کے قیام نے اس روایت کو قائم کیا اور بعد میں مسلمانوں کی پوری تاریخ میں اس روایت کو فروغ دیا گیا اور اس کے ذریعہ طلبا رکی زندگیاں اسلام کے مخصوص ثقافتی نظام کے سانچے میں ڈھلتی گئیں۔

متذکرہ بالا تصورات سے خود بخود یہ بات نکلتی ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے تعلیم و تربیت کا مقصد فرد کو اللہ تعالیٰ کا صالح بندہ بنانا اور ایک صالح معاشرہ وجود میں لانا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تعلیم طلبا میں ان کے مذہب اور نظریہ حیات کو فروغ اور آگہی دے انھیں اپنی زندگی کے مفہوم و مقصد اور دنیا میں ان کی حیثیت سے واقف کرائے۔ توحید رسالت، آخرت، انفرادی و اجتماعی زندگی پر ان کے اثرات، اسلامی ثقافت کی نوعیت اور ان کے مقصد حیات کو واضح کرنے اور اس کی تکمیل اور عمل آوری کے لیے اس کو تیار کرے۔

تعلیم ایک قوم کی ثقافت کا جزو لاینفک ہے اور یہی وہ ذریعہ ہے جس سے ثقافت

خود کو قائم رکھتی ہے تعلیم و ثقافت کا تعلق چولی دامن کا سا ہے۔ ہر قوم اور ہر ملت کا ایک خاص مزاج اور اس کی کچھ قومی روایات اور تہذیبی خصوصیات ہوتی ہیں جن پر ان کے انفرادی وجود اور امتیازی حیثیت کا دار و مدار ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ان خصوصیات سے دست بردار ہونا نہیں چاہتی کیونکہ جس قوم اور جس ملت کے پاس زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو یا اس کا اپنے نصب العین پر یقین کمزور پڑ گیا ہو تو وہ بہ حیثیت قوم زندہ رہنے اور اپنے امتیازی تشخص کو باقی رکھنے کی طاقت کھو بیٹھتی ہے اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ وہ اپنے وجود کو فنا کرکے دوسری قوموں میں ضم ہو جائے۔ لہٰذا ان خصوصیات کے تحفظ و بقا کا واحد ذریعہ قوموں کے مزاج و روایات کے مطابق ان کی تعلیم ہے۔ یہ غلط فہمی عام ہے کہ کوئی قوم کسی نقصان کے بغیر کسی بھی ملک و قوم کے نظام و تعلیم کو اپنا سکتی ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جب تک کوئی قوم اپنی ثقافت کو ٹھکرا نہ دے جو قومی خودکشی کے ہم معنی ہے اس وقت تک اغیار کے نظام ہائے تعلیم سے مکمل استفادہ نہیں کر سکتی۔

جن قوموں کا تصور تعلیم خالص مادی ہے وہ بھی اپنے نظام تعلیم میں ان خصوصیات کے تحفظ کا اہتمام کرتی ہیں۔ چنانچہ یورپ کی قومیں جن کا مذہب اور کلچر قریب قریب یکساں ہے اپنی خصوصیات مٹا کر ایک دوسرے میں ضم ہو جانا گوارا نہیں کرتیں چنانچہ ان کے مادی تصور تیاعت اور تہذیب و ثقافت کی یکسانی کے باوجود ان کی قومی روایات کے مطابق ان کا نظام تعلیم ایک دوسرے سے جدا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام ایک تہذیب، ایک مکمل دین اور مستقل ضابطہ حیات ہے۔ اسلام حیات و کائنات سے متعلق ایک مخصوص نقطۂ نظر کا حامل ہے۔ اقدار حیات و خیر و شر کے اس کے اپنے معیارات اور مستقل پیمانے ہیں۔ اس کے اپنے پاس اصلاح جہاں اور تعمیر جہاں کا ایک عظیم پروگرام ہے۔ غرض یہ کہ اسلام ایک جہانی نظریہ اور عالمگیر نظام عمل ہے اور مسلمان وہ گروہ اور امت ہیں جو اس خدائی نظام حیات کے حامل اور اس کے علمبردار ہیں۔ ان کی حیثیت ایک اصولی اور نظریاتی گروہ کی ہے۔ وہ ایک خدا پرستانہ صالح تہذیب کے داعی اور حامل ہیں۔ ملت اسلامیہ کی اس حیثیت اور اس کے مقصد وجود کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو یہ بات ناگزیر معلوم ہوتی ہے کہ ملت کو اپنی نسلوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام اس طرح کرنا ہے کہ وہ آگے چل کر

اسلام کے عظیم مقاصد کو اس دنیا میں پورا کر سکیں۔ جو نظام تعلیم ہماری نسل کو اس مقصد کے لیے تیار نہیں کرتا وہ نہ صرف یہ کہ ہمارے مقصد کے خلاف ہوگا بلکہ ہمارے ملی وجود کو تباہ کرنے والا بھی ہوگا۔ اس ضمن میں یہ بھی واضح کیا جانا ضروری ہے اسلام میں دین و دنیا کی علحدگی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اس کی روحانیت ترک دنیا کے رجحانات سے خالی ہے۔ اس کا تصور خدا و عبادت معاملات دنیا سے صرف نظر کر کے صرف خدا کے گیان ودھیان کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔

اسلام کا خدا انسان سے صرف اپنی پرستش کا مطالبہ کر کے بیٹھ نہیں جاتا بلکہ ایک علیم وخبیر، رحیم و کریم آقا کی حیثیت سے انسان کی قدم قدم پر رہنمائی کرتا ہے تاکہ اس کا سفر حیات منزل مقصود کی طرف جاری رہ سکے۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے تو ہمیں ایک ایسے نظام تعلیم کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جس میں تمام علوم معلومہ کو اسلامی نقطہ نظر کے مطابق اس طرح مدوّن اور مرتب کیا گیا ہو کہ اس سے فارغ ہونے والے مومنانہ فکر و نظر اور اسلامی کردار کے حامل بن کر نکلیں۔

مختصر یہ کہ مسلمان ایک ملت ہیں اور ان کا ملی وجود ان کے دین سے وابستہ ہے۔ دین کے بغیر ان کا ملی وجود برقرار نہیں رہ سکتا اور اس کی برقراری کا واحد ذریعہ ان کی دینی تعلیم ہے۔ یہی وہ تعلیم ہے جس کے ذریعہ مسلمان اپنے ملی تشخص کو قائم رکھ سکتے ہیں اور ان کی آنے والی نسلیں عقیدہ اور فکر و عمل کے اعتبار سے مسلمان رہ سکتی ہیں۔

انگریزوں سے قبل کے دور میں جو قطب الدین ایبک سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک تقریبًا ساڑھے سات سو سال کا زمانہ ہے اس دور کے تعلیمی نظام کی جو خصوصیات ہمارے علم میں آئی ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ تعلیم کا جو دینی مزاج قرن اول میں تشکیل پایا تھا وہ بڑی حد تک قائم رہا۔ پورا تعلیمی نظام، دینی تعلیم اور دینی موضوعات کے گرد گھومتا تھا۔ تعلیم ایک عبادت تصور کی گئی اور اہل علم نے تدریس کو اپنا ایک دینی فریضہ سمجھا۔

۲۔ گو کہ اول دور سے یہاں باقاعدہ مدارس کا نظام قایم کیا گیا لیکن مدارس کے علاوہ دوسرے موثر تعلیمی مراکز بھی موجود تھے۔ مساجد اور ان میں قایم شدہ مکاتب تعلیم کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اہل علم کے مقامات اور کتب خانے اعلیٰ تعلیم کے مراکز کا درجہ رکھتے تھے۔

۳۔ تصور تعلیم بہ حیثیت مجموعی بڑا وسیع اور ہمہ گیر تھا۔ سب سے زیادہ اہمیت دینی تعلیم کو حاصل تھی جس کی روح کو باقی تمام تعلیمی سلسلوں میں سمو دیا گیا تھا۔ صنعتی تعلیم کا انتظام کارخانوں میں تھا۔ تجارتی تعلیم کے الگ ادارے تھے جنھیں مہاجنی اسکول کہا جاتا تھا۔ فنون سپہ گری کے لیے بے شمار تربیتی ادارے قائم تھے۔ کتابت، خطاطی، طغریٰ نویسی، فن کوزہ گری، فن تعمیر، ان کے باقاعدہ مکاتب تھے اور اہل فن کے گرد طالبان علم کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ عام دینی مدارس میں جو نصاب تعلیم مروج تھا اس میں دینی علوم کے علاوہ علم ہندسہ جغرافیہ، منطق، طب اور طبعیات کی تعلیم کا انتظام تھا۔

۴۔ اس پورے دور میں بڑے پیمانے پر تعلیمی سہولتیں فراہم کی گئیں اور ہمہ گیر تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ سلطان محمد تغلق کے زمانے میں صرف دہلی میں ایک ہزار اسلامی مدارس قائم تھے اور ان میں ایسے مدارس بھی تھے جن کی حیثیت آج کی یونیورسٹیوں کے برابر تھی۔ عہد اورنگ زیب کا مشہور سیاح الیگزنڈر ہملٹن سندھ کے بارے میں لکھتا ہے کہ صرف ٹھٹھ میں چار سو مدارس تھے۔ یہ کیفیت ہر شہر اور ہر علاقے کی تھی۔ مسلمانوں کے کسی ایک دور کی نہیں بلکہ پورے دور حکمرانی کی تھی۔

۵۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم عوامی بھی تھا اور آزاد بھی۔ حکومت تعلیم کے فروغ کے لیے خطیر رقم خرچ کرتی تھی لیکن کسی زمانے میں بھی تعلیمی نظام حکومت کے تابع نہ تھا۔ تعلیمی اداروں کی ضروریات فراہم کرنے کے لیے اور ذہین طلبا کو قضاۃ و فتویٰ کے مناصب کے لیے منتخب کرنے کے لیے صدر الصدور کا عہدہ سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے دور میں ضرور موجود تھا۔ لیکن اس کا کوئی کنٹرول اداروں پر یا نصاب تعلیم پر نہ تھا۔ وہ مدارس جو حکومت کی گرانٹ سے چل رہے تھے وہ بھی اندرونی نظام میں کلی طور پر آزاد تھے۔ ہر مدرسہ اپنے نصاب، اپنے انتظام، طلبا کے بارے میں پالیسی، علوم کی تخصیص وغیرہ کے بارے میں آزاد تھا اور اس کے باوجود ملک کے طول و عرض میں نظام تعلیم کے تعلق سے غیر معمولی ہم آہنگی و مطابقت پائی جاتی تھی جو اس کا ثبوت ہے کہ ہماری ثقافتی قدروں کی گرفت معاشرے پر اتنی مضبوط تھی کہ فطری انداز میں تعلیم میں یگانگت و یک رنگی پیدا ہوئی۔

۶۔ اس نظام تعلیم کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ پورے نظام تعلیم کا محور استاد تھا۔ تعلیم کا پورا مزاج استاد کا بنایا ہوا تھا۔ استاد اور طالب علم میں گہرا قلبی ربط پایا جاتا تھا۔

۷۔ اس دور میں تعلیم ہمیشہ مفت رہی۔ مسلمانوں نے اپنے کسی دور حکومت میں بھی یہ تصور قبول نہیں کیا کہ تعلیم ایک قابل فروخت شئے ہے اور آٹے اور چاول کی منڈیوں کی طرح اس کی بھی منڈیاں ہونی چاہئیں۔ نہ صرف یہ کہ تعلیم مفت تھی بلکہ طلبار کے بود و باش اور خورد ونوش کا بھی انتظام کیا جاتا۔ نیز حکومت، مختلف امرار یا خود مدرسے کی طرف سے وظائف بھی دیئے جاتے تھے۔

۸۔ طلبار کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کے تزکیہ اور اصلاح باطن کی فکر کی جاتی تھی اور استاد صرف معلم ہی نہیں بلکہ مربی بھی ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس پورے دور میں اس نظام تعلیم کے تیار کردہ افراد نے نظام حکومت کو بڑی خوش اسلوبی سے چلایا۔

یہ جائزہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ مسلمانوں نے تعلیم کا کیسا عظیم الشان نظام قائم کیا تھا اور اپنی خصوصیات کے اعتبار سے وہ کتنا منفرد اور انقلابی تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس نظام میں چند وجوہ کی بنا پر اعلیٰ تعلیم میں منطق، فلسفہ اور دیگر معقولات نے ضرورت سے زیادہ اہمیت حاصل کرلی تھی اور اس کے نتیجہ میں قرآن و حدیث سے وہ زندہ رابطہ کم ہو گیا تھا جو مسلم معاشرہ کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ نیز یہ کہ علوم طبعی میں مسلمانوں نے اس برصغیر میں اس اجتہادی بصیرت اور اختراعی ذہن کا مظاہرہ نہیں کیا جس کا اظہار عراق اور اسپین میں ملتا ہے لیکن ان کمزوریوں کے باوجود یہ نظام تعلیم نہایت ترقی یافتہ تھا اور اس نے گھر گھر تعلیم کا چرچہ کر دیا تھا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ اس ملک کی تعلیمی ترقی انگریزوں کی مرہون منت ہے۔ مسلمانوں کا تعلیمی نظام اٹھارویں صدی کے یورپ کے تعلیمی نظام سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ انگریزوں نے صرف یہی ظلم نہیں کیا کہ انھوں نے ایک وسیع اور ترقی یافتہ نظام تعلیم کو ختم کیا بلکہ اس ملک پر ایک اجنبی نظام تعلیم کو بھی مسلط کیا جس نے مسلمانوں کی فکر ونظر اور تہذیب و ثقافت کو مسخ کر کے رکھ دیا۔

پردیس کی زندگی اور اسلام

(۳) مولانا سلطان احمد اصلاحی

اہل وعیال کو نماز کا حکم:۔ اسلام میں نماز کی اہمیت معلوم ہے کہ مختلف مواقع پر اسے پورے دین کا عنوان قرار دیا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے گورنروں کو تاکید کرتے ہوئے فرمایا کہ: میرے نزدیک تمہارے معاملات میں اہم ترین چیز نماز ہے۔ جو کوئی اس کی حفاظت کرے گا اور اس کی محافظت کا حق ادا کرے گا۔ وہ اپنے پورے دین کی حفاظت کرنے میں کامیاب ہوگا۔ اور جو اسے ضائع کر دے گا۔ تو دین کے دوسرے مطالبات کو وہ بدرجہ اولیٰ ضائع کرنے والا ہوگا۔[1] احادیث کے اندر بھی اسے پورے دین کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے۔[2] اسلام نے فطرت کے عین تقاضے کے مطابق مادی ومعنوی دونوں پہلوؤں سے بال بچوں اور اپنے قریبی لوگوں کا حق دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے قرآن آپ کے تمام امتیوں کو خاص طور پر اپنے اہل وعیال کو نماز کا حکم دینے اور ہر حال میں اسے مضبوطی سے تھامے رہنے کی تاکید کرتا ہے۔

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا نَّحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ (طٰہٰ: ۱۳۲)	اور اپنے اہل وعیال کو نماز کا حکم دو اور خود اس پر جماؤ اختیار کرو۔ ہم تم سے روزی دلوانا نہیں چاہتے۔ ہم تو خود تم کو روزی دیتے ہیں۔ اور انجام کار اللہ کے ڈر ہی کے لیے ہے۔

[1] موطا امام مالک جلد ۱۔ باب وقوت الصلاۃ۔ مکتبہ تجاریہ کبریٰ مصر۔
[2] مسلم جلد ۲۔ کتاب الامارۃ۔ باب خیار الائمۃ وشرارہم۔

آیت کریمہ میں ' صلاۃ ' کا لفظ مطلق آیا ہے۔ جس میں فرض نمازوں کے علاوہ سنن ونوافل اور احادیث کی روشنی میں خاص طور پر تہجد کی نماز بھی شامل ہے۔ حال کے مفسرین میں مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہٗ ' وامر اھلک ' میں " اہل ' کو وسعت دے کر اسے پوری امت کے لیے عام قرار دیتے ہیں[1] لیکن سچ یہ ہے کہ اس تعمیم کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر اس وسعت کو قبول بھی کر لیا جائے تو لفظ ' اہل ' کے تقاضے سے اس سلسلہ میں ' اہل خانہ ' کی اہمیت و اقدمیت مسلم ہے۔ حدیث کے نظائر سے اسی کی تصدیق ہوتی ہے۔ جس میں خاص طور سے " اہل " سے بیوی بچوں کو مراد لیا گیا ہے۔ صحیح بخاری کی روایت ہے۔ حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں:

استیقظ رسول الله صلی الله علیہ وسلم فزعا یقول سُبحان الله ما انزل الله من الخزائن وما ذا أُنزل من الفتن من یوقظ صواحب الحجرات یرید ازواجہ لکی یصلین رب کاسیۃ فی الدنیا عاریۃ فی الآخرۃ[2]

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم (ایک رات) گھبرائے ہوئے اٹھے بار بار فرماتے اللہ کی ذات پاک ہے (اس رات) اللہ نے کیا خزانے اتارے اور ایسے ہی کتنے فتنے اتارے گئے کون ہے جو حجرے والیوں آپ کا مطلب ازواج مطہرات سے تھا، کو جگا دے تاکہ وہ (تہجد کی) نماز پڑھیں (اصل تو یہی چیز ہے، دنیا کی زینت و آسائش کا کیا؟) دنیا میں کتنی ہی (زرق برق) لباس والیاں ہیں جو آخرت میں بے لباس ہوں گی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

رحم الله رجلا قام من اللیل فصلی وایقظ امرأتہ فان ابت نضح فی وجھہا الماء رحم الله امرأۃ قامت من اللیل فصلت وایقظت زوجھا فان ابی نضحت

اللہ کی مہربانیاں ہوں اس آدمی پر جو رات میں اٹھے پس (تہجد کی) نماز پڑھے اور اپنی بیوی کو بھی (اسی مقصد سے) جگائے۔ پس اگر وہ نہ اٹھے تو اس کے چہرے پر پانی مارے اللہ کی مہربانیاں ہوں اس عورت پر جو رات میں اٹھے پس (تہجد کی) نماز پڑھے اور اپنے شوہر کو (اسی مقصد سے) جگائے

[1] تدبر قرآن: ۴/۲۴۸ [2] بخاری جلد ۲۔ کتاب الفتن۔ باب لا یأتی زمان الا الذی بعدہ شر منہ۔ نیز بخاری جلد ۱۔ کتاب التہجد باب تحریض النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی قیام اللیل۔ الخ۔ ترمذی جلد ۲۔ ابواب الفتن باب ما جاء ستکون فتن کقطع اللیل المظلم

فی وجہہ الماء لہ — پس اگر وہ نہ اٹھے تو اس کے چہرے پر پانی چھڑکے۔

حضرت ابوسعید اور حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اذا ایقظ الرجل اھلہ من اللیل فصلیا او صلی رکعتین جمیعا کتب فی الذاکرین والذاکرات ۔ ؂۲

جب آدمی اپنی بیوی کو رات میں اٹھائے پس وہ دونوں مل کر (تہجد کی) نماز پڑھیں یا وہ تنہا پڑھے تو ان کا نام (اللہ کو) یاد کرنے والوں اور یاد کرنے والیوں میں لکھا جاتا ہے۔

حضرت عمر بن الخطابؓ کا معمول تھا کہ آپ رات بھر نوافل میں مشغول رہتے۔ رات کا جب آخری پہر ہوتا تو اپنے اہل خانہ کو نماز کے لیے جگاتے۔ ان سے فرماتے الصلاۃ، الصلاۃ (نماز کے لیے جلدی کرو، نماز کے لیے جلدی کرو)، پھر آیت کریمہ کی تلاوت فرماتے: وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ ؂۳ دوسرے ذرائع سے بھی آپ کے اسی معمول کا پتہ چلتا ہے۔ زید بن اسلم اپنے والد اسلم سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطابؓ کے یہاں میں اور ان کے غلام یرفا رات گزارتے۔ رات میں ان کا ایک خاص وقت تھا جس میں وہ نفل نمازیں پڑھتے۔ کبھی کبھی جب وہ اس وقت نہیں اٹھتے تھے تو ہم لوگ کہتے کہ آج رات وہ نہ اٹھیں گے جیسا کہ وہ اٹھا کرتے تھے۔ البتہ جب آپ رات میں اٹھتے تو وہ اپنے اہل خانہ کو بھی بیدار کرتے اور زبان مبارک پر آیت کریمہ کا ورد جاری ہوتا۔ "وامر اھلک بالصلاۃ وصطبر علیہا الخ" ؂۴

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی معمول تھا۔ حضرت ثابت روایت کرتے ہیں کہ جب کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنگ دستی و تنگ حالی کا سامنا ہوتا تو آپ اپنے اہل خانہ کو پکارتے،

لہ ابوداؤد جلد ۱۔ کتاب الصلوٰۃ باب قیام اللیل۔ نسائی جلد ۱۔ کتاب قیام اللیل و تطوع النہار باب الترغیب فی قیام اللیل ابن ماجہ۔ کتاب الصلوٰۃ۔ باب ما جاء فیمن ایقظ اہلہ من اللیل۔

؂۲ ابوداؤد جلد ۱ کتاب الصلوٰۃ، باب قیام اللیل۔ ابن ماجہ، کتاب الصلوٰۃ، باب ما جاء فیمن ایقظ اہلہ من اللیل۔ قال ابوداؤد فی الحدیث موقوف۔

؂۳ موطا امام مالک: جلد ۱ / ۱۰۷۔ باب ما جاء فی صلاۃ اللیل۔

؂۴ تفسیر ابن کثیر: ۳/۱۷۱۔

یا اھلاہ صلوا صلوا [1]	اے گھر والو! نماز پڑھو، نماز پڑھو۔

مزید براں وہ عام طور پر حضرات انبیاء علیہم السلام کا معمول نقل کرتے ہیں کہ جب انھیں کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو وہ گھبرا کر اٹھتے اور نماز میں لگ جاتے[2] ان کے اہل خانہ بھی ان کے ساتھ اس سعادت میں یقیناً شریک ہوتے ہوں گے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے سلسلے میں قرآن نے اس کی صراحت کی ہے:

وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا (مریم ۵۵)	اور وہ اپنے اہل و عیال کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے۔ اور وہ اپنے رب کے ہاں پسندیدہ تھے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے معمول کی وضاحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے ہوتی ہے۔
حضرت عثمان بن العاص روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ:

کان لداؤد نبی اللہ علیہ السلام من اللیل ساعة یوقظ فیھا اھلہ فیقول یا آل داؤد قوموا فصلوا فان ھذہ ساعة یستجیب اللہ فیھا الدعاء الا لساحر او عشار[3]	حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے رات میں ایک خاص وقت تھا جس میں وہ اپنے اہل خانہ کو جگاتے فرماتے اے آل داؤد اٹھو اور (تہجد کی) نماز پڑھو۔ اس لیے کہ یہ وہ وقت ہے جس میں کہ اللہ دعا کو قبول کرتا ہے۔ سوائے دو شخصوں کے ایک جادوگر دوسرے وصول تحصیل میں بے انصافی کرنے والا۔

اولاد کے سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تاکیدی حکم معلوم ہی ہے کہ،

مروا اولادکم بالصلاة وھم ابناء سبع سنین واضربوھم علیھا وھم ابناء عشر وفرقوا بینھم فی المضاجع[4]	اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو جبکہ وہ سات سال کے ہوں اور انھیں اس پر مارو جبکہ وہ دس سال کے ہو جائیں اور (ساتھ ہی) ان کے بستروں کو الگ الگ کردو۔

---

[1] حوالہ سابق [2] حوالۂ مذکور۔ [3] مسند احمد، ۴/۲۲۔ نیز مشکوٰۃ، جلد ۱۔ کتاب الصلوٰۃ، باب التحریض علی قیام اللیل، فصل ثالث۔ قال المنذری رواہ احمد عن علی بن زید عنہ وبقیۃ رواتہ محتج بھم فی الصحیح واختلف فی سماع الحسن من عثمان۔ الترغیب والترہیب ۵۲۷-۵۲۸ [4] ابوداؤد جلد ۱۔ کتاب الصلوٰۃ۔ باب متی یؤمر الغلام بالصلوٰۃ۔ قال النووی واسنادہ حسن۔ ریاض الصالحین/۱۵۹۔ نیز ترمذی جلد ۱۔ ابواب الصلوٰۃ۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حدیث پاک میں نماز کا حکم بطور مثال کے ہے۔ روزہ اور طاعت و عبادت کے دوسرے کاموں کا بھی یہی حکم ہے۔ اسی لیے فقہاء نے صراحت کی ہے کہ نماز کے ساتھ اولاد کو روزے اور عبادت وطاعت کے دوسرے کاموں کا بھی کمسنی کے زمانہ سے ہی عادی بنانا چاہئے۔ تاکہ جب بچہ بالغ ہو تو عبادت وطاعت کا وہ پہلے ہی سے عادی ہوچکا ہو۔ اور گناہوں سے دوری اور اللہ کی نافرمانی سے اجتناب اس کا مزاج بن چکا ہو[1]۔

نماز دن میں پانچ بار فرض ہے۔ جو اس سرے سے اس سرے تک دن اور رات کے اوقات کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس کے ساتھ اگر نوافل اور تہجد کا اضافہ کرلیا جائے تو رات اور دن کے بقیہ اوقات بھی اس میں سمٹ آتے ہیں۔ آدمی خود نماز پڑھے اور اس کا اہتمام کرنے کے ساتھ اپنے بیوی بچوں کو بھی نماز کا پابند بنائے اور ان کے اندر نمازوں کا اہتمام پیدا کرے، کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ کام اسی صورت میں انجام پاسکتا ہے جبکہ انسان کے صبح وشام بال بچوں کے ساتھ بسر ہوں۔ سات سمندر پار سے وہ خط وکتابت وغیرہ کے ذریعہ اہل خانہ کو اس کی طرف کبھی کبھار تو متوجہ کرسکتا ہے۔ لیکن اہل و عیال پنج وقتہ نمازوں کے خوگر بنیں اور ساتھ ہی ان کے اندر طاعت و عبادت کے دوسرے امور کا اہتمام پیدا ہو، یہ بات اسی وقت ہوسکتی ہے جبکہ مرد بال بچوں کو اپنے ساتھ رکھے۔ روزی روٹی کی تلاش میں دن کے اوقات میں اگر اس کی گھر سے دوری بھی ہو تو بقیہ اوقات کے ذریعہ گھر والوں کے اوپر اس کی ایسی نگرانی قائم ہو کہ وہ شتر بے مہار نہ بن سکیں۔ وہ حدود اللہ کے پابند ہوں۔ اور اسی پابندی میں ان کے دن اور رات بسر ہوں۔

۳۔ کھانا بیوی بچوں کے ساتھ کھایا جائے: معلوم ہے کہ اسلام میں بیوی کے نان نفقہ، یعنی کھانے کپڑے اور مکان کی ذمہ داری شوہر کی ہے[2]۔ اسی طرح کمسن اولاد کے نفقہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر، ۴/۳۹۱ [2] ہدایہ: ۲/۴۱۷ - باب النفقہ، رشیدیہ، دہلی

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) باب متی یومر الصبی بالصلاۃ۔ قال الترمذی حدیث حسن صحیح۔ وقال: ایضا۔ وعلیہ العمل عند بعض اہل العلم وبہ یقول احمد واسحاق وقالا ماترک الغلام بعد عشر من الصلوٰۃ فانہ یعید۔ ورواہ الیضانی شرح السنۃ، مشکوٰۃ المصابیح جلد۱۔ کتاب الصلوٰۃ فصل ثانی۔

کی ذمہ داری بھی تنہا باپ کی ہے جس میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہے[1]۔ اسی ضمن میں احادیث کے اندر وہ تصریحات آئی ہیں جو مسئلہ زیر بحث کی نسبت سے بہت معنی خیز ہیں۔ اور جن کا صاف اقتضا معلوم ہوتا ہے کہ مرد کو پردیس میں گھر سے مستقل دور نہیں بلکہ بیوی بچوں کے ساتھ رہنا چاہئے۔ اور صبح و شام اسے اپنے بال بچوں کے درمیان ہونا چاہئے۔ حضرت حضرت حکیم اپنے والد معاویہ قیشری سے روایت کرتے ہیں۔ معاویہ قیشری نے ایک موقعہ پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت فرمایا:

قلت یا رسول اللّٰہ ماحق زوجۃ احدنا علیہ قال أن تطعمہا اذا طعمت وتکسوھا اذا اکتسیت[2]

میں نے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہم میں سے کسی کی بیوی کا اس پر کیا حق ہے۔ فرمایا کہ تم اسے کھلاؤ جبکہ خود کھاؤ اور اسے پہناؤ جبکہ خود پہنو۔

انہی کی دوسری روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اطعمہا اذا طعمت واکسہا اذا اکتسبت[3]

اسے کھلاؤ جبکہ تم خود کھاؤ اور اسے پہناؤ جبکہ تم خود پہنو۔

دوسرے موقعہ پر عموم کا انداز ہے۔ حضرت حکیم بن معاویہ ہی کی دوسری روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ: ما حق المرأۃ علی الزوج بیوی کا شوہر پر کیا حق ہے تو آپ نے فرمایا:

ان یطعمہا اذا طعم وان یکسوھا اذا اکتسی[4]

یہ کہ وہ اسے کھلائے جبکہ خود کھائے اور اسے پہنائے جبکہ خود پہنے۔

طعام پکے ہوئے کھانے کو کہتے ہیں۔ قرآن و حدیث اس کے نظائر سے بھرے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے آدمی کا اپنی بیوی کے ساتھ کھانا اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ وہ اس کے ساتھ رہے۔ باہر اور گھر سے دور رہ کر وہ اس کے لیے اعلیٰ سے اعلیٰ کھانے کا اہتمام تو کر سکتا

---

[1] ہدایہ، ۲/۴۲۵ [2] ابوداؤد جلد ۱۔ کتاب النکاح، باب فی حق المرأۃ علی زوجہا۔
[3] ابوداؤد حوالہ سابق [4] ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب حق المرأۃ علی الزوج

ہے لیکن ساتھ مل کر کھانے کے فرمان نبویؐ پر وہ عمل نہیں کر سکتا۔

روایت کے ان الفاظ میں اگر کچھ اجمال ہو تو احادیث ذیل اس اجمال کو بالکل صاف کر دیتی ہیں۔

حضرت سعد بن و قاصؓ کی طویل روایت کا ٹکڑا ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا:

۱۔ ومہما انفقت فہو لک صدقۃ حتی اللقمۃ ترفعہا فی فی امرأتک[1]

اور جو کچھ تم (خدا کی رضا کے حصول کی غرض سے) خرچ کرو وہ تمہارے لیے صدقہ ہے۔ یہاں تک کہ وہ لقمہ بھی جسے تم اٹھا کر اپنی بیوی کے منہ میں رکھتے ہو

دوسرے موقعہ پر فرمایا:

۲۔ وانک لن تنفق نفقۃ الا اجرت علیہا حتی اللقمۃ ترفعہا الی فی امرأتک[2]

اور اللہ کی مرضی کی خاطر، تم جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو اس پر تم کو ضرور بدلہ ملے گا۔ یہاں تک کہ اس لقمہ پر بھی جسے تم اٹھا کر اپنی بیوی کے منہ میں رکھتے ہو۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ بیوی کے منہ میں لقمہ آدمی سات سمندر پار سے نہیں تھما سکتا۔ ہندوستان کے عام دستور سے بھی ہٹ کر جس میں کہ شوہر بیوی کا ایک ساتھ کھانا کھانا معیوب سمجھا جا سکتا ہے، بلکہ قدیم مسلمان وضعدار گھرانوں میں اس کا شاید تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ مشترکہ خاندان میں کوئی بیٹا اپنی بیوی کے ساتھ بے تکلف ہو کر ایک دستر خوان پر کھانے کی جرأت کر سکے، یہ تو جبھی ہو سکتا ہے جبکہ اس دستور سے رشتہ توڑ کر شوہر بے تکلف بیوی کے ساتھ مل کر کھائے اور اس کی پوری دلداری کرتے ہوئے دستر خوان کی ہر چیز سے اس کے لیے لذت کام و دہن کا سامان کرے۔

یہ تو رہا بیوی کے ساتھ کھانے کا معاملہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری حدیث سے، اس میں بچوں کی شرکت کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی بخاری و مسلم کی متفق علیہ روایت ہے۔ جس میں ایک شخص رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑے

---

[1] بخاری جلد ۲۔ کتاب النفقات، باب فضل النفقۃ علی الاہل الخ نیز مسلم بحوالہ الترغیب والترہیب للمنذری ۳/۴۸۔ باب الترغیب فی النفقۃ علی الزوجۃ والعیال الخ [2] بخاری جلد ۲۔ کتاب الفرائض، باب میراث البنات

بڑے گناہوں (کبائر) کے بارے میں سوال کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں دوسری باتوں کے سوا ایک بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی۔

أن تقتل ولدك خشية أن يطعم معك [1] — یہ کہ تم اپنی اولاد کو جان سے مار دو اس ڈر سے کہ وہ تمہارے ساتھ بیٹھ کر کھائے۔

اس حدیث پاک کی عبارت النص سے تو قتل اولاد کی حرمت ثابت ہوتی ہے، اشارہ النص سے یہ بات نکلتی ہے کہ آدمی کے لیے اپنی معاشرتی زندگی کا ایسا نقشہ تجویز کرنا چاہیے اور روزی روٹی کی ایسی راہیں پیدا کرنی چاہئیں کہ وہ اپنے بیوی بچوں سے ہزاروں میل کے فاصلے پر دور پڑے رہنے کے بجائے، ان کے درمیان رہ سکے۔ اور دن کا پورا وقت اگر وہ اللہ کے فضل کی تلاش میں دوڑ دھوپ میں گزارے تو شام کو گھر واپس آ جائے جس کے نتیجے میں اس کا کھانا پینا اپنے بال بچوں کے ساتھ ہو سکے۔ ضمنی طور پر حدیث پاک سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ باپ کی مردانگی اور اولوالعزمی کا تقاضا ہے کہ وہ جو کچھ کھائے بیوی بچوں کے ساتھ کھائے۔ ایسا نہ ہو، جیسا کہ بعض کم ظرف والدین کے سلسلے میں دیکھنے میں آتا ہے کہ بچوں کے غائبانہ میاں بیوی اپنے لیے تنہا من پسند چیزوں کے کھانے کا سامان کرتے ہیں۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کا نمونہ:

اسلام کے نقطۂ نظر سے حضرات انبیاء علیہم السلام انسانیت کے وہ گل سرسبد ہیں کہ زندگی کے تمام معاملات میں ان کے نمونوں کی پیروی ہی میں قیامت تک کے لیے اس کی دنیا و آخرت کی فلاح وابستہ ہے۔ اور واقعہ ہے کہ جب تک فکر و نظر کے تمام دائروں میں ان حضرات گرامی کی امامت و رہبری تسلیم نہیں کی جاتی، آج کی دکھوں کی ماری انسانیت اپنے مصائب کا درماں تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اسلام کے صحیفۂ ہدایت، قرآن، میں ان حضرات گرامی کی دعوتی جدوجہد کے ساتھ ان کی ذاتی اور شخصی زندگی کے نمونے بھی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں جو اسلام کے نقطۂ نظر سے پردیس کی زندگی کے مسئلہ زیر بحث کے سلسلے میں اپنے اندر پوری رہنمائی کا سامان رکھتے ہیں۔ اور ان سب کا خلاصہ یہی ہے کہ بال بچوں سے دور پردیس میں تنہا مستقل طور پر پڑے رہنے کے بجائے آدمی کو اپنی روزی روٹی کے لیے ایسی راہیں

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح، جلد ۱۔ کتاب الایمان، باب الکبائر و علامات النفاق بحوالہ بخاری و مسلم۔

پیدا کرنی چاہئیں جن سے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے ہوئے ضروریات زندگی کا سامان کیا جا سکے۔

۱۔ **حضرت نوحؑ:** قرآن کے بیان کے مطابق تمام انبیائے کرام میں سب سے طویل عمر حضرت نوحؑ علیہ السلام نے پائی ہے۔ وہ پورے ساڑھے نوسو سال تک اپنی قوم کے اندر دعوت حق کا فریضہ انجام دیتے رہے[۱]۔ لیکن چند لوگوں کے علاوہ جب پوری قوم نے شرک وکفر کے راستے ہی پر اڑے رہنے کا فیصلہ کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو پانی کے عذاب سے ہلاک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص نگرانی میں آں جناب سے کشتی تیار کرائی اور حکم ہوا کہ تمام جانوروں کے ایک ایک جوڑے اس میں رکھ لیے جائیں۔ اور اہل ایمان جماعت اور اہل ایمان بیوی بچوں کو ساتھ بٹھا لیا جائے۔ سوائے ان کی ایک بیوی اور ایک لڑکے کے جنھوں نے شرک وکفر پر ڈٹے رہنے کا فیصلہ کیا اور بالآخر قوم کے ساتھ ہلاک کر دیے گئے[۲]۔

قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِن كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ آمَنَ وَمَا آمَنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيلٌ (ھود، ۴۰)	ہم نے کہا کہ کشتی میں تمام (جانداروں) کے ایک ایک جوڑے رکھ لو، ساتھ ہی اپنے اہل وعیال کو بھی سوائے ان کے جن پر (میری ان کو ہلاک کرنے کی) بات پڑ چکی ہے اور ان کو جو ایمان لائے (اس میں بٹھا لو)۔ اور اس کے ساتھ جو ایمان لائے وہ بہت تھوڑے تھے۔
۲۔ فَاسْلُكْ فِيهَا مِن كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ (مومنون، ۲۷)	سو تم کشتی میں تمام (جانداروں) کے ایک ایک جوڑے ڈال لو اور اپنے اہل وعیال کو بھی، سوائے ان کے کہ جن کے سلسلے میں (ان پر عذاب آنے کی میری) بات پڑ چکی ہے (اس میں بٹھا لو) اور ان لوگوں کی نسبت مجھ سے ہم کلام نہ ہو جنھوں نے (اپنے اوپر) ظلم کیا ہے۔ وہ ضرور ڈوب کر رہیں گے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی یہ سرگزشت عبرت ونصیحت کے دوسرے پہلوؤں کے ساتھ اپنے اندر یہ تفصیل بھی رکھتی ہے کہ آں جناب آخر وقت تک گھر سے دور رہنے کے بجائے بیوی بچوں کے ساتھ رہے۔ آپ کا پسندیدہ طرز معاشرت یہی تھا کہ آدمی کو تنہا، بال بچوں سے دور نہ رہ کر

---

[۱] عنکبوت: ۱۴ [۲] تفسیر الجلالین/ ۹۰ ہنیز ۴۴۸ [۳] ممتحنہ: ۵

ہمیشہ انھیں اپنے ساتھ رکھنا چاہئے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی بیوی چراغ تلے اندھیرے کا مصداق بن کر ہدایت سے محروم رہی۔ اور عذاب الٰہی نے دوسروں کے ساتھ اس کا نام ونشان بھی ہمیشہ کے لیے مٹا دیا۔

۲۔ **حضرت ابراہیمؑ:** انبیائی جماعت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بڑا امتیازی مقام حاصل ہے۔ قرآن نے تمام مسلمانوں کے لیے آپ کی زندگی کو قیامت کے لیے نمونہ کی زندگی قرار دیا[1]

قرآن نے آپ کی زندگی کی جو تفصیلات بیان کی ہیں اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ اپنی بیوی کے ساتھ رہتے تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام جو دوسرے جلیل القدر پیغمبر ہیں ان کا اور آپ کا زمانہ ایک ہے۔ لوط علیہ السلام کی قوم نے جب اپنی بدبختی کی انتہا کر دی تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو کو بھیج کر اس نابکار قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا فیصلہ کیا۔ فرشتوں کا یہ وفد انسانی صورت میں پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاں بطور مہمان فروکش ہوا۔ اس واقعہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے قرآن صراحت کرتا ہے کہ آں جناب نے بچھڑے کا تازہ بھنا ہوا گوشت ان کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ گوشت آپ کے اہل خانہ کا تیار کردہ تھا

فَرَاغَ إِلَىٰ أَهْلِهِ فَجَاءَ بِعِجْلٍ سَمِينٍ (ذاریات: ۲۶)[2]
سو وہ اپنے اہل خانہ میں لپک کر پہنچے اور دبڑی مقدار میں بچھڑے کا بھنا ہوا گوشت لے کر آئے۔

دوسرے موقعہ پر بھی قرآن آں جناب کی زوجۂ محترمہ کے آپ کے ساتھ رہنے کی صراحت کرتا ہے:

۱۔ وَامْرَأَتُهُ قَائِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحَاقَ وَمِن وَرَاءِ إِسْحَاقَ يَعْقُوبَ ۝ (ہود: ۷۱)
اور ان کی بیوی (پاس ہی) کھڑی تھیں، سو وہ ہنس پڑیں، تو ہم نے انھیں اسحاق کی بشارت دی، اور اسحاق کے پیچھے یعقوب کی بھی۔

۲۔ فَأَقْبَلَتِ امْرَأَتُهُ فِي صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوزٌ عَقِيمٌ ۝ (ذاریات: ۲۹)
سو ان کی بیوی شور مچاتی آگے آئیں، ساتھ ہی اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا اور بولیں کہ (اچھا اب) بانجھ بوڑھی (صاحب اولاد ہوگی)

۳۔ **حضرت لوطؑ:** حضرت نوحؑ کی طرح حضرت لوطؑ کی بیوی بھی انہی بدقسمت لوگوں

[1] ممتحنہ: ۵　[2] نیز ہود: ۶۹

میں سے تھی جو آں جناب کی تمام تر تعلیم و تلقین کے باوجود آپ کی قوم کی اکثریت کے ساتھ شرک و کفر پر ڈٹی رہنے کے لیے مصر رہی۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے جب اس قوم کو ہلاک کرنے کا فیصلہ کیا تو انہی بدنصیب لوگوں کے ساتھ اس کا بھی نام و نشان مٹا دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے صرف لوط علیہ السلام کے اہل ایمان گھرانے کو نجات ملی۔ باقی آپ کی بیوی سمیت وہ پوری قوم تباہ و برباد کر دی گئی:

۱۔ إِلَّا آلَ لُوطٍ إِنَّا لَمُنَجُّوهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا امْرَأَتَهُ قَدَّرْنَا إِنَّهَا لَمِنَ الْغَابِرِينَ ۝ (حجر: ۵۹-۶۰)	سوائے لوط کے گھر بار والوں کو ہم ضرور انہیں ایک ایک کر کے نجات دیں گے۔ سوائے اس کی بیوی کے جس کے بارے میں ہمارا فیصلہ ہو چکا تھا کہ وہ ضرور رہ جانے والوں میں ہو گی۔
۲۔ فَأَنجَيْنَاهُ وَأَهْلَهُ إِلَّا امْرَأَتَهُ قَدَّرْنَاهَا مِنَ الْغَابِرِينَ ۝ (نمل: ۵۷)	سو ہم نے اس کو اور اس کے اہل و عیال کو بچا لیا۔ سوائے اس کی بیوی کے جس کے بارے میں ہمارا فیصلہ ہو چکا تھا کہ وہ رہ جانے والوں میں سے ہو گی۔

حضرت لوط علیہ السلام کے اس واقعہ کی تفصیل سے بھی پتہ چلتا ہے کہ حضرت انبیاء علیہم السلام بال بچوں سے دور دراز تنہا رہنے کے بجائے ہمیشہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔

۴۔ حضرت اسماعیل ؑ۔

سیدنا اسماعیل السلام کے سلسلے میں بھی قرآن صراحت کرتا ہے۔

وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَكَانَ عِندَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا (مریم: ۵۵)	اور وہ اپنے اہل و عیال کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور وہ اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھا۔

---

[1] ہیر۔ شعراء: ۱۶۹۔ ۱۷۱، عنکبوت: ۳۲-۳۳۔ صافات: ۱۳۴-۱۳۵۔ مولانا امین احسن اصلاحی ان مقامات پر اہل اور آل کے وسیع معنی لیتے ہیں۔ اور اہل کی طرح آل کے اندر بھی اہل و عیال کے ساتھ اتباع و صحابہ کو بھی شامل قرار دیتے ہیں۔ تدبر قرآن ۳/۱، ۴۰۸-۴۰۷ یا نیز تدبر، ۳/۶۱۳۔ لیکن صحیح بات ہے کہ اس وسعت کو قبول کر لینے کے بعد بھی اس سلسلے میں اہل و عیال کی اہمیت و اقدمیت مسلم ہے۔ اہل و آل کے الفاظ کا متبادر استعمال اہل خانہ اور اہل خاندان ہی کے لیے ہے۔

ظاہر ہے کہ آں جناب زکوٰۃ کے علاوہ خاص طور پر دن ورات کے مختلف اوقات میں اپنے اہل خانہ کو نماز کی تاکید اسی صورت میں کر سکتے تھے جبکہ وہ ان کے ساتھ رہیں۔ بیوی بچوں کے ساتھ ان کا ہر وقت کا واسطہ رہے جس میں وہ نماز اور زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے مطالبات دین کے لیے بھی انھیں برابر متوجہ کرتے رہیں۔ بال بچوں سے سینکڑوں ہزاروں میل دور رہ کر آں جناب یہ خدمت انجام نہیں دے سکتے تھے۔

حضرت یعقوبؑ:۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام کے سلسلے میں بھی قرآن سے اس کا صاف اشارہ نکلتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات کی تفصیل کے آخری مرحلہ میں جب حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں کے ساتھ ان کے دربار میں پہنچتے ہیں تو قرآن کہتا ہے وہ تنہا نہیں بلکہ اپنی بیوی کے ساتھ ہوتے ہیں جس کا صاف مطلب ہے کہ وہ اپنے وطن میں تنہا نہیں بلکہ بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے:

۱۔ فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَىٰ يُوسُفَ آوَىٰ إِلَيْهِ أَبَوَيْهِ ... (یوسف: ۹۹)

پس جب وہ لوگ یوسف کے ہاں فروکش ہوئے تو اس نے اپنے ماں باپ کو سینے سے لگا لیا۔

۲۔ وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا .... (یوسف: ۱۰۰)

اور اس نے اپنے ماں باپ کو اپنے ساتھ اوپر تخت پر بٹھا لیا اور وہ سارے لوگ اس کے حضور سجدہ میں گر پڑے۔

حضرت موسیٰؑ:

حضرت موسیٰ علیہ السلام ان اولوالعزم پیغمبروں میں سے ایک ہیں جن کے واقعات زندگی قرآن نے بار بار اور بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دین اسلام کی تکمیل کے ساتھ دنیا میں فکر وعمل کا جو عظیم انقلاب برپا کیا جانے والا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوتی جدو جہد کی اس سے بہت زیادہ مماثلت تھی، اس لیے قرآن نے آپ کی زندگی کے حالات بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ اور مختلف پیرایوں میں انھیں بار بار دہرایا ہے آپ کی زندگی کا بڑا نازک موڑ ہے جبکہ مصر میں نوجوانی کی عمر میں آپ کے ہاتھ سے ایک قبطی کا قتل ہوگیا۔ اپنی جان بچانے کی خاطر آپ نے مدین کا رخ کیا۔ وہاں ایک سلسلے سے آپ کی رسائی ایک

رسیدہ بزرگ[1] تک ہوئی۔ جلد ہی ان کی ایک لڑکی سے آپ کی شادی ہو گئی۔ مہر یہ قرار پایا کہ وہ اپنے خسر کے ہاں آٹھ یا دس سال تک مزدوری کریں گے۔ اس مدت کو پوری کرنے کے بعد جب وہ مدین سے نکلے ہیں تو اثنا، سفر میں انھیں نبوت کی دولت سے سرفراز کیا گیا ہے۔ سورۂ قصص میں آں جناب کی یہ سرگذشت پوری تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ اس مرحلہ کا ذکر قرآن نے بدیں الفاظ کیا ہے جس میں صراحت ہے کہ اس سفر میں آپ کے بیوی بچے آپ کے ساتھ تھے:

فَلَمَّا قَضَىٰ مُوسَى الْأَجَلَ وَسَارَ بِأَهْلِهِ آنَسَ مِن جَانِبِ الطُّورِ نَارًا ۖ قَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّي آتِيكُم مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ (قصص: ۲۹)[2]

پس جب موسیٰ نے (ٹھہرائی ہوئی) مدت پوری کرلی اور اپنے اہل خانہ کے ساتھ چلے تو طور کے کنارے انھیں آگ کی آہٹ ملی۔ (انھوں نے اہل خانہ سے کہا) کیوں نہ ایسا ہو کہ میں اس تک پہنچوں اور وہاں سے کچھ اتا پتا یا آگ ہی کا کوئی ٹکڑا لاؤں جس سے تم گرمی حاصل کرسکو

'پردیس کی زندگی' اور اسلام کے موضوع زیر بحث کے سلسلے میں یہ آیت کریمہ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین میں اپنی سسرال میں اہل خانہ کے ساتھ رہے۔ اور جب معاہدہ کی مدت کو پوری کرکے وہاں سے چلے اس وقت بھی بیوی کو میکہ میں چھوڑنے کے بجائے اسے اپنے ساتھ لے کر چلے۔ یہ تو قرآن کا بیان ہے۔ تورات میں اضافہ ہے کہ آں جناب جب مدین سے مصر کے لیے رخت سفر باندھ کر نکلے تو بیوی کے علاوہ آپ کے بیٹے بھی آپ کے ساتھ تھے[3] اس سے اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے کہ مدین میں آپ کی شادی

---

[1] عام طور پر کتب تفسیر میں ان بزرگ کو حضرت شعیب علیہ السلام بتایا گیا ہے، لیکن قرآن میں ان کے متعلق صرف عمر رسیدہ بزرگ، (شیخ کبیر، قصص: ۲۳) کہا گیا ہے۔ حالانکہ اگر یہ حضرت شعیب علیہ السلام جیسے برگزیدہ پیغمبر تھے تو ان کا نام لینا ہی مناسب تھا۔ اس لیے زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ یہ دین براہیمی کے پیرو کوئی بزرگ تھے یا یہ کہ ان کا حضرت شعیب علیہ السلام سے خصوصی تعلق تھا۔ مولانا مودودیؒ اسی رائے کی ترجیح کے قائل ہیں۔ تفہیم القرآن: ۳/ ۶۲۷، ۶۲۸ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، طبع دہم [2] نیز، نمل: ۷، طٰہٰ: ۱۰ [3] خروج، باب: ۴، ۲۰۔ میں بیوی کے ساتھ بیٹوں کا ذکر مطلق ہے، ان کی تعداد کی کوئی صراحت نہیں ہے۔ جبکہ صاحب تدبر قرآن نے تورات ہی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس سفر میں بیوی کے سوا آپ کے دو بچے بھی تھے۔ تدبر قرآن: ۴/ ۸۰۳۔ البتہ اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ کتاب خروج، باب: ۲: ۲۱، ۲۲ میں آپ کے ایک بیٹا ہونے کا (ذکر ہے)

ان بزرگ کی صاحبزادی سے جلد ہوگئی تھی۔ اور آٹھ دس سال کا وقت آپ نے وہاں اپنے اہل خانہ کے ساتھ گزارا۔ اس نمونہ کا بھی تقاضا ہے کہ آدمی جہاں کہیں رہے، اسے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہنا چاہیے۔ بال بچوں سے دور پردیس میں تنہا پڑے رہنا انبیا کا طریقہ نہیں ہے، اسلام جس حقیقت سے عبارت ہے وہ انہی انبیائی نمونوں کا آخری مظہر ہے۔

۷ آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ :- آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین اسلام، جس طرح کامل و اکمل ہے، اسلامی سماجیات کے اس اہم ترین مسئلہ میں آپ کی رہنمائی بھی بھرپور اور مکمل ہے جو اس سلسلے کے تمام امکانی شکوک و شبہات کو بالکل صاف کر دینے والی ہے۔ معلوم ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی جذبات کی اعلیٰ ترین قربانی پیش کرتے ہوئے اپنی پچیس سال کی جوانی کی عمر میں حضرت خدیجہؓ سے شادی کی جو بیوہ تھیں اور جن کی عمر نکاح کے وقت چالیس سال تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کے سوا آپ کی تمام اولاد انہی کے بطن سے ہوئی۔ ان کی زندگی بھر آپؐ نے کوئی دوسری شادی نہیں کی۔ ازدواجی زندگی کے اس طویل عرصے میں آپ کا ان کا دن رات کا ساتھ رہا۔ اور کسی قابل لحاظ وقفہ کے لیے آپؐ ان سے کبھی دور نہیں ہوئے۔ ہجرت سے تین سال قبل حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے انتقال کے بعد یکے بعد دیگرے نو ازواج مطہرات آپؐ کے حبالۂ عقد میں آئیں[۵]۔ ان سب کے ساتھ بھی آپؐ کی معاشرت کا طریقہ معلوم ہے کہ ازواج مطہرات کے کمرے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ بسا اوقات ایک ہی رات میں آپؐ ان سب کے ہاں قیام پذیر ہوتے تھے۔ حضرت سودہ بنت زمعہؓ کے علاوہ جنھوں نے اپنی باری حضرت عائشہؓ کو دے دی تھی بقیہ آٹھ ازواج پاک کے ہاں آپ کی باری مقرر تھی۔ اور ان سب کے ہاں برابری اور انصاف کے ساتھ آپؐ شب باشی فرماتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ عصر بعد تمام ازواج مطہرات کے ہاں تشریف لے جاتے۔ اور سب کے حالات اور مسائل معلوم کرتے۔ آخر میں جن کے ہاں رات گزارنے کی باری ہوتی، ان کے ہاں ٹھہر جاتے۔ سفر میں بھی ازواج مطہرات میں سے کسی نہ کسی کو ساتھ رکھتے۔ اس کا طریقہ تھا کہ جب کبھی سفر کا ارادہ ہوتا، اپنی بیویوں کے درمیان قرعہ اندازی کرتے۔ جن کا نام نکل آتا، انھیں اپنے ساتھ لے جاتے[۶]۔ زندگی کے آخری وقت

[۵] زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، ۱/۱۰۵-۱۱۴　[۶] حوالہ سابق: ۱/۵۱ تا ۵۳۔

تک آپ کا یہی معمول رہا۔ آپ ہمیشہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ رہے۔ بیویوں کو کبھی اپنے سے دور نہیں رکھا۔ آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو قرآن نے خاص طور پر تمام مسلمانوں کے لیے نمونہ قرار دیا ہے۔[1] آپ کے اس نمونۂ زندگی کا صریح مطالبہ ہے کہ آپؐ کے ماننے والوں اور آپؐ کی پیروی کا حق ادا کرنے والوں کو بھی ہمیشہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہنا چاہیے۔ بیوی بچوں سے دور رہنے کا مطلب ہے کہ آدمی اپنے اوپر شیطان کے حملے کے لیے راہ ہموار کرے۔ کسی مسلمان سے توقع نہیں کی جاتی ہے کہ وہ اپنے اوپر شیطان کو حملہ آور ہونے کا موقع دے گا۔

ایلاء کی بحث :۔

پردیس کی زندگی کے سلسلے میں اسلام کا مطلوبہ رویہ کیا ہے۔ مرد بال بچوں سے دور گھر سے باہر رہ سکتا ہے، یا نہیں اور اگر رہ سکتا ہے تو اس کی مدت کیا ہونی چاہیے، اسلام میں 'ایلاء' کی بحث اس مسئلہ کو بڑی حد تک صاف کر دیتی ہے۔ اصطلاح شرع میں 'ایلاء' کا مطلب ہے کہ شوہر بیوی سے خاص زن و شوئی تعلق سے باز رہنے کی قسم کھالے۔ اس صورت میں مسلمان شوہروں کے لیے چار مہینہ کی مدت ہے جس میں وہ 'ایلاء' کے ذریعہ اپنی بیویوں سے خاص تعلق قائم کرنے سے باز رہ سکتے ہیں، اس مدت کے ختم ہو جانے کے بعد شوہر کو رجوع کرنا ہوگا اور بیوی سے معمول کے تعلقات بحال کر لینے ہوں گے۔ بصورت دیگر اسے اپنی بیوی کو طلاق دینا ضروری ہوگا۔[2] تاکہ اس کے بندھن سے آزاد ہو کر وہ اپنے لیے زندگی کا دوسرا ساتھی تلاش کر لے۔ قرآن حکیم میں اس مسئلہ کی تفصیل میں کہا گیا ہے:

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ (بقرہ: ۲۲۶، ۲۲۷)	جو لوگ کہ اپنی عورتوں سے (خاص زن و شوئی تعلق نہ رکھنے کی) قسم کھاتے ہیں، ان کے لیے انتظار کے چار مہینہ کا موقعہ ہے۔ تو اگر وہ (اس مدت میں) رجوع کر لیتے ہیں تو اللہ بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ اور اگر وہ طلاق کا فیصلہ کرتے ہیں تو اللہ سننے والا، جاننے والا ہے

---

[1] احزاب: ۲۱ [2] زاد المعاد فی ہدی خیر العباد: ۵/۳۴۲

شوہر یہ جو خاص زن و شوئی قائم کرنے کی قسم کھاتا ہے، اگر اس کی مدت چار ماہ سے کم ہو تو اس صورت میں آیت کریمہ سے استدلال کرتے ہوئے یہ تو ضرور کہا گیا ہے کہ اسے اس مدت تک کے ختم ہونے تک رکے رہنے کا اختیار ہوگا، پھر اسے اپنی عورت سے خاص تعلق قائم کرنا ضروری ہوگا اور عورت کو اس مدت میں اس سے رجوع کرنے کے مطالبہ کا حق نہیں ہوگا، لیکن اگر یہ مدت چار ماہ سے زیادہ ہوتی ہے تو اس کے بعد بیوی کو شوہر سے یہ مطالبہ کرنے کا حق ہوگا کہ یا تو وہ رجوع کرے اور اس سے زن وشو کا خاص تعلق قائم کرے یا پھر طلاق دے، اگر وہ خود ایسا نہ کرے تو حاکم اسے ایسا کرنے کے لیے مجبور کرے گا۔ یہ اس لیے تاکہ مرد عورت کو نقصان نہ پہنچا سکے[1]

اگلی آیت کریمہ میں 'وان عزموا الطلاق' کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے محض چار ماہ گزر جانے سے طلاق خود بخود واقع نہیں ہو جائے گی۔ جیسا کہ جمہور متاخرین کا یہی مسلک ہے۔ البتہ دوسرے لوگوں کا کہنا ہے کہ چار مہینہ گزرنے کے ساتھ ہی ایک طلاق خود بخود واقع ہو جائے گی۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ طلاق رجعی ہوگی یا بائن ہوگی۔ جو لوگ اس خیال کے قائل ہیں کہ چار ماہ کے بعد طلاق خود بخود واقع نہیں ہوگی، ان کا کہنا ہے کہ اس مدت کے گزر جانے کے بعد شوہر سے رجوع کرنے کے لیے کہا جائے گا، اگر وہ ایسا کر لیتا ہے تو فبہا ورنہ اسے طلاق دینی ہوگی۔ اگر وہ خود سے طلاق نہیں دے گا تو حاکم اس کو ایسا کرنے کے مجبور کرے گا۔ البتہ یہ طلاق رجعی ہوگی اور اسے عدت کے اندر رجوع کرنے کا حق ہوگا[2]۔ اس مقصد کے لیے حاکم اسے قید بھی کر سکتا ہے تاکہ وہ طلاق دینے کے لیے مجبور ہو جائے[3]

'ایلاء' ہی کے سلسلے میں یہ بحث بھی ہے کہ اگر شوہر قسم کے بغیر بیوی سے ہم بستری کرنا چھوڑ دے تو آیا اس پر ایلاء کے حکم کا اطلاق ہوگا یا نہیں۔ تو جمہور فقہا کا یہ کہنا ہے کہ قسم کے بغیر اس کے اوپر ایلاء کا حکم لاگو نہیں ہوگا۔ لیکن امام مالکؒ کا کہنا ہے کہ ہم بستری چھوڑنے سے اس کا مقصود بیوی کو نقصان پہنچانا ہے، تو اس کے اوپر بھی اس کا حکم لاگو ہوگا۔ اگرچہ اس نے ایسا کرنے کی قسم نہ کھائی ہو[4]۔ یہی بات مصالح ازدواج سے زیادہ ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے کہ اگر شوہر بیماری، یا اسی طرح کی کسی دوسری حقیقی مجبوری کے بغیر معمول کے حالات کے علاوہ بیوی سے مذکورہ مدت سے زیادہ خاص تعلق کو توڑے رکھتا ہے تو اس پر بھی ایلاء کے حکم کا نفاذ ہونا چاہئے۔ حضرت عمر ابن الخطابؓ کے مشہور واقعے سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے۔ آپ کے دور خلافت کا مشہور واقعہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ۱/۲۶۸/ [2] حوالہ سابق /۲۲۸، ۲۶۹۔ [3] زاد المعاد: ۵/۳۴۶۔ [4] بدایۃ المجتہد: ۲/۱۰۱

ہے کہ ایک رات حسب معمول جب آپ گشت کے لیے نکلے تو شوہر کی جدائی سے پریشان ایک عورت کو آپ نے یہ اشعار پڑھتے ہوئے سنے:

تطاول ھذا اللیل واسود جانبہ   وارّقنی ألا خلیل اقاربہ

رات لمبی ہے اور ہر طرف تاریکی پھیلی ہوئی ہے   اور میری نیند اچاٹ ہے کیونکہ کوئی ساتھی نہیں جس سے میں لطف اندوز ہو سکوں

فواللہ لولا اللہ انی اراقبہ   لحرک من ھذا السریر جوانبہ

پس خدا کی قسم اگر یہ بات نہ ہوتی کہ مجھے اس کا ہر وقت دھیان ہے   تو اس چارپائی کے کنارے تیزی سے ہلتے ہوتے

واپس آنے پر آپ نے اپنی صاحبزادی حضرت حفصہؓ سے دریافت کیا کہ زیادہ سے زیادہ ایک عورت اپنے شوہر سے کتنے دنوں صبر کرسکتی ہے؟۔ انھوں نے جواب دیا کہ چھ مہینے یا چار مہینے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ اب میں اپنے لشکر والوں میں سے کسی کو اس مدت سے زیادہ اہل و عیال سے دور نہیں رکھے رہنے دوں گا۔ یہ واقعہ مختلف طریقوں سے مروی ہے اور بہت مشہور ہے[1]

ایلار کی اس بحث سے بھی صاف واضح ہے کہ پردیس کی ایسی زندگی، جس میں شوہر بیوی کو تنہا چھوڑ کر چار چھ ماہ کے لیے نہیں بلکہ سال سال دو دو سال بلکہ بسا اوقات اس سے آگے چار چار آٹھ آٹھ اور دس دس سال کے لیے سینکڑوں ہزاروں میل دور پڑا رہے، اسلام کے معاشرتی نظام کے لیے بالکل اجنبی ہے۔ جس کی وہ کسی صورت تائید نہیں کرسکتا اور جو اس کے لیے کسی صورت قابل قبول نہیں۔

خلاصۂ کلام: پردیس کی زندگی کے سلسلے میں اسلام کے اس رویے کی تفصیل سے واضح ہے کہ مرد بیوی بچوں کے بغیر گھر سے سینکڑوں اور ہزاروں میل دور، سالوں کے لیے تنہا پڑا رہے اور اسے اپنی زندگی کا مستقل معمول قرار دے لے، اسلام اس کی اجازت دینے کے لیے کسی صورت تیار نہیں ہے۔ اسلام اپنے اہل و عیال اور قریبی خاندان کے تئیں مرد کی جو بہت سی ذمہ داریاں قرار دیتا ہے، ان کی ادائگی کا ناگزیر تقاضا ہے کہ مرد ہمیشہ بیوی بچوں کے ساتھ رہے اور ان کے اوپر اپنی نگرانی برابر قائم رکھے۔ دن کے اوقات میں اگر وہ روزی روٹی کی تلاش میں گھر سے دور رہے تو رات کو ان کے درمیان واپس ضرور آجائے۔ تلاش معاش کے ساتھ دینی زندگی کے دوسرے مختلف تقاضے ہیں جن کے تحت آدمی کو قدم گھر سے باہر نکالنے اور بال بچوں سے دوری اختیار کرنی ضروری ہے، لیکن اسلام کی مطلوبہ معاشرتی زندگی میں یہ وقفے انتہائی مختصر اور ناقابل لحاظ ہونے چاہئیں کہ اہل و عیال کے اوپر سے مرد کا دینی اور اخلاقی دباؤ متاثر نہ ہونے پائے۔ اور وہ اپنی قوامیت، اور پورے گھر کا نگراں اور نگہبان، "راعی" ہونے کی حیثیت سے اپنی متعلقہ ذمہ داریوں سے پوری طرح عہدہ برآ ہو سکے۔ (ختم شد)

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۷۹۔ حافظ ابن کثیر نے یہ اثر موطا امام مالک کے حوالے سے نقل کیا ہے، جو غالباً ان کا سہو ہے۔ موطا امام مالک میں یہ واقعہ کہیں نہیں ملا۔

یکساں سول کوڈ

تاریخ کے پس منظر میں

(۳)

پروفیسر عمر حیات خاں غوری

اقلیتوں میں عدم تحفظ کا احساس :- ان حالات نے اقلیتوں کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص ایک عجیب ذہنی کشمکش اور ناآسودگی کے ماحول میں مبتلا کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے ایک شدید قسم کے عدم تحفظ کا احساس ان کے ذہنوں پر مسلط ہو کر رہ گیا ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا یہ وہی ہندوستان ہے جس میں وہ صدیوں سے اپنے اہل وطن کے ساتھ ہمدردوں، غم گساروں اور بھائیوں کی طرح رہتے چلے آرہے تھے۔ ان کے سامنے یہ مسئلہ ایک بڑا سوالیہ نشان بن کے ابھرا ہے کہ آخر کیا اسباب ہیں جن کی وجہ سے اس ملک میں نہ ان کی عزت و آبرو محفوظ ہے نہ عصمت و عفت، نہ ان کے گھر محفوظ ہیں نہ کاروبار، نہ ان کی زندگیاں محفوظ ہیں نہ دین و ایمان، نہ ان کی زبان محفوظ ہے اور نہ تعلیمی ادارے، نہ ان کی تہذیب و ثقافت محفوظ رہی اور نہ ان کا پرسنل لاء اور اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ان پر یکساں سول کوڈ نافذ کرکے رہی سہی کسر بھی پوری کرنے کے منصوبے بنائے جارہے ہیں۔ پھر یہ بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آرہی ہے کہ آخر دستور ہند میں دئے گئے بنیادی حقوق کی یہ درگت کس بنا پر بنائی جارہی ہے۔ اور انہیں ان کے حق سے آخر کس جرم کی پاداش میں محروم رکھا جارہا ہے۔ ملک کے فرقہ وارانہ فسادات کا تسلسل جن میں اکثر و بیشتر صرف مسلمانوں کا نقصان ہونا انھیں کو گرفتار کرکے مقدمات میں پھنسانا اور ان کے معاشی مراکز کو تباہ و برباد کرنا آخر کس منصوبے کا جزو ہے۔ پھر وہ اس کشمکش میں بھی مبتلا ہیں کہ فرقہ پرست عناصر کا ان کی معیشت کو تباہ کرنے اور سرکاری و نیم سرکاری ملازمتوں

سے مسلمانوں کو دور رکھنے کی حکومت کی پالیسی میں آخر کس قسم کا تال میل قائم ہے۔ یہ وہ اہم ترین سوالات ہیں جنھوں نے ملک کی سب سے بڑی اقلیت اور کو ذہنی خلفشار میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہاں تک کہ بعض وقت وہ یہ تک سوچنے کے لیے مجبور ہوئے کہ انھیں دوسرے درجے کا شہری بنانے کی باقاعدہ مہم کا تو آغاز نہیں کیا گیا ہے؟ سکھ قوم کا موجودہ اضطراب بھی اسی ناآسودگی اور عدم تحفظ کا پیدا کردہ ہے۔ عیسائی اور پارسی اقلیتیں بھی اپنے حال سے مطمئن نہیں ہیں۔ اسی ملک کی لسانی وتہذیبی اقلیتیں بھی اپنی زبان اور تہذیب کو شدید خطرات میں گھرا محسوس کرنے لگی ہیں۔ جس کے نتیجے میں جنوبی ہند میں ہندی اور ہندی تہذیب کے خلاف ردعمل شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

الغرض ملک کی پوری آبادی شدید قسم کی ناآسودگی اور عدم تحفظ کی لعنت میں مبتلا ہو کر رہ گئی ہے۔ اس ملک کی مذہبی، لسانی اور تہذیبی اقلیتوں میں سے کوئی نہیں جو اپنے حال پر مطمئن اور خوش ہو۔ یہاں تک ہے کہ ملک کی ۸۰ فیصدی اکثریت بھی عدم تحفظ اور داخلی انتشار کی ایک ایسی بحرانی کیفیت میں مبتلا ہو چکی ہے جو ملک کے مستقبل کے لیے شدید قسم کے خطرات کا باعث بن سکتی ہے۔ اور جب کسی ملک کی اکثریت ہی خطرات کے احساسات میں گھر چکی ہو تو پھر اس ملک کی اقلیتوں میں کس طرح امن وآشتی کا ماحول باقی رہ سکتا ہے۔ کسی بھی ملک کی اقلیتوں میں امن وسکون پیدا کرنے کے لیے اہم ترین اور بنیادی ضرورت ملک کی اکثریت کے دلوں میں وسیع النظری، وسیع القلبی، رواداری اور اقلیتوں کے محافظ ہونے کا احساس کے ساتھ ساتھ انسان دوستی کے جذبات کا پیدا ہونا لازمی ہے۔

حاصل مطالعہ:- تاریخ کے تناظر میں حالات کے اس اجمالی مطالعہ سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف جو حالات پیدا ہو رہے ہیں وہ اتفاقی نہیں بلکہ شاید سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پیدا کئے جا رہے ہیں اور یکساں سول کوڈ کا نفاذ منزل نہیں بلکہ محض اس کا ایک مرحلہ ہے۔ تاکہ اس ملک سے مسلم معاشرہ کی انفرادیت کو ختم کر کے انھیں اپنے مذہب سے بے تعلق کر دیا جائے۔ اس لیے کہ اس ملک میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو اپنی اصلی شکل میں آج بھی موجود ہے اور مسلمان ہی وہ قوم ہے جو اپنے مذہب کے معاملے میں کسی مصالحت کے لیے تیار نہیں۔

مسلمانوں میں خانقاہیت کی حوصلہ افزائی:- ایسی صورت میں مسلمانوں کو نرم نوالہ بنانے

کے لیے ارباب اقتدار کی پالیسی یہ معلوم ہوتی ہے کہ،

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

اس لیے شرع پیغمبر کے آشکارہ ہونے اور مسلمانوں کو عالم کردار سے بیگانہ رکھنے کے لیے یورپ سے بنیاد پرستی کی اصطلاح کو درآمد کیا گیا۔ تاکہ اس ملک میں ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے جس میں اسلام کی اساسیات کو زیر بحث لائے بغیر اسلام کے خانقاہی تصور کی اشاعت کرتے ہیں ان کے ان کا حکم ہے۔ ؎

ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

اس لیے ؎

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

تاکہ سوشلسٹ سماج کی تشکیل کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ دور ہو سکے۔

مسلمانوں کے لیے دو جال: اس تاریخی مطالعہ سے یہ حقیقت بھی عیاں ہے کہ اس وقت ہندوستان کی اقلیتیں بالعموم اور امت مسلمہ بالخصوص دو جالوں کے بیچ میں پھنسی ہوئی ہے۔ ایک جال ہندوؤں کی فرقہ پرست قیادت کا تیار کردہ ہے۔ جس کے مطابق وہ ملک کی پوری آبادی کو ہندو بنا ڈالنے کے منصوبے بنا رہی ہے دوسرا جال ملک کے اس سیاسی گروہ کا تیار کردہ ہے جو ملک میں سوشلزم لانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ کو اگر اکثریت کے ایک طبقہ کی حمایت حاصل ہے تو دوسرے کو حکومتی وسائل اور روس جیسی حکومت کی حمایت حاصل ہے اور چونکہ فرقہ پرست گروہ بھی حکومت کے مقاصد میں معاون ہو رہا ہے اس لیے دونوں گروہوں میں تعاون و تعامل جاری ہے۔ اور اس لیے ایک دوسرے کو تعاون فراہم کر رہے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ جس وقت ان دونوں گروہوں کے درمیان سے مسلمانوں کے دفاع کا ہاتھ اٹھالیا اور حکومت نے کھلے طور پر سوشلزم کو نافذ کرنا شروع کر دیا اس وقت ان دونوں گروہوں میں جو خوفناک ٹکراؤ ہوگا شاید اس کی مثال ملنا مشکل ہوگی۔ اور یہ نتیجہ ہوگا اس عاقبت نا اندیشانہ مذہبی جذبات کا جو اس وقت مسلمانوں کے خلاف ہندو قوم میں بھڑکائی جا رہی ہے۔

ہندو دھرم کی تباہی کا انتظام:۔ رہا اکثریت کا معاملہ تو وہ اس ملک میں اشتراکی حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے میں کوئی رکاوٹ ثابت نہیں ہوتی۔ اول تو اس کے بعض فرقہ پرست لیڈروں نے اس قوم کو مسلم دشمنی کی شراب پلا کر مدہوش کر رکھا ہے۔ پھر مسلسل فرقہ وارانہ فسادات اور ٹکراؤ اس کی قوتوں کو غلط سمت میں مصروف رکھے ہوئے ہیں تیسرے خود ان کے اندر اونچی اور نیچی ذاتوں میں ٹکراؤ اور انتشار کا ماحول ہے۔ اور چونکہ اس گروہ نے ہندو قوم کے کسی مذہب ہی کی نفی کر نا شروع کر دیا ہے۔ اور کہنے لگے ہیں کہ وہ کوئی مذہب ہے ہی نہیں بلکہ محض ایک تہذیب کا نام ہے جو مختلف اقسام کے عناصر کے اجتماع سے وجود میں آئی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔

> درحقیقت یہ (ہندو دھرم) بہت سی قوموں، بہت سی تہذیبوں اور بہت سے ایمانیات کا مجموعہ ہے۔ ہندو ازم ایمانیات کا دفاق ہے۔ سماجی اور تہذیبی دھاروں کے باہمی اتصال سے اس کی تخلیق ہوئی ہے (السٹریٹڈ ویکلی۔ ۱۵ر جون ۱۹۸۰ء)

ہندو قوم کو سوشلزم کے لیے تیار کرنا:۔ اس طرح ہندو قوم کے دانشوروں نے اس کے مذہب ہونے ہی کی نفی کرنی شروع کر دی ہے۔ اور اسے محض ایک ارتقاء پذیر تہذیب بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ تاکہ ہندو قوم مستقبل کی ہر تبدیلی کو قبول کرتی چلی جائے۔ دوسری طرف مسلم دشمنی کا نشہ اس قوم پر اس قدر چڑھا دیا گیا ہے کہ اب وہ اپنے مذہب اور مذہبی قانون کو چھوڑ کر یکساں سول کوڈ کی دہلیز پر آ چکی ہے۔ اسپیشل میرج ایکٹ، قانون فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ اور ہندو کوڈ بل اسی سمت میں پیش قدمی ہے۔ کیا مسلم دشمنی کی اس سے بڑی بھی کوئی قیمت ہو سکتی ہے۔؟

ہندو قوم کی موجودہ قیادت:۔ محسوس ایسا ہوتا ہے کہ ہندو قوم کا فرقہ پرست گروہ مذہب سے زیادہ سیاست زدہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اور اس نے ملک کی ایسی قوتوں سے تال میل کر رکھا ہے جو یہاں سوشلزم کے نام پر اشتراکی معاشرہ پیدا کرنے میں کوشاں ہیں۔ اس لیے یہ گروہ ہندو قوم کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر اپنے سیاسی مفادات اور مقاصد حاصل کرنے میں لگا ہوا ہے۔

سوشلزم کے لیے تر نوالہ:۔ ہندو دھرم کے مذہب ہونے کی نفی ہو جانے کے بعد سوشلزم کے قیام کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں

رہتی۔ کیونکہ مذہب ہی سب سے بڑی رکاوٹ تھی جس پر قابو پالیا گیا ہے۔

رہا تہذیب کا معاملہ تو اس بارے میں موجودہ سوشلسٹ سماج اور قدیم ہندو تہذیب میں کوئی زیادہ مغائرت معلوم نہیں ہوتی۔ قدیم ہندو تہذیب کی بنیاد بہت کچھ مادہ پرستی پر استوار تھی جو لنگشی پرستی کی شکل میں آج بھی موجود ہے۔ اس معاشرہ کی بڑی خصوصیت جنس پرستی تھی جس کا ثبوت شو لنگ کی پوجا اور دیوی دیوتاؤں کی جنسی کہانیاں ہیں۔ پھر جنس پر مبنی تانترک شاشتر اور پنڈت واتسیائن کا کام شاستر بھی اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اور قارئین واقف ہیں کہ ان دونوں فلسفوں سے متعلق کتنی کتب اور رسائل کا سیلاب سا ملک میں آیا ہوا ہے۔

چونکہ جدید سوشلسٹ سماج کی بنیادیں بھی یہی دو یعنی مادہ پرستی اور جنس پرستی ہوتی ہیں اس لیے سوشلسٹ معاشرہ پیدا کرنے کے لیے قدیم ہندو تہذیب کے احیا کا نام آسانی کے ساتھ بطور آلۂ کار کے اختیار کیا جا سکتا ہے۔

حکومت کی پالیسی :۔ جہاں تک حکومت کی پالیسیوں کا تعلق ہے وہ ایک غیر محسوس منصوبہ کے تحت سوشلزم (اشتراکیت) کی جانب پیش قدمی جاری رکھے ہوئے ہے۔ مذکورہ بالا قوانین کا نفاذ اسی جانب تدریجی سفر ہے۔ اس کے علاوہ وسائل معیشت کو قومیانا، بڑی بڑی فیکٹریاں قائم کرنا، ملک کے ہر شہری کو سرکاری ملازم بنا ڈالنے کے منصوبے بنانا، ملک میں آزادی کے بعد سے ایک ہی جماعت کی مسلسل حکمرانی اور حزب اختلاف کو بے بس اور بے حقیقت بنا ڈالنا، ایک ہی سمت کے سفر کی مختلف منزلیں ہیں۔ پھر ملک میں ہونے والے ہر ٹکراؤ اور فساد کو مذہب کے نام اعمال کو سیاہ کرنے کے لیے استعمال کرنا تاکہ عوام میں مذہب کے وجود ہی سے نفرت پیدا ہو جائے اور ہندو دھرم کے صرف انھیں گوشوں کی تشہیر کرنا جو سوشلسٹ سماج کے لیے معاونت کریں اور انہیں دیوی دیوتاؤں کی پوجا پاٹ کو عام کرنے کی کوشش کرنا جنھیں تنتر شاشتر کے دیوی دیوتا تسلیم کیا جا چکا ہے۔ نیز ہندو قوم کی اخلاقی اور روحانی تعلیمات کو نظر انداز کر دینا بھی اکثریت کی مذہب نا سیاست زدہ قیادت اور حکمراں گروہ کے اس ذہن کی غمازی کرتا ہے جو سوشلسٹ سماج کے قیام کے لیے ضروری ہے۔ اسی مرحلہ کی آخری منزل یکساں سول کوڈ ہوگا جس کے نتیجے میں ملک میں پائے جانے والے سارے

ہی مذاہب کی باقیات کو ملک بدر کر کے سوشلزم کے سب سے بڑے دشمن (مذہب) سے نجات حاصل ہو سکے گی۔ اس مرحلہ میں کامیاب ہونے کے بعد سوشلزم کے قیام کا باقاعدہ اور کھلے طور پر آغاز ہو جائے گا۔

کمیونسٹوں کی خاموشی:۔ بسا اوقات محسوس ہوتا ہے کہ شاید ہمارے ملک کو اشتراکی روس سے جو فیاضانہ اور فراخدلانہ مالی ٹیکنیکل اور دفاعی امداد مل رہی ہے۔ اس امداد کی ایک اہم وجہ غالباً یہ بھی ہوگی کہ اس ملک میں اشتراکیت کے لیے فضا تیار کی جائے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہاں کیمونسٹ پارٹیاں صم بکم بنی ہوئی تماشا دیکھ رہی ہیں۔ ملک کی آزادی کے متصل دور میں یہ جماعتیں مزدوروں اور محنت کشوں کے درد میں جس طرح تڑپ رہی تھیں اب اس کا کہیں کوئی وجود نظر نہیں آتا۔ نہ اب ان کی مزدور تنظیموں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ نہ ہڑتالوں کی خبریں پڑھنے کو ملتی ہیں، نہ سڑکوں پر حلق کی آخری سرحد سے نکلتے ہوئے نعرے سننے کو ملتے ہیں۔ اور نہ جلسوں میں ان کی دھواں دھار تقاریر سے فضا میں گونج پیدا ہوتی ہے۔ ان کا کوئی وفد حکومت سے ملتا ہے نہ اسمبلی اور پارلیمنٹ میں مزدوروں کی نمائندگی کرنے کی فکر ان میں کہیں نظر آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شائد ولی نعمت نے نے ہدایت کر رکھی ہے کہ وہ خاموش تماشائی بنے حالات سے لطف لیتے اور خوش ہوتے رہیں اور حکومت کے منصوبوں میں رکاوٹ پیدا نہ کریں اس لیے کہ وہ انھیں کے کام میں مصروف ہے

حکمراں گروہ کی حالت:۔ ملک میں حکمراں گروہ کی حالت بھی بڑی کسمپرسی کی ہے۔ ملک میں سیکولرزم نافذ کرتے وقت یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ یہاں ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ اور ہر مذہب کو زندہ رہنے کا حق دیا جائے گا۔ لیکن جب ملک میں سوشلسٹ سماج پیدا کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو اب انہیں مذہبی اکائیوں میں مذہب بیزاری پیدا کرنے کے منصوبے بنائے جانے لگے تاکہ ملک کی حدود سے مذہب کو نکال دیا جائے اور لطف یہ ہے کہ حکومت دونوں کام ایک ساتھ کرنا چاہتی ہے۔ دوسری جانب ملک کو فلاحی اسٹیٹ بنانے کے لیے ہر شخص کو ضروریات فراہم کرنے کی ضمانت دی گئی تو دوسری جانب انتخابات کے بھاری اخراجات سے مجبور ہو کر سرمایہ داروں کا سہارا بھی لینا پڑا اور اس طرح ملک میں سرمایہ داروں کا راج اس طور پر چل پڑا کہ غریب اس کے بوجھ تلے کراہتے رہ گئے۔ تیسری طرف مادی ترقی کو مطمع نظر بنانے کے نتیجہ میں حکومت نے اپنے سارے وسائل اس سمت اس طور پر شروع کر دیا کہ انسان کی تعمیر و تشکیل وغیرہ

کے مسائل یغرا ہم بن کے رہ گئے جس کے نتیجے میں پورے ملک میں مادہ پرستی، جنس پرستی، بد اخلاقی اور بے کرداری کا دور دورہ ہو کر رہ گیا ہے۔ پھر بدقسمتی سے ایسے ہی لوگ سیاست اور حکومت پر چھاتے چلے گئے جس کے نتیجے میں پورا ملک اخلاقی پستی اور کردار کے دیوالیہ پن کی دہلیز پر پہنچ چکا ہے۔ ملک میں سیکولر حکومت قائم کی گئی لیکن انتخابی حلقے امیدواروں کا تعین اور انتخابی لڑائی مذہب کی دہائیوں کے ساتھ لڑی جانے لگی۔ اس طرح خود حکومت کی پوری پالیسیاں نفاق کا شکار ہو کر رہ گئی ہیں اور اسی نفاق کے نتیجہ میں ہر طرف مسائل کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اور ہر نیا مسئلہ جو پیدا ہوتا ہے وہ اپنے ساتھ دوسرے بے شمار مسائل کو لے کر آتا ہے۔ پنجاب اور آسام کی تازہ مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

الغرض ملک مجموعی طور پر ایک ایسی منزل پر پہنچ چکا ہے جہاں اقلیت اپنے حال پر خوش اور مطمئن ہے نہ اکثریت اطمینان وسکون کا سانس لے رہی ہے۔ یہاں تک کہ خود حکومت بھی انتشار وافتراق اور خوف وعدم تحفظ کے حالات میں مبتلا ہوئی ہے۔

بہی خواہان وطن کی ذمہ داری :

ملک کے ان ناگفتہ بہ حالات میں انسانیت کا درد رکھنے والوں کی بنیادی ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ وہ اٹھیں اور ملک کو ان حالات سے نکالنے کے لیے اس موقعہ پر جو کچھ کر سکتے ہوں اس سے دریغ نہ کریں اور اس کشتی کو بچانے کی فکر کریں جس کا ناخدا ہی اس میں سوراخ کرنے لگا ہے۔ اور اس کی ایک ہی صورت ہے کہ ملک کی تعمیر خدا پرستی کی بنیاد پر کی جائے۔ اور معاملات زندگی کو مستقل قدار کا پابند بنایا جائے۔ ہندوستان ہمیشہ سے مذہبی ملک رہا ہے اور مذہبیت اس کے رگ وریشے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ باہر کے درآمد کئے ہوئے اجنبی نظریات کے مقابلہ میں ملک کا مذہبی سرمایہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ زندگی میں اس کو اس کا قرار واقعی مقام دیا جائے۔ (ختم شد)

اقلیت واکثریت

مسلمانوں نے چونکہ اپنے دین کو ایک عالمگیر تحریک کے بجائے ایک جامد قومی کلچر اور خود اپنے آپ کو ایک بین الاقوامی انقلابی جماعت کے بجائے محض ایک قوم بنا کر رکھ دیا ہے، لہٰذا اس کا نتیجہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان کے لیے تاریخ میں پہلی مرتبہ اقلیت واکثریت کا سوال پیدا ہوا ہے اور اس کے لیے یہ بات سخت پریشانی کا موجب بن گئی ہے کہ شماری کے اعتبار سے جب میں چار کے مقابلہ میں ایک کی نسبت رکھتا ہوں تو اب میں چوگنی تعداد کے غلبہ سے اپنے آپ کو کیسے بچاؤں؟

(اسلامی سیاست (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم) ص۵۵)

تراجم و اقتباسات :-

تحریکی کارکنوں سے چند باتیں

جناب نعیم صدیقی صاحب (مدیر ترجمان القرآن لاہور)

دوستو!

آپ کا مرکزی اور بنیادی فریضہ دعوتِ حق ہے جس کے متعلق قرآن میں آیا کہ: کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ، تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آلِ عمران ۱۱۰) یعنی خیرامت اور امت وسط اور مرکزی گروہ ہونے کا اعزاز صرف اس امر پر منحصر ہے کہ آپ لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں۔ یعنی نیکی کو دوسروں تک پھیلائیں اور اسے غالب کرنے کی سعی کریں اور برائی سے لوگوں کو بچنے کی اور اس کے اثر و تسلط کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔ یہ دعوت بیج ہے پورے نظامِ اسلامی کا۔ اور یہ دعوت دورِ کش مکش سے بھی گزارتی ہے، ہجرت کی وادیاں بھی طے کراتی ہے، جنگ کے میدان میں بھی لے جاتی ہے تاکہ نیکی اور سچائی کے غلبے کی مزاحمت کرنے والی فاسد قوتوں کو تلوار کے زور سے راستے سے ہٹا دیا جائے۔ گویا دعوت خود بھی ایک طرح کا جہاد ہے اور آگے یہ جہاد کے مختلف مراحل سے گزار کر کامل جہاد، یعنی قتال تک پہنچاتی ہے۔

دعوتِ حق کی ذمہ داری ہلکی اور آسان نہیں ہے۔ ہر قسم اور ہر سطح کے لوگوں تک، ان کی زبان اور ان کے مروّج اسالیب کے مطابق اس کو پہنچانا اور ابلاغ کے جو جو بھی پاکیزہ ذرائع حاصل ہوں ان سے کام لینا — یعنی دعوت بذریعہ صحافت، دعوت بذریعہ ادب، دعوت بذریعہ علوم، دعوت بذریعہ تعلیم، دعوت بذریعہ تصانیف، دعوت بذریعہ وسائل نشر و اشاعت، دعوت بذریعہ اجتماعات، دعوت بذریعہ مظاہرات، دعوت بذریعہ اُمورِ سیاسیہ، غرض کہ ہر سطح پر اور ہر وسیلے سے بھرپور کام کرنا مطلوب دین ہے۔

یہ سرسری ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اس کے لیے تنبیہ و تاکید اتنے سخت انداز سے کی گئی ہے کہ یہ نہیں تو گویا کچھ بھی نہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بروایت ترمذی قسم کھا کر فرمایا کہ: تم کو

لازمی طور پر معروف کا حکم دینا ہوگا۔ اور لازمی طور پر منکر سے روکنا ہوگا، ورنہ ایسا ہونے کا شدید اندیشہ ہے کہ اللہ تم پر سخت مصیبت نازل کرے۔ پھر تم اُسے پکارو اور تمہاری پکار نہ سنی جائے"۔

جو لوگ اقامتِ دین میں دیر لگتے دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں ان کو جاننا چاہئے کہ حصولِ مقصد کا دار و مدار اس کے مقرر کردہ طریقِ تسعی دعوت پر ہے۔ اگر آپ دعوت کو پھیلا کر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جلد سے جلد متاثر کرلیں تو غلبۂ دین بھی جلد ہوگا۔ اگر آپ کی رفتار دعوت سست ہوگی تو غلبۂ دین میں بھی دیر لگے گی۔

یہ بات بھی ذہن میں تازہ رکھئے کہ دعوتِ حق کا سب سے پہلا مخاطب داعی خود ہوتا ہے۔ اگر کوئی دعوت داعی کے اندر اتر کر اس کے تمام اقوال و افعال، لین دین، رشتوں اور دوستوں، دلچسپیوں اور عادتوں پر اثر انداز نہ ہو تو پھر وہ محض ایک ریاکارانہ واعظ ہے، جس کا کبھی گہرا اثر نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ آدمی کے لیے اولین دائرۂ کار اس کا گھر ہے۔ گھر کے لوگوں تک دعوت کو پہنچانا، ان کو معروف کے لیے تاکید کرنا اور منکر سے روکنا بروئے قرآن بھی ضروری ہے۔ اور حضورؐ کا اپنا اُسوہ بھی یہی ہے، داعی اگر اپنے گھر ہی میں وزن نہ پا سکے تو باہر زیادہ مشکل ہوگی۔ بعد ازاں بہت سے دوسرے وسیع تر دائرے آتے ہیں۔

دعوت کے بہت سے طریقوں میں سب سے اہم چیز انسانی رابطہ ہے۔ آپ اگر لوگوں سے ملاقاتیں کریں، انھیں اپنے ہاں بلائیں، گھنٹہ دو گھنٹہ بات کریں۔ ذاتی مسئلوں سے عالمی مسئلوں تک مل کر غور کریں اور کسی مناسب مرحلے پر دعوت کا موثر راستہ بنائیں تو یہ بہترین صورت ہے۔ محض چلتے چلتے بات کر دینا یا کوئی پمفلٹ پھینک جانا یا محض جلسوں میں اپنے اسٹیج سے حسبِ دل خواہ باتیں سنا لینا اتنا زیادہ کارگر نہیں ہے۔ آپ لوگ تجربہ کے طور پر دو دو چار چار افراد کے وفد بنا کر ہفتے میں ایک دو بار آس پاس کے دیہات یا آبادیوں میں نکلیں، کبھی دیہی بستیوں کے درمیان ایک روزہ، دو روزہ یا سہ روزہ کیمپ لگا کر چاروں طرف پارٹیاں روانہ کریں۔ ان تجربوں سے آپ کو نئے راستے ملیں گے اور نیا اعتماد حاصل ہوگا۔

بیت المال چاہے وہ دو چار دس روپے تک ہی محدود ہو، کسی گاؤں یا تحصیل یا ضلع کا ہو یا صوبہ یا مرکز کا، یا خدائی اور خدمتی کاموں کے لیے کوئی امانتی فنڈ آپ کی تحویل میں ہو تو اس کے بارے میں حد درجہ محتاط رہیں۔ کیونکہ اس کی نزاکت مالِ یتیم کی سی ہے۔ اس میں سے خرچ کریں تو بے جا طور پر اور غیر ضروری طور پر ایک پیسہ بھی زائد خرچ نہ ہونے دیں۔ اپنے مفاد کے لیے اس میں سے اپنے حق سے زیادہ نہ نچوڑیں۔ ایسی تنخواہیں اور ایسے مصارف نہ

لیں جو اسلامی قواعد کے لحاظ سے حدِ جواز سے زیادہ ہوں۔ بیت المال کے معاوضوں کے بل پر اپنے عزیزوں کو فائدے نہ پہنچائیں۔ اپنے رشتے داروں اور دوستوں کو بھرتی نہ کریں، خود فیصلہ کرنے کے بجائے کسی انصاف پسند اور بے لحاظ بورڈ کو تقرریوں اور برطرفیوں پر مقرر کریں۔ جس مقصد سے کوئی آدمی لینا ہو، اس کے لیے درخواستیں طلب کیجیے اور قابلیت و صلاحیت و تجربہ اور تحریکی شعور و اخلاق جدھر زیادہ ہو ادھر نگاہِ انتخاب اٹھائیے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے فرزند کو دائرہ استحقاق خلافت سے باہر رکھ کر خود جس روایت قائم کی تھی اور جسے بعد میں امیر معاویہؓ نے یزید کو جانشین مقرر کر کے توڑا تھا۔ اس روایت کو آپ حضرت عمرؓ کی تقلید میں از سرِ نو قائم و مضبوط کیجئے۔ بیت المال کا ایک ایک پیسہ بھی جو ناجائز طور پر خرچ کیا گیا یا اقربا پروری کے لیے استعمال کیا گیا۔ وہ خدانخواستہ کسی ذمہ دار شخص کو جہنم کی سیر کرا سکتا ہے۔ اسی ضمن میں بیت المال یا کسی نیک کام کے فنڈ کی ملکیتی اشیاء کے استعمال کا معاملہ ہے۔ آدھر کے سامان اور اسٹیشنری کو ذاتی استعمال میں لانا درست نہیں۔ بیت المال کی کوئی چیز اگر ذاتی قبضے میں رکھی گئی ہو تو اس کا ذاتی اور گھریلو استعمال ہرگز نہ کریں۔ اگر بیت المال کے دفتر کا کمرہ آپ کے پاس ہو یا کوئی مکان یا کسی طرح کی فٹنگ تو ساری چیزوں کا استعمال بہترین اسلوب سے کریں اور انھیں ہر نقصان سے بچائیں۔ لاپروائی سے خدائی امانت کا استعمال آخرت کے لیے باعثِ نقصان ہو سکتا ہے۔

خدارا اپنے آپ کو اس خطرے سے بچایئے اور اپنے ساتھیوں کو بھی باز رہنے میں مدد دیجئے۔

مالی معاملات میں ہمارے نقطۂ نظر پر بہت سا اثر ہمارے ماحول کا ہے اور اس کے ہر طرفہ دباؤ کا مقابلہ کرتے کرتے ہم بار بار جب تھک ہار جاتے ہیں، اس صورت میں دنیا اور دولت اور معیارِ زندگی کی کشش ہمیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ہر آدمی کو کوٹھی چاہیے، کار چاہیے، قالین چاہیئیں، صوفے چاہیئیں، کراکری چاہیے، شاندار لباس چاہیے، جدید آسائشیں چاہیئیں، شاندار تقریبات چاہیئیں۔ اور جماعت کے اندر کا ہر آدمی بھی ہزار پرہیز کے باوجود دُہرا دوہرا وقت صرف کر کے اور خاندان کے کئی افراد کی محنتیں جمع کر کے دن رات اپنے منصوبے کو پورا کرنے میں لگا رہتا ہے، ورنہ بچوں کی تعلیم مشکل ہے، ان کے رشتے لینا دینا مشکل ہے، نتیجہ یہ ہے اوّل تو ذہنی معروفیت تحریک سے زیادہ دوسری جانب ہے اور دوسرے یہ کہ آمدنیوں اور مصارف میں زیادہ سے زیادہ کے لیے جواز تلاش کرنے کا رحجان کام کرتا ہے۔

ہمیں تو قرآن نے بھلا ذریب دنیا سے بچنے اور دولت پرستی سے پرہیز کی بہ تاکید تعلیم دی ہے اور حضورِ نبی اکرمؐ نے بھی سخت انتباہ دیئے۔ قرآن و حدیث کے احکام آپ پڑھتے سنتے ہی رہیں۔ میں یہاں ایک ادیب کے خیالات بیان کرتا ہوں، جو تحریکِ اسلامی کا سپاہی نہ تھا اور نہ دعوتِ حق کا علم بردار، مگر بس ادب کے ذریعہ سچائیاں سامنے لانے کا مشن رکھتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ "دنیا پرستی اور سچا ادب ایک دوسرے کے ساتھ نہیں چل سکتے"۔ میں مرحوم ادیب

سے دوستی کے باوجود کئی پہلوؤں سے اس سے اختلاف رکھتا ہوں، مگر بعض باتوں کا قدردان ہوں جن میں سے ایک یہ ہے۔ ذرا سنئے:

"ادیب کے لیے ایک مخصوص معنوں میں تارک الدنیا ہونا لازمی ہے۔ آپ ادیب بننے کی تمنا اور افسر بننے کی تمنا اور کوٹھی اور کار کی تمنا اور بینک بیلنس کی تمنا، اور سب سے خوشگوار تعلقات رکھنے کی تمنا کو ایک سینے میں جمع نہیں کر سکتے۔"

"سوال یہ ہے کہ تم معاشرے کو اپنی شرائط پر قبول کرنا چاہتے ہو یا معاشرے کو اس کی شرائط پر ماننے کے لیے تیار ہو، معاشرہ تمہیں سب کچھ دینے کے لیے تیار ہے اور دے سکتا ہے، مگر اس کے لیے تمہیں اس کے شرط نامے پر دستخط کرنے ہوں گے۔"

"اب کو میں نے کبھی صرف لکھنا لکھانا نہیں سمجھا، ادب ایک طرز حیات ہے اور اپنی تکمیل کے لیے صوفیوں جیسی ریاضتوں اور مجاہدوں کا طالب ہے۔ زندگی میں کامیابی کا راستہ، ادب کا راستہ نہیں ہے۔ یہ دو مختلف منزلیں ہیں اور دونوں کے راستے جدا جدا ہیں اور دونوں کے درمیان میں انتخاب کا مسئلہ ہے بہت سے لوگوں نے ادب کو طرز حیات بنانے کے بجائے کاروبار بنایا اور اس میں کامیاب ہوئے تم بھی ایسے ادیب بننا چاہو تو شوکت صدیقی جیسے لوگوں کی پیروی کرو۔"

"میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آڈن کے الفاظ میں ادیب کو کوئی ایسا چھوٹا موٹا پیشہ اختیار کرنا چاہئے، جو اس کا زیادہ وقت نہ لے اور جس کے ذریعہ وہ معاشرے میں عزت کی ایک متوسط زندگی گذار سکے۔ اسے نہ اتنا آرام ہو کہ سو جائے اور نہ اتنی تکلیف کہ سوچنا بھی مشکل ہو جائے۔"

ان اقتباسات میں سے لکھنے اور ادب اور تخلیق کے الفاظ نکال کر تحریک اسلامی اور دعوت اسلامی کے الفاظ رکھ دیجیے، اور پھر اس معیار پر سوچیے کہ کیا روح خدا پرستی کے ساتھ آخرت کے لیے کام کرنے والے ہم لوگوں میں دولت اور دنیا کے بارے میں ویسا احساس تقویٰ موجود ہے جیسا کہ ادیب کے یہاں پایا جا رہا ہے؟ ہم لوگ ہر اس چیز اور لذت کو حاصل کرنے کے درپے ہیں۔ اور ہر اس رسم کو پورا کرنے میں لگے ہیں جو معاشرے میں رائج ہے۔ خون پسینہ ایک کر کے اور تحریک کا نقصان کر کے ہم "دنیا" کا وہ پورا معیار حاصل نہیں کر سکتے، لہٰذا یہ ناقابل عمل حسرتیں بھی ہمارے ذہنوں میں کنکھجوروں کی طرح اپنے ہزار پا گاڑے ہوئے ہیں۔ سادہ زندگی کی کوئی لکیر ہم اپنے لیے نہ کھینچ سکے کہ یہاں تک جا کر لازماً رک جانا ہے۔ کچھ چیزوں اور رواجوں کے متعلق اپنے اوپر یہ پابندی لگاتا کہ ان کو ہمارے گھروں میں داخلہ نہیں مل سکتا۔ حتیٰ کہ مغرب کی ملحدانہ اور مادہ پرستانہ تہذیب جس سے ہماری اصل لڑائی ہے، اس کے غشوں واطوار بھی ہم بتدریجاً قبول کر رہے ہیں۔ ہمارے لوگوں کو دیکھ کر محسوس نہیں ہوتا کہ خدا کے یہ بندے کچھ ایسے بندے ہیں جنہوں نے ایک مقصد عظیم کے لیے اپنے آپ کو ایک صاف ستھری مگر درویشانہ زندگی میں محدود کر لیا ہے۔ "لا تحبوا الدنیا" کی پکار روز ہماری مسجدوں میں بلند ہوتی ہے، مگر دنیا کی کون سی چیز یا اس کی کون سی مقدار ہے جس کے لیے ہمارے دروازے بند ہوں۔ مسلمان کے پاس زیادہ دولت آتی ہے تو وہ اس کے اخراجات کو بڑھانے کے بجائے اس کے جذبہ انفاق کو بڑھاتی ہے اور انفاق ہی دولت پرستی اور حب دنیا کا واحد علاج ہے۔ (بشکریہ ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۸۶ء)

تنقید وتبصرہ :۔

حرف معتبر۔ شاعر احمد منیر۔ صفحات، ۱۰۴
قیمت درج نہیں۔ کتابت طباعت، معیاری۔ ناشر۔ مسلم بک سینٹر برمنگھم (برطانیہ)

برطانیہ میں اردو ادب کی جو لوگ آبیاری کر رہے ہیں احمد منیر ان میں نمایاں ہیں۔ حرف معتبر احمد منیر کی دینی اور ملی نظموں کا مجموعہ ہے، اس میں پابند اور معریٰ نظمیں اور قطعات شامل ہیں۔

احمد منیر دہلی نژاد مہاجر ہیں، ان کی ہجرت کی پہلی منزل کراچی اور موجودہ منزل لندن ہے۔ لندن کے اجنبی ماحول اور غیر اسلامی حالات میں وہ اپنی ثقافت کے محافظ ہیں بلکہ اس کا ارتقا بھی چاہتے ہیں، وہ لندن کی شاہراہوں پر اس احتیاط کے ساتھ قدم اٹھاتے ہیں

شہر نیا ہے لوگ انجانے آخر کس کس کو اپنائیں
مل کر چلنے کی کوشش میں اپنا رستہ بھول نہ جائیں

حرف معتبر حمد و مناجات، نعت و قصائد، دعوت حق، احساسات اور ملی جذبات کا خوبصورت مرقع ہے۔ احمد منیر کے سفر کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے۔

اسی ہی کوئی بھول نہ ہو دل کو ٹٹولو — انصاف کی میزان میں اعمال کو تولو
یہ مصلحت آمیز تذبذب نہیں اچھا — حق جس کو سمجھتے ہو اسی راہ پہ ہولو

احمد منیر کو اپنے پیغام کی صداقت پر بڑا بھروسہ ہے، اس لیے ان کا جذبہ بھی بہت پاکیزہ ہے اور اس کا اظہار انھوں نے پرجوش طریقہ پر سلیقہ سے کیا ہے، جس میں بجائے خود ایک ندرت ہے۔

تم ہی نہیں آخری مسافر تمہارے بعد ایک سلسلہ ہے
تمہارے نقش قدم سلامت، نظر بلند سرفراز رکھنا
اترتی فصلیں، گزرتے موسم، کشاکش خیر و شر کا عالم
منیر نیکی بدی کے مابین ایک خط امتیاز رکھنا

سادگی اور پرکاری احمد منیر کی شاعری کا نمایاں وصف ہے، خیال کی بلندی کے ساتھ طرز ادا میں بھی جاذبیت اور نزاکت ہے۔ تسلسل اور روانی ہے۔ چھوٹی بحر کی ایک نظم یوم حساب کے یہ شعر دیکھئے۔

اپنے کئے پر لوگ پشیماں　　ہر اک خوف خدا سے لرزاں
سر پر آگ اگلتا سورج　　جسم تپش سے پانی پانی
پیاس کا عالم توبہ توبہ　　سالہا سال کا ایک دن ہوگا

احمد منیر کی شاعری صرف ان کے واردات اور سوز دروں کی تصویر نہیں ہے بلکہ اس میں معاشرہ کا دکھ اور درد اور ماحول کا کرب بھی شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سماج کے رستے ہوئے ناسوروں کے لیے ایک ساتھ نشتر اور مرہم بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ اے شاہ مدینہ، کوہ ندا، وادی کشمیر، بے گھر فلسطینی، انقلاب ایران، مجاہد صابرہ شتیلہ، اور شکست خواب ایسی نظمیں ہیں جن میں شاعر نے بڑی فنکارانہ مہارت کے ساتھ گردوپیش کو ٹٹولا ہے، مثلاً شکست خواب کے یہ اشعار ع

صلیب جاں ہوئی مٹی کی ناشناسائی　　تباہیوں کے فسانے بکھر گئے ہر سو
جھکی جھکی سی نگاہیں بجھے بجھے سے دل　　تھکے تھکے سے مسافر خجل خجل منزل
کئی صدی کی لگاتار کوششیں معدوم　　قبول کوئی عمل اب نہ مستجاب دعا
اذان اشہد ان لا الہ الا اللہ

یہ نظم تقسیم ہند کے بعد مہاجرت اور بعد میں اس سے پیدا ہونے والے افسوس ناک حالات کی بہترین عکاسی ہے۔ اے شاہ مدینہ میں بھی شاعر نے سجادہ نشینی اور قبر پرستی کے کمزور پہلوؤں کو بڑی خوبصورتی سے نشانہ بنایا ہے مگر کہیں کہیں احساس نے شدت اور پیرایۂ اظہار نے عمومیت اختیار کرلی ہے۔ پابند نظموں میں ایک آدھ جگہ الفاظ کے استعمال میں احتیاط نظر نہیں آتی مثلاً خیر الامم کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

ایک دستور اساسی جس میں ہم سب کی نجات　　اک شعور زندگانی اک نذارت، اک وعید

مصرعہ ثانی میں نذارت کا استعمال، عربی اردو کسی قاعدہ کے تحت نہیں آتا ہے۔ حرف معتبر ظاہری اور معنوی ہر قسم کی خوبصورتی لیے ہوئے ہے۔ بقول مجتبیٰ حسین "اس عہد خود فروشاں میں یہ ایک باضمیر آدمی کی باضمیر شاعری ہے" اردو میں اس معیار کی کتابت وطباعت کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔

پیام اقبال:۔　مولف محمد بدیع الزماں، صفحات ۲۰۰ کتابت طباعت غنیمت، قیمت:۔ چالیس روپے، ملنے کے پتے۔ بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ وغیرہ۔

زیر تبصرہ کتاب جناب محمد بدیع الزماں صاحب کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً علامہ اقبال

کے فکروفن پر لکھے گئے۔ مقدمہ اور دیباچہ کے علاوہ سولہ مقالات اس کتاب میں شامل ہیں جن میں تین مقالات اقبال کے فن سے بحث کرتے ہیں اور بقیہ تیرہ مقالات اقبال کے فکر پر روشنی ڈالتے ہیں مقدمہ نگار پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اقبال کا بحیثیت شاعر مطالعہ کرنے کی کوشش زیادہ ہونی چاہیے۔ کیونکہ ابھی تک اس پہلو پر نسبتاً کم توجہ نہیں دی گئی ہے۔

علامہ اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ مگر اقبال سے متعلق اب تک کی تحریروں میں جس عدم توازن کا احساس ہوتا ہے وہ قابل توجہ ہے۔ بلاشبہ اقبال فن برائے فن اور ادب برائے ادب کے قائل نہیں تھے، اقبال کو مقصد زندگی کا شعور حاصل تھا اور وہ اس کے مبلغ تھے اس تبلیغ کے لیے انھوں نے شعر کا پیرایہ اختیار کیا۔ اور شاعری کو جزو پیغمبری تصور کیا۔ اقبال کے یہاں فکر و فن کی حیثیت روح اور جسم کی ہے اور وہ ان دونوں کو ان کا واجبی مقام دیتے ہیں۔ اقبال نے جہاں بھی اپنے شاعر ہونے سے انکار کیا ہے وہاں یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ فن سے برات کر رہے ہیں بلکہ منشا یہ ہے کہ اصل حیثیت اس فکر کی ہے جو فن کے پیکر میں موجود ہے۔ ورنہ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اقبال کی عالمی شہرت تشکیل جدید الہیات اسلامیہ اور فلسفہ عجم وغیرہ سے زیادہ اردو اور فارسی کے منظوم کلام کی بدولت ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ پیام اقبال کے مولف نے اس کو محسوس کیا ہے، انھوں نے اقبال کے کلام کا تجزیہ کرنے کے لیے جو نہج اختیار کی ہے وہ بالکل راست ہے۔

حسب ذیل تین مقالات " اقبال کے کلام میں طلسم آفرینی، اقبال کی تشبیہات اور اقبال کے کلام میں مصوری اور پیکر تراشی میں کلام اقبال کا تجزیاتی مطالعہ اور محاسن کا عمدہ تعارف ہے۔ جبکہ مقالات میں خودی، وطنیت، تصوف، خواتین، شاہین مناجات، ساقی، ترغیب عمل نظریہ شاعری وغیرہ اقبال کے فکر کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے کے بعض مقالات مثلاً، وطنیت اور تصوف وغیرہ میں بحث و نظر کی گنجائش ہے۔

کتابت و طباعت کی خامیوں کے علی الرغم کتاب لائق مطالعہ ہے۔ البتہ قیمت کچھ زیادہ ہے، شاید ادبی کتابوں کی روایت یہی ہو گئی ہے۔ (مسعود عالم قاسمی)

نوٹ:۔ تبصرہ کے لیے کتاب کے دو نسخے بھیجے جائیں۔ (مدیر)

اللہ و رسول کی پکار پر لبیک کہو جب کہ وہ تمہیں بلاتا ہے اس چیز کی طرف جس میں کہ تمہارے لئے زندگی ہے (قرآن)

ماہنامہ

زندگی نو

نئی دہلی

جلد ۷ ✻ نومبر ۱۹۸۷ء مطابق ربیع الاول ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ ✻ شمارہ ۵

فہرست مضامین

ادارتی امور کے لئے خط و کتابت کا پتہ :
مدیر "زندگی نو" پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ترسیل زر و انتظامی امور کے لئے :
منیجر ماہنامہ زندگی نو، ۱۵۲۵، سوئیوالان نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

● سالانہ زر تعاون -/۵۵ روپے ● (بیرون ہند) -/۲۲۵ روپے انڈین ● فی شمارہ =/5 روپے ●

سرخ نشان، علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لئے فوری زر سالانہ ارسال فرمائیں یا اگلا شمارہ کسی اطلاع کے نہ ملنے پر بذریعہ وی۔ پی ارسال کیا جائے گا۔

پرنٹر و پبلشر، محمد حبیب اللہ قادری نے دعوت ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی جانب سے جمال پرنٹنگ پریس، جامع مسجد، دہلی ۶ میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ "زندگی نو" ۱۵۲۵، سوئیوالان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا گیا فون: ۲۷۳۲۲۸ ★ ۲۶۵۳۱۳

اشارات :- بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خدمت خلق

(وقتی خدمت کی اہمیت اور فضیلت)

سید جلال الدین عمری

خدا کے بندوں کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی کوئی ایک شکل نہیں ہے، اس کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں ایک صورت یہ ہے کہ وقتی طور پر انسانوں کی ضروریات پوری کردی جائیں۔ بعض اوقات انسان وقتی اور ہنگامی مدد کا سخت محتاج ہوتا ہے۔ اس میں تھوڑی سی غفلت بھی اسے سخت نقصان پہونچا سکتی ہے۔ اسلام نے اس نزاکت کو محسوس کیا ہے اور ترغیب بھی دی ہے تاکید بھی کی ہے کہ خدا کے جس بندہ کو بھی جس وقت جس قسم کی مدد کی ضرورت ہو وہ فراہم کی جائے یہاں ہم وقتی اور ہنگامی تعاون کی بعض صورتوں کا ذکر کریں گے۔

کھانا کھلانا :-

وقتی مدد کی ایک شکل بھوکے کو کھانا کھلانا ہے۔ جو شخص بھوک سے تڑپ رہا ہو، اس کا حق ہے کہ اس کی بھوک فوراً مٹائی جائے۔ قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی، جو جنت کی ابدی نعمتوں کے حق دار ہوں گے، تعریف کرتے ہوئے ایک جگہ فرمایا ہے۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۝ إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ۝

(الدہر ۸ – ۱۰)

وہ کھانے کی خواہش اور ضرورت کے باوجود اسے مسکین یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں اور (کہتے ہیں) کہ ہم تو صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے تمہیں کھلا رہے ہیں۔ ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ۔ ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کا ڈر لگا ہوا ہے جو بہت سخت اور غصہ سے بھرا ہوا ہوگا۔

کسی بھوکے کو کھانا کھلانے کی فضیلت میں بہت سی احادیث مروی ہیں۔ یہاں صرف دو ایک حدیثوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا :

آیّ الاسلام خیر ؟	بہترین اسلام کیا ہے ؟

یہاں سوال غالباً اسلام کی ان نمایاں خصوصیات کے بارے میں تھا جن کا تعلق انسانوں کی خدمت اور ان کی فلاح وبہبود سے ہے۔ اس کے جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا :

تطعم الطعام وتقرئ السلام على من عرفت ومن لم تعرف[1]	یہ کہ تم کھانا کھلاؤ اور جاننے اور نہ جاننے والوں دونوں ہی کو سلام کرو۔

حضرت عبداللہ بن سلامؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو میں حاضر ہوا۔ جوں ہی چہرۂ مبارک پر نظر پڑی میں سمجھ گیا کہ یہ کسی جھوٹے انسان کا چہرہ نہیں ہے۔ پہلی بات جو آپ نے اس وقت فرمائی وہ یہ تھی۔

یا ایہا الناس افشوا السلام اطعموا الطعام وصلوا الارحام وصلّوا باللیل والناس نیام تدخلوا الجنة بسلام[2]	اے لوگو! سلام کو رواج دو اور اسے پھیلاؤ، بھوکوں کو کھانا کھلاؤ، رشتوں کو جوڑو، رات میں جب کہ لوگ سو رہے ہوں نماز پڑھو، امن وسلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

بھوکوں کو کھانا کھلانا بظاہر ایک چھوٹی سی خدمت ہے، لیکن کسی معاشرہ میں اس کی اہمیت کا احساس پیدا ہو جائے تو کوئی بھی شخص بھوک پیاس برداشت کرنے پر مجبور نہ ہوگا بلکہ ایسا معاشرہ فقر وفاقہ کا بہت آسانی سے اور بہت جلد علاج ڈھونڈ نکالے گا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے ابتدائی دور میں جب کہ اسلامی ریاست کی معیشت بہت زیادہ مستحکم نہیں تھی، بھوک اور افلاس کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے اور طریقوں کے ساتھ یہ طریقہ بھی اختیار فرمایا تھا۔ چنانچہ بھوکوں کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتے ہوئے آپ نے فرمایا :

---

[1] بخاری، کتاب الایمان، باب اطعام الطعام من الاسلام۔ مسلم، کتاب الایمان، باب تفاضل الاسلام وایّ اموره افضل۔ [2] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الزکوٰۃ، باب فی فضل الصدقۃ، بحوالہ ترمذی، ابن ماجہ، دارمی۔ اس سلسلہ کی مزید احادیث کے لیے ملاحظہ ہو۔ راقم کا مضمون۔ کمزور۔ اسلام کے سایہ میں، مطبوعہ ماہنامہ زندگی رام پور اگست، ستمبر ۱۹۷۸ء۔

طعام الاثنین کافی الثلاثۃ — دو آدمیوں کا کھانا تین کے لیے کافی ہے اور
و طعام الثلاثۃ کافی الاربعۃ[1] — تین آدمیوں کا کھانا چار کے لیے کفایت کرتا ہے

یہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت میں اس سے آگے کی بات کہی گئی ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

طعام الواحد یکفی الاثنین — ایک آدمی کا کھانا دو کے لیے کافی ہے اور
و طعام الاثنین یکفی الاربعۃ — دو آدمیوں کا کھانا چار کے لیے کافی ہے اور (اسی
و طعام الاربعۃ یکفی الثمانیۃ[2] — طرح) چار آدمیوں کا کھانا آٹھ کے لیے کافی ہے۔

اسی مفہوم کی ایک روایت حضرت عمرؓ سے بھی مروی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان طعام الواحد یکفی الاثنین — ایک آدمی کا کھانا دو آدمیوں کے لیے کفایت
و ان طعام الاثنین یکفی الثلاثۃ — کرتا ہے اور دو آدمی کا کھانا تین اور چار کے
والاربعۃ و ان طعام الاربعۃ — لیے کافی ہے اور چار آدمیوں کا کھانا
یکفی الخمسۃ والستۃ[3] — نو پانچ اور چھ کے لیے کافی ہے۔

ان روایات میں بظاہر دو مختلف باتیں کہی گئی ہیں، لیکن ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ پہلی حدیث میں کہا گیا ہے کہ جو کھانا دو آدمی سیر ہو کر کھا سکتے ہیں، اس سے تین آدمیوں کی ضرورت بآسانی پوری ہو سکتی ہے۔ بعد کی دو حدیثوں میں بتایا گیا ہے کہ ایک آدمی کا کھانا دو آدمیوں کے لیے کفایت کر سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس سے دونوں کو قوت حیات فراہم ہو سکتی ہے۔ اور دونوں زندہ رہ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے ان سب باتوں کا تعلق اشخاص اور حالات سے بھی ہے۔ ان احادیث میں اصلاً جس بات کی ترغیب دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے کھانے میں دوسرے بھوکے انسانوں کو شریک کرے اور یہ یقین رکھے کہ جو کچھ موجود ہے اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرمائے گا اور سب کی ضرورت پوری ہوگی۔

مسکینوں کی مدد کرنے اور بھوکوں کو کھانا کھلانے کا جذبہ جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا فرما رہے تھے اس کا اندازہ حضرت عائشہؓ کی ایک روایت سے ہوتا ہے۔ فرماتی ہیں کہ ایک

---

[1] بخاری، کتاب الاطعمہ، باب طعام الواحد یکفی الاثنین۔ مسلم کتاب الاشربہ، باب فضیلۃ المواساۃ فی الطعام الخ۔ [2] مسلم حوالہ سابق، ابن ماجہ، ابواب الاطعمہ، باب طعام الواحد یکفی الاثنین [3] ابن ماجہ حوالہ سابق۔

مرتبہ ایک بکری ذبح ہوئی اور تقسیم ہوگئی۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ کچھ گوشت بچا بھی ہے۔ میں نے عرض کیا۔ سوائے ایک شانہ کے کچھ نہیں بچا ہے۔ سب خیرات کر دیا گیا۔ آپ نے فرمایا نہیں! سب کچھ باقی ہے سوائے ایک شانہ کے[1] مطلب یہ کہ جو صدقہ کر دیا گیا اس کا اجر و ثواب تو محفوظ ہوگیا اس کے بارے میں یہ کیوں سمجھا جائے کہ وہ ختم ہوگیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں قربانی کا گوشت خشک کر کے کافی دنوں تک استعمال کرنے کا رواج تھا۔ قحط کے زمانہ میں آپ نے ہدایت فرمائی کہ تین دن سے زیادہ گوشت نہ رکھا جائے۔ اس کی وجہ حضرت عائشہ ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں۔

اراد ان یطعم الغنی الفقیر[2]	آپ یہ چاہ رہے تھے کہ جو صاحب حیثیت ہیں وہ فقراء کو (یہ گوشت) کھلائیں۔

مسکینوں کو کھانا کھلانا بعض صحابہ کرام کا ایک محبوب عمل تھا، اس سے انھیں کتنی دلچسپی تھی اور اس کا وہ کس قدر اہتمام فرماتے تھے اس کا اندازہ وہ دو ایک واقعات سے ہوسکتا ہے۔

حضرت نافعؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کسی مسکین کو کھانے میں شریک کئے بغیر کھانا تناول نہیں فرماتے تھے[3]۔

حضرت صہیبؓ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ غریبوں کو کھانا بہت کھلایا کرتے تھے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے تنقید کی تو انھوں نے فرمایا۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یقول خیارکم من اطعم الطعام ورد السلام فذالک الذی یحملنی علی ان اطعم الطعام[4]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ تم میں سے بہترین انسان وہ ہے جو غریبوں کو کھانا کھلائے اور سلام کا جواب دے۔ آپ کی یہی بات مجھے کھانا کھلانے پر آمادہ کرتی رہتی ہے۔

اس سلسلہ کا ایک بہت ہی موثر واقعہ ہمیں حدیث کی کتابوں میں ملتا ہے جس سے بڑی عبرت اور نصیحت حاصل ہوتی ہے۔

---

[1] ترمذی، ابواب صفۃ القیامہ ۲/۷۰، مسند احمد [2] بخاری، کتاب الاطعمہ، باب ماکان السلف یدخرون فی بیوتہم واسفارہم۔ [3] بخاری، کتاب الاطعمہ، باب المومن یاکل فی معی واحد [4] مسند احمد ۶/۱۶

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ فقر و فاقہ اور مصیبت میں گرفتار ہوں۔ آپ نے ازواج مطہرات میں سے ایک کے گھر سے اسے کھلانے کے لیے کچھ منگوایا۔ وہاں سے جواب آیا کہ اس وقت سوائے پانی کے کچھ نہیں ہے۔ پھر آپ نے دوسری زوجہ مطہرہ کے گھر بھیجا وہاں سے بھی یہی جواب آیا۔ اسی طرح باری باری سب ہی ازواج کے ہاں سے یہی اطلاع ملی کہ اس وقت کھانے کے لیے کوئی چیز نہیں ہے۔ آپ نے حاضرین سے فرمایا کہ کون اسے کھانا کھلائے گا اللہ اس پر رحم فرمائے۔ یہ سن کر ایک انصاری نے ۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ وہ حضرت ابوطلحہؓ تھے۔ فرمایا کہ میں یہ خدمت انجام دے سکتا ہوں۔ چنانچہ وہ اسے اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ بیوی سے پوچھا کہ تمہارے پاس کھانے لیے کچھ ہے اس نے عرض کیا کہ صرف بچوں کا کھانا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بچوں کو بہلا کر سلا دو۔ جب کھانا دسترخوان پر لگ جائے تو چراغ کو ٹھیک کرنے کے بہانہ اسے بجھا دو اور اس طرح ظاہر کرو جیسے ہم بھی کھا رہے ہیں۔ چنانچہ بیوی نے اس پر عمل کیا اور چراغ بجھا دیا اندھیرے میں میاں بیوی دونوں ظاہر کر رہے تھے کہ وہ کھانے میں شریک ہیں چنانچہ مہمان نے تو کھانا کھالیا اور یہ دونوں رات بھر بھوکے رہے۔ صبح رسول اللہ کی خدمت میں پہونچے۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تم دونوں کے رات کے کام سے بہت خوش ہوا ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔ (یعنی یہ آیت ایسے ہی موقع کے لیے ہے)

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (الحشر ۹)[1]	وہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ محتاج ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچالیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

کسی غریب کو کھانا کھلانے میں بیوی اور خادم کی طرف سے جو تعاون ملتا ہے اس کا انھیں بھی اجر ملے گا۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اذا اطعمت المرأة من بيت زوجها غير مفسدة فلها اجرها	جب عورت اپنے شوہر کے گھر سے نقصان پہونچائے بغیر کھانا کھلاتی ہے تو اسے اس کا اجر ملے گا

---

[1] بخاری، کتاب فضائل اصحاب رسول اللہ، باب قول اللہ عزوجل و یؤثرون علی انفسہم الخ
مسلم، کتاب الاشربہ، باب اکرام الضیف و فضل ایثارہ

ولہ مثلہ وللخازن مثل ذالک لہ — اسی کے مثل شوہر کو اجر ملے گا اور خازن کو بھی اتنا ہی اجر ملے گا۔

خازن کے سلسلہ میں ایک اور حدیث اسی مفہوم کی آتی ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

الخازن المسلم الذی ینفذ و بما قال یعطی ما امربہ کاملاً موفراً طیبۃ نفسہ فیدفعہ الی الذی امربہ احد المتصدقین۲ — جو مسلمان خازن اس حکم کو نافذ کرتا ہے۔ بسا اوقات آپ نے فرمایا جس چیز کے دینے کا حکم دیا گیا ہے وہ دیتا ہے۔ پورا پورا دیتا ہے اور خوش دلی سے دیتا ہے، جس کے حوالہ کرنے کے لیے کہا گیا ہے اس کے حوالہ کرتا ہے تو وہ بھی صدقہ کرنے والوں میں سے ایک ہے۔

آدمی کی بیوی ہو یا خادم یا اس کا گماشتہ اور امین اس کی اجازت ہی سے اس کا مال خرچ کرسکتے ہیں اجازت کے بغیر انھیں اس کے مال میں تصرف کا حق نہ ہوگا۔ لیکن اجازت صراحت کے ساتھ بھی ہوسکتی ہے اور عرف اور رواج کے تحت بھی۔ اگر یہ بات متعارف ہو کہ ایک خاص حد کے اندر غریبوں کی مدد کرنے یا انھیں کھلانے پلانے میں شوہر کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا تو بیوی اس حد تک عمل کرسکتی ہے۔ اگر اعتراض کا اندیشہ ہو تو اسے احتیاط کرنی چاہیے۔

یہ تو ایک قانونی بات ہے۔ ورنہ آدمی کو اتنا فراخ دل ہونا ہی چاہیے کہ بیوی یا وہ خادم جس پر اسے اعتماد ہو اگر اس کے مال سے کسی مسکین کی مدد کردے تو وہ فرحت اور خوشی محسوس کرے کہ ایک کار خیر میں انھوں نے اس کی مدد کی۔ اس سے وہ خود بھی اجر و ثواب کا مستحق ہوگا۔

ایک صحابی جن کا لقب ابی اللحم تھا کہتے ہیں کہ میں اپنے آقا کے حکم سے گوشت کے پارچے بنا رہا تھا۔ اتنے میں ایک مسکین آیا تو میں نے اسے کچھ گوشت دے دیا۔ میرے مالک کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے مجھے مار دیا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے انھیں بلا کر مارنے کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے عرض کیا کہ اس نے میری اجازت کے بغیر میری چیز دوسروں کو دی ہے۔ آپ نے فرمایا الاجر بینکما۔ یعنی اجر تم دونوں کے درمیان تقسیم ہوگا۔۳

۱ بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب اجر المرأۃ اذا تصدقت۔ واطعمت الخ مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب اجر الخازن الامین۔ المرأۃ۔

۲ مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب اجر الخازن الخ ۳ مسلم، حوالہ سابق۔

یعنی تم دونوں کو اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اجر ملے گا. غلام نے یہ سمجھ کر صدقہ کیا تھا کہ مالک کو اس پر اعتراض نہ ہوگا اس لیے وہ بھی اجر کا مستحق ہوگا. مالک کا مال چونکہ خرچ ہوا اس لیے وہ بھی اجر کا مستحق ٹھہرا۔

پانی پلانا:- پانی انسان کی ایک ناگزیر ضرورت ہے. اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ نعمت چونکہ بڑی فراوانی کے ساتھ عطا کی ہے اس لیے اس کی قدر و قیمت محسوس نہیں کی جاتی. جس شخص کے حلق میں پیاس سے کانٹے پڑ رہے ہوں اس کے لیے اس بات کی بڑی اہمیت ہے کہ بروقت اسے دو گھونٹ پانی مل جائے. اسلام کے نزدیک جس طرح بھوکے کو کھانا کھلانا باعث ثواب ہے اسی طرح پیاسے کو پانی پلانا بھی ثواب کا باعث ہے. ایک حدیث شریف میں آتا ہے۔

ایما مسلم سقیٰ مسلما علیٰ ظمأ سقاہ اللہ من الرحیق المختوم	جو مسلمان کسی مسلمان کو اس کی پیاس کے وقت پلائے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اسے وہاں کی مہر بند شراب پلائے گا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک شخص بیابان میں چلا جارہا تھا کہ اسے سخت پیاس لگی. اسی حالت میں اس نے ایک کنواں دیکھا تو اتر کر پانی پیلیا جب خوب سیراب ہو کر باہر آیا تو دیکھا کہ ایک کتا پیاس کی شدت سے زبان نکالے ہوئے زمین کی نمی چاٹ رہا ہے. اس شخص نے دل میں سوچا کہ جس طرح پیاس سے ابھی میں تڑپ رہا تھا اسی طرح یہ کتا بھی تڑپ رہا ہے. وہ فوراً کنویں میں اترا اور اپنے موزے میں پانی بھر کر لایا اور اس بے زبان جانور کو پلایا. اللہ تعالیٰ نے اس کے اس عمل کی قدر کی اور اسے معاف فرمادیا. اس پر صحابہ کرام نے دریافت فرمایا. کیا جانوروں کی خدمت میں بھی ثواب ہے؟ آپ نے فرمایا:

فی کل کبد رطبۃ اجر[۲]	ہر تروتازہ جگر (زندہ مخلوق) کی خدمت میں اجر و ثواب ہے۔

ایک روایت میں اسے بنو اسرائیل کی ایک زانیہ کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اس عمل کی وجہ سے اس کی مغفرت فرمادی[۳]

---

[۱] ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب فی فضل سقی الماء، ترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ باب ۲/۲۸۔ [۲] بخاری کتاب المساقات، باب فضل سقی الماء. مسلم کتاب قتل الحیات وغیرہا، باب فضل سقی البہائم الخ

[۳] مسلم حوالہ سابق۔

ایک شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اہم امور خیر کی ہدایت فرمائی۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا:

فان لم تطق ذالك فاطعم الجائع واسق الظمآن[1] — اگر تم اس کی طاقت نہیں رکھتے تو بھوکے کو کھانا کھلاؤ اور پیاسے کو پانی پلاؤ۔

کھانے کی تیاری میں جزوی مدد کرنا۔ کھانے کے تیار کرنے میں آٹا، چاول، دال گوشت، سبزی، نمک، پانی اور ایندھن وغیرہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ خدمت کی ایک شکل یہ بھی ہے بعض غذائی اشیاء کے ذریعہ مدد کی جائے یا ایندھن فراہم کیا جائے۔ اس کی بھی فضیلت ہے۔ ان میں سے بعض چیزیں تو ایسی ہیں کہ حدیث میں آتا ہے کہ ان سے منع کرنا ہی نہیں چاہئے۔ وہ انسان ہی کیا جو کسی کی نمک اور پانی کی ضرورت بھی پوری نہ کرے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا اے اللہ کے رسولؐ! وہ کیا چیز ہے جس سے منع کرنا جائز ہی نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا، پانی، نمک اور آگ۔ میں نے عرض کیا کہ پانی کی اہمیت سے تو ہم سب واقف ہیں لیکن نمک اور آگ کی کیا اہمیت ہے؟ آپؐ نے فرمایا۔ اے حمیراء (حضرت عائشہؓ کا لقب) جس نے کسی کو آگ فراہم کی۔ اس نے گویا اس پورے کھانے کا صدقہ کیا جو اس آگ سے تیار ہوا ہے۔ جس نے نمک دیا اس نے گویا اس پورے کھانے کا صدقہ کیا جو اس نمک کی وجہ سے لذیذ اور مزے دار ہوا ہے۔ جس نے کسی مسلمان کو ایک گھونٹ پانی پلایا جہاں کہ پانی دستیاب تھا اس نے گویا غلام آزاد کیا اور جس نے کسی مسلمان کو کسی ایسی جگہ پانی پلایا جہاں کہ پانی دستیاب ہی نہیں تھا تو گویا اس نے اسے زندہ کیا۔[2]

لباس فراہم کرنا۔ انسان کی بنیادی ضروریات میں غذا کے بعد لباس کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ اس کی دیگر ضروریات کی طرح اس ضرورت کو بھی مستقل طور پر حل ہونا چاہئے۔ اسلام نے اس کے وقتی اور عارضی حل کو بھی اہمیت دی ہے۔ کسی برہنہ تن انسان کو کپڑا فراہم کرنے کا ثواب کئی ایک حدیثوں میں بیان ہوا ہے

---

[1] قال المنذری رواہ احمد۔ ۴/۲۹۹ وابن حبان فی صحیحہ البیہقی وغیرہ۔ الترغیب والترہیب۔
[2] ابن ماجہ، ابواب الرہون، باب المسلمون شرکاء فی ثلاث۔ اس کے ایک راوی علی بن زید بن جدعان کو بالعموم محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے لیکن امام ترمذی نے اسے صدوق (سچا)، کہا ہے۔ اس کی بعض روایت کو حسن اور ایک روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا ہے:

ما من مسلم کسی مسلما ثوبا الا کان فی حفظ من اللہ مادام علیہ منہ خرقۃ[1]

جو مسلمان کسی مسلمان کو کپڑا پہنائے، وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں آجاتا ہے جب تک کہ اس پر اس کا ایک ٹکڑا بھی ہے

اگر آدمی کسی شخص کو اپنا بدن ڈھکنے کے لیے نیا کپڑا نہ دے سکے تو استعمال شدہ کپڑا ہی اسے پہنا دے۔ یہ بھی اجر کا باعث ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا ہے کہ جو شخص نیا کپڑا زیب تن کرے اور یہ دعا پڑھے۔

الحمد للہ الذی کسانی ما اواری بہ عورتی واتجمل بہ فی حیاتی۔

شکر و سپاس ہے خدا کا جس نے مجھے لباس پہنایا، جس سے میں ستر پوشی اور اپنی زندگی میں زیب و زینت کرتا ہوں

اس طرح اللہ کا شکر ادا کرنے کے بعد جب یہ کپڑا پرانا ہو جائے تو صدقہ کر دے۔ اس سے وہ اپنی زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہے گا۔[2]

سائل کا حق پہچاننا: وقتی اور ہنگامی مدد کا محتاج وہی شخص نہیں ہوتا جو مفلس اور نادار ہو بلکہ اس کی ضرورت خوش حال انسان کو بھی پیش آسکتی ہے۔ اس کا تعلق مالی حیثیت سے زیادہ ان حالات سے ہے جن میں وہ ہنگامی طور پر گھر گیا ہے۔ راستہ میں کسی کی جیب کٹ جائے اور اس کا اپنے گھر پہونچنا مشکل ہو جائے تو آپ کا اخلاقی فرض ہے کہ آپ اس کی مدد کریں۔ دولت مند سے دولت مند انسان بھی کسی وقت مجبور و بے بس ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کا حق ہے کہ اس کی حاجت پوری کی جائے۔ یہی حقیقت ایک حدیث میں اس طرح بیان کی گئی ہے، جس کی روایت امام حسینؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی ہے۔

للسائل حق وان جاء علی فرس[3]

سوال کرنے والا گھوڑے پر سوار ہو کر آئے تو بھی اس کا (تم پر) حق ہے۔

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الزکواۃ، باب فی فضل الصدقہ بحوالہ احمد، ترمذی [2] ترمذی، دعوات، احادیث شتی من ابواب الدعوات۔ ابن ماجہ، کتاب اللباس، باب ما یقول الرجل اذا لبس ثوبا جدیدا۔ [3] ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ باب حق السائل۔

امام خطابی فرماتے ہیں۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ سائل کے ساتھ حسن ظن رکھا جائے اور فوراً اس کی تکذیب نہ کردی جائے اس لیے کہ بظاہر چاہے وہ کتنی ہی بہتر حالت میں کیوں ہو اور سواری کے لیے اپنے پاس گھوڑا ہی کیوں نہ رکھتا ہو اس کا امکان بہر حال ہے کہ وہ کسی ناگہانی مصیبت یا قرض میں گرفتار ہو۔ ظاہر ہے ان صورتوں میں صدقہ لینا اس کے لیے جائز ہو جاتا ہے۔ کچھ اور اسباب بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ مختلف اسباب ایسے ہو سکتے ہیں جن میں سائل کی ظاہری حالت کو دیکھ کر اسے لوٹا دینا صحیح نہیں ہے۔[۱]

حدیث میں ایک طرف تو سوال کرنے سے منع کیا گیا ہے اور پیشہ ور سائلوں کی مذمت کی گئی ہے، دوسری طرف یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ضرورت کے تحت دست سوال دراز کرے تو اس کی ضرورت جس حد تک امکان میں ہو پوری کر دی جائے۔[۲]

ام بجیدؓ نے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ حضور! کبھی کوئی محتاج میرے دروازہ پر پہونچ جاتا ہے اور میرے پاس اسے دینے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تو بڑی شرم محسوس ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ سائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹاؤ۔ کچھ نہ ہو تو جلا ہوا کھر ہی اسے دے دو۔[۳]

سائل کے ساتھ جو برتاؤ ہونا چاہئے اس کی ایک اعلیٰ مثال ذیل کے واقعہ میں ملتی ہے۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ آج کسی نے کسی مسکین کو کھانا کھلایا ہے؟ حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں اس کے بعد میں مسجد گیا تو دیکھا کہ ایک شخص سوال کر رہا ہے۔ میرا لڑکا عبدالرحمنؓ وہیں روٹی کا ایک ٹکڑا کھا رہا تھا میں نے وہ ٹکڑا اس کے ہاتھ سے لے کر سائل کو دے دیا۔[۴]

مریض کی عیادت اور خدمت کرنا: ہنگامی مدد کی اس شخص کو بھی ضرورت پیش آتی ہے جس پر اچانک کسی مرض کا شدید حملہ ہو جائے یا کسی حادثہ سے دوچار ہو جائے۔ اس میں تاخیر سے اس کی تکلیف بڑھ سکتی ہے اور بعض اوقات اس کی زندگی ہی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ صحیح احادیث میں ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر جو حقوق بتائے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کی جائے اور دوسرا یہ کہ مرنے پر اس کے جنازہ اور تدفین میں شرکت کی جائے۔[۵] مریض کی عیادت یا خدمت بعض اوقات ایک قانونی حق کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ جو شخص بروقت اس حق کو ادا کرے وہ شریعت کے نزدیک بڑے اجر و ثواب کا مستحق ہے۔[۶]

---

[۱] خطابی، معالم السنن ۲/۲۶۱، [۲] ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، باب ما جاء فی حق السائل، ابو داؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب حق السائل [۳] ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب المسألۃ فی المسجد [۴] بخاری، کتاب الجنائز، باب الامر باتباع الجنائز۔ مسلم کتاب السلام، من حق المسلم علی المسلم رد السلام [۵] عیادت سے متعلق مزید احادیث اور ان کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو۔ راقم کا مضمون 'عیادت کی شرعی اہمیت'، مطبوعہ ماہنامہ زندگی رام پور اکتوبر، نومبر ۱۹۸۰ء

مقالات :

قرآن کے اندازِ بیان کی جھلکیاں

جناب عبدالرحمٰن محی انصاری

قرآن کی ابتدا الحمد للہ رب العالمین سے ہوتی ہے یہ وہی حمد ہے جس کا زمزمہ سیاروں سے لے کر جیونٹی تک میں سنائی دیتا ہے۔ اس کے ذریعے زندگی کو جلال وجمال اور سوز وساز عطا کرنے والی شہادت دی جاتی ہے۔ یہی دلوں کی تسکین، روح کی غذا، پاک عمل اور کمال کا ذریعہ ہے۔ جو زبان حمد الٰہی سے آشنا ہوتی ہے وہی لسان صدق ہے۔ جس ذات پاک نے انسان کو دولت نطق عطا کی وہی اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی بڑائی بیان کی جائے، اسی کی رحمت اور حکمت کا چرچا کیا جائے۔ تمام فصاحت و بلاغت کے ذریعے اسی کا ذکر جمیل کیا جائے۔ اسی کے نام سے اپنے فن کو مفتخر ومعزز کیا جائے۔ احساس عبدیت کے ساتھ جب رحمت وحکمت الٰہی کا اعتراف بھی شامل ہو جاتا ہے تو فن کو ایک مقصدی جہت ملتی ہے۔ واقعات و حوادث کی توجیہ و تعبیر کرنے کا انداز بدل جاتا ہے۔ اس وقت "تاریخی قوتوں" کی حقیقت مشیت الٰہی معلوم ہوتی ہے اور حوادث کی شورش میں خیر وشر کی معرکہ آرائی نظر آتی ہے۔ زندگی اور فطرت کے بے شمار مناظر کے اندر ایک ربط، نظم اور مقصد ملتا ہے جس کے اندر رہ کر فنکار اپنی شخصیت اور فن کی ترقی وتکمیل کے لیے کوشاں ہوتا ہے۔ مشکلات سے دوچار ہونے پر وہ گھبرا کر راہ فرار نہیں اختیار کرتا بلکہ اس ذات عالی سے ہدایت و اعانت طلب کرتا ہے جس کے ہاتھ میں آسمان وزمین کی کنجیاں ہیں اور امید کے ساتھ اسی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ وہ نہیں سمجھتا کہ فطرت کی سرکش قوتوں کے درمیان اسے بے سہارا چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ ہر حال میں اپنے خالق کی معیت کا احساس رکھتا ہے۔ اگر شاعر کی تمام شاعری اور ادیب کا تمام ادب الحمد للہ رب العالمین کی تفسیر بن جائے تو یہی اس کے فن کی معراج ہوگی۔ قرآن بتاتا ہے کہ جب یہ بساط کائنات لپیٹ کر رکھ دی جائے گی۔ یہ زمین وآسمان نہ ہوں گے۔ کوئی مخلوق باقی نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ایک دوسرا عالم برپا کرے گا۔ جب اولین وآخرین کے انسانوں کو جمع کرکے ان کے اعمال کی جزا وسزا دی جا چکی ہوگی اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے تخت جلال پر جلوہ افروز ہوگا اور ملائکہ اس کے گرد گھوم کر کہتے ہوں گے الحمد للہ

رب العالمین۔ حمد الٰہی سے ابتدا بھی ہے اور اسی پر انتہا بھی۔

خوشنما الفاظ اور دلکش انداز بیان کی بدولت لطف و انبساط کا سامان تو بہم پہنچتا ہے مگر اس میں بلندی اس وقت آتی ہے جب کلام نور حق سے روشن ہوتا ہے۔ زندگی کے شیون و احوال اور واقعات و حادثات کی توجیہ و تعبیر اسی وقت صحیح ہو سکتی ہے جب انسانی فہم و فراست کے ساتھ رب کائنات کی حکمت اور عدل کا تصور بھی ملحوظ رہے۔ جس طرح حضرت یعقوب کو دور سے دامن یوسف کی خوشبو آگئی تھی اسی طرح فنکار کو مظاہر و کوائف میں مطلوب و مقصود کی خوشبو سونگھنے کا ملکہ ہونا چاہیے اور اس کے پیراہن سے وہی خوشبو آنی چاہئے جو اس کے فن کی صداقت کی گواہی دے سکے۔

تمام فلسفے اور نظریے اپنے پیش کرنے والوں کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ قرآن جس دین کی دعوت دیتا ہے وہ اسلام ہے۔ وہی دین انسانوں کے جد امجد حضرت آدم کا دین تھا اور تمام انبیاء اور خاتم الانبیاء کا۔ قرآن تیئیس سال کی مدت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا آپ کے دعوت اسلامی پیش کرنے کا پہلا موقعہ وہ تھا جب کوہ صفا پر چڑھ کر آپ نے اہل مکہ سے خطاب کیا اور آخری منظر وہ ہے کہ جب حجۃ الوداع کے وقت آپ نے کئی لاکھ کے مجمع میں اپنا آخری خطبہ دیا۔ اس درمیانی مدت میں بڑے بڑے واقعات پیش آئے۔ امن و جنگ، سیاست و تمدن، ایمان و نفاق، معیشت و معاشرت کے بے شمار مسائل پیدا ہوئے اور ان کے متعلق خدا کے رسول کو وحی کے ذریعے ہدایات ملتی رہیں۔ یہ یک نظر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن واقعات سے اصولی بحث کرتا ہے مگر شخصیات کا ذکر نہ کرنے کے برابر کرتا ہے۔ قرآن میں خود صاحب وحی کا نام بھی صرف چند بار آیا ہے۔ آپ کی ازواج مطہرات، اکابر صحابۂ کرام کے نام بھی نہیں ملتے۔ آپ کے بڑے بڑے دشمنوں کے نام بھی نہیں بتائے گئے الا ابولہب کے، جلیل القدر پیغمبروں کے نام ضرور ملتے ہیں اس لیے کہ وہ دعوت اسلامی کے پیغامبر تھے اور قیامت تک کے لیے ان داعیان حق کا ذکر قرآن میں محفوظ کر دیا گیا۔ ورنہ کوئی ایسی قوم نہیں جن میں ہادی نہ آئے ہوں۔ اُن کے حالات زمانے کی گرد میں چھپ گئے ہیں۔ اس سے ایک بڑا رہنما اصول یہ ملتا ہے کہ ادب میں شخصیات کو مطمح کا مرکز نہ بنانا چاہئے۔ مگر اسی حد تک جس حد تک ان کے ذریعے حق کی وضاحت ہوتی ہو یا وہ حق کے معاون و مددگار ہوتے ہوں۔ جس طرح اکابر رجال کے مجسمے نصب کرنا اور تصویریں لگانا بت پرستی ہے اسی طرح شخصیتوں کی مداحی کرنا اور ان کے لیے انسانوں کے دلوں میں عقیدت کے جذبات ابھارنا بھی شخصیت پرستی ہے۔ ہم اپنے زمانے میں شخصیت پرستی کی ایسی

مثالیں بہت دیکھ رہے ہیں۔ قدیم زمانے کے سلاطین اور ان کے در بار گو کہ اب نہیں ہیں مگر ان سے زیادہ با اختیار اور اپنی تعریف سننے کے حریص ارباب سیاست ہیں۔ ان کی مدح سرائی کرنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ چنانچہ بت اور بت پرست دنیا سے نابود نہیں ہوئے ہیں۔ قرآن نے بعض زحم اشخاص اور اقوام کا ذکر ان کی صفات کے ساتھ کیا ہے مثلاً قوم عاد کے متعلق فرمایا اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ (الفجر۔ ۸) اونچے ستونوں والے عاد جن کے مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی۔ قوم ثمود کے متعلق۔ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ (الفجر) جنھوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں۔ فرعون کو کہا۔ فرعونَ ذِی الاوتادِ میخوں والا فرعون حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بدبخت بیویوں کا ذکر آیا ہے مگر ان کا نام نہیں لیا گیا۔ ابولہب کی بیوی کا بھی نام نہیں لیا گیا۔ فرعون کی بیوی کا ذکر نیکو کاروں کے زمرے میں کیا گیا مگر اس کا بھی نام نہیں لیا گیا۔ حضرت ابراہیم کی اہلیہ جن کے بطن سے حضرت اسحٰقؑ اور حضرت اسماعیلؑ پیدا ہوئے ان کا نام بھی نہیں لیا گیا۔ واقعہ افک کے بیان میں بھی حضرت عائشہ صدیقہ کا نام نہیں لیا گیا۔ حضرت مریم صدیقہ وہ تنہا عورت ہیں جن کا نام ہی قرآن میں نہیں بلکہ اس کی ایک سورہ ان کے نام سے موسوم ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک جگہ عبداللہ کہہ کر یاد کیا گیا اور ابوبکر صدیق کو ثانی اثنین کہہ کر۔ تاریخ اسلامی کے بڑے بڑے مدبروں اور جرنیلوں کے نام بھی قرآن کے صفحات پر نہیں ملیں گے۔ قرآن نے واقعات کو شخصیات کا تابع نہیں تصور کیا اس لیے کہ واقعات کا ظہور حکم الٰہی سے ہوتا ہے اور فاعل حقیقی اللہ ہی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے ذکر سے یہ حقیقت عیاں کرنی مقصود ہے کہ تمام انبیا ایک ہی دعوت لے کر آئے تھے۔ ان کی بعثت کا مقصد بندوں پر اللہ کی حجت کا اتمام تھا۔ چنانچہ اس طرح دعوت اسلامی کے لازوال ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

قرآن لوح محفوظ سے نازل ہوا ہے اس لئے وہ زمان ومکان کی محدودیت سے آزاد ہے۔ اس کے ارشادات زمانے پر حاوی ہیں۔ اس کے احکام ہر زمانے کے لیے موزوں اور قابل عمل ہیں۔ اس کے مضامین کی تازگی ہمیشہ باقی ہے اور اس کا انداز بیان کہنگی کے اثر سے پاک ہے۔ اس کے انداز بیان کا کمال یہ ہے کہ جوں جوں بات آگے بڑھتی ہے موضوع کے تمام گوشے خود بخود بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جیسے صدف میں قطرۂ نیساں ٹپکے اسی طرح ہدایت و محبت، رحمت و حکمت، طمانیت و سکینت کی ٹھنڈک قلب میں اترآتی ہے۔ قرآن کے بات

شروع کرنے کا انداز انوکھا ہے۔ وہ اکثر واقعات کی ابتدا اِذا سے کرتا ہے۔ اس انداز بیان کی اہمیت یہ ہے کہ گویا زمانے کی ابتدا سے حال کے نقطہ زمانی تک کے واقعات و حوادث نوع انسانی کے شعور میں محفوظ ہیں۔ قرآن افراد انسانی کے قلوب میں ان کی بازگشت کا سبب پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن کے آئینہ بیان میں بیک وقت ماضی حال اور مستقبل کے واقعات کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔ مثلاً

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْا اِلَّا اِبْلِیْس وَاِذْ قَالَ مُوسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْ اِسْرَائِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ۔	جب ہم نے ملائکہ سے آدم کو سجدہ کرنے کے لیے کہا ابلیس کے سوا سب نے اس کو سجدہ کیا۔" اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اہل قوم تم کیوں مجھے اذیت دیتے ہو۔ اور جب عیسیٰ ابن مریم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ میں تمھاری طرف اللہ کا رسول بن کر آیا ہوا تھا۔

قیامت کے واقعات کو بیان کرنے کے لیے یہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ لَیْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ اِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ	جب وہ ہونے والا واقعہ پیش آجائے گا تو کوئی اس کے وقوع کو جھٹلانے والا نہ ہوگا۔ جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب تارے بکھر جائیں گے اور جب سمندر پھاڑ دیے جائیں گے۔"

یہ بیانات اعلیٰ ترین سطح سے ارشاد ہو رہے ہیں۔ وہ واقعات تاریخ کے کسی خاص زمانی نقطے پر واقعہ ہوئے یا واقع ہونے والے ہوں گے مگر امر واقعہ کے طور پر بیان ہو کر خالص زمانے میں پیوست ہو گئے ہیں۔ وہ انسانی احساسات سے اس طرح پیوستہ ہیں کہ آنکھوں نے نہیں دیکھا مگر دیکھا ہے، کانوں نے نہیں سنا مگر سنا ہے۔ اس طرح ایمان بالغیب پیدا ہوتا ہے۔

قرآن کے ترجمہ میں خواہ کسی زبان میں ہو اس کی حلاوت، نزاکت، معانی و مفاہیم کی وسعت بایں اور گہرائی نہیں آسکتی۔ اور اس کے اثر کا عشر عشیر بھی کسی زبان میں منتقل نہیں کیا جاسکتا جو آدمی کو کبھی وجد پر آمادہ کرتا ہے اور کبھی رلا دیتا ہے۔ قرآن کے چند مقامات کی جھلکیاں دیکھیے۔

حضرت نوحؑ کی کشتی تیار ہو گئی ہے۔ حکم خدا سے جن کو کشتی میں لینا تھا لے لیا گیا

ہے۔ تنور سے پانی ابلنے والا ہے۔ پانی اوپر سے برسے گا نیچے سے ابلے گا۔ ایک ایسا زبردست واقعہ ظہور میں آنے والا ہے جیسا ہبوط آدم سے لے کر اس وقت تک ظہور میں نہیں آیا تھا۔ ایسی تباہی آنے والی ہے جیسی چشم فلک نے کبھی نہیں دیکھی۔ وہ وقت آگیا کشتی چلی اور حضرت نوحؑ نے فرمایا:

وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرِيهَا وَمُرْسٰهَا اِنَّ رَبِّي لَغَفُورٌ الرَّحِيمٌ ○ (ھود: ۴۱)

سوار ہو جاؤ اس میں۔ اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا بھی اور ٹھہرنا بھی۔ میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے۔

کتنی طمانیت قلبی کے ساتھ اللہ کے نبی نے واقعہ کا استقبال کیا۔ تباہی ضرور آنے والی تھی مگر بندوں کے گناہوں اور نافرنیوں کے سبب ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اللہ غفور و رحیم ہے۔ جب تباہی اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ تکمیل کو پہنچ جاتی ہے حکم خداوندی ہوتا ہے کہ طوفان تھم جائے۔

وَقِيلَ يٰاَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَ يٰسَمَاءُ اَقْلِعِي وَ غِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ وَقِيلَ بُعْدًا لِلْقَوْمِ الظّٰلِمِينَ۔ (ھود: ۴۴)

حکم ہوا اے زمین اپنا سارا پانی نگل جا اور اے آسمان رک جا چنانچہ پانی زمیں میں بیٹھ گیا، فیصلہ چکا دیا گیا، کشتی جودی پر ٹک گئی اور یہ کہہ دیا گیا کہ دور ہوئی ظالموں کی قوم۔

کس قدر ڈرامائی انداز میں ایک بڑی بات کو چند فقروں میں قوت و شوکت اور کامل اثر کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ ہر تباہی کی کوکھ سے عظیم شاعری جنم لیتی ہے۔ جتنی بڑی تباہی ہوتی ہے اتنی ہی عظیم شاعر ہوتی ہے۔ بغداد کی تباہی پر ایک عظیم شاعر نے آنسو بہائے۔ دلی کی تباہی پر داغ اور حالی نے شہر آشوب لکھے۔ تاریخ عالم کی مقتدر ہستیوں پر اور شاعروں نے اپنے معشوقوں کی موت پر مرثیے لکھے۔ طوفان نوح کے متعلق قرآن کا یہ جامع بیان اپنی نظیر آپ ہے۔

حضرت لوطؑ کے پاس اللہ کے فرشتے آتے ہیں۔ وہ ارض سدوم کو بدکاروں کے وجود سے پاک کرنے آئے تھے۔ ان کو دیکھ کر بدکار قوم کے لوگ دوڑ کر آتے ہیں اور اپنی ہوسناکی کا اظہار کرتے ہیں۔ حضرت لوطؑ ان سے فرماتے ہیں:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ. اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ (هود: ۷۸)
پس خدا کا خوف کرو اور میرے مہمانوں کے معاملے میں مجھے ذلیل نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں۔

ان کی قوم جب نہیں مانتی اور فرشتے حضرت لوطؑ کو بتاتے ہیں کہ بستی والوں پر عذاب آنے والا ہے تو فرشتے کہتے ہیں۔

اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ٥ (هود: ۸۱)
ان کی تباہی کے لیے صبح کا وقت مقرر ہے صبح ہوتے اب دیر ہی کتنی ہے۔"

بطن عدم سے کون سا واقعہ کب ظاہر ہوگا کسے خبر۔ اپنے اعمال کے نتائج سے بے خبر لوگ نائے و نوش میں مست اور مادہ پرستانہ تگ و دو میں لگے رہتے ہیں انھیں کیا معلوم کہ پیمانۂ عمر لبریز ہو رہا ہے۔ آنے والے وقت کی آہٹ کوئی نہیں سن سکتا۔ کسی کو کچھ نہیں معلوم کہ ایک زلزلہ دبے پاؤں آ رہا ہے۔ ایک طوفان پھٹ پڑنے والا ہے۔ ہر نجومی کا نجوم اور سائنسداں کی پیش بینی غلط ثابت ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر واقعہ و حادثہ اللہ کے علم میں ہے اور اسی کے حکم سے ظاہر ہوتا ہے اور اس کے ظاہر ہونے کا ایک معین وقت ہے۔ یہ انسان کی کم فہمی ہے کہ وہ کہتا ہے کہ یہ واقعہ ناگہانی طور پر واقع ہوا یا ایسا ہونے کا کوئی قرینہ نہ تھا۔

قیامت کے دن حضرت عیسی علیہ السلام سے اللہ سبحانہ تعالیٰ فرمائے گا۔" کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی خدا بنالو تو وہ جواب میں عرض کریں گے کہ سبحان اللہ میرا یہ کام نہ تھا کہ وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہیں تھا۔ اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو آپ کو ضرور علم ہوتا۔ آپ جانتے ہیں جو کچھ میرے دل میں ہے —— اور میں نہیں جانتا جو کچھ آپ کے دل میں ہے۔

آپ تو ساری پوشیدہ حقیقتوں کے عالم ہیں۔ میں نے ان سے اس کے سوا کچھ نہیں کہا جس کا آپ نے حکم دیا تھا۔ یہ کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمھارا رب بھی۔ میں اس وقت تک ان کا نگراں تھا جب تک کہ میں ان کے درمیان تھا۔ جب آپ نے مجھے واپس بلا لیا تو آپ ان پر نگراں تھے اور آپ تو ساری ہی چیزوں پر نگراں ہیں۔"

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (هود: ۱۱۵، ۱۱۸)

ان آیات میں دعوت حق کا مغز آ گیا اور اللہ کو جس وقار ولہجے سے اس کے ایک نبی نے جواب دیا وہ بھی معلوم ہو گیا۔ آخری آیت تو بلاغت کی جان اور حضرت عیسیٰ کے رحم اور شفقت کی آئینہ دار ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن مشہور زمانہ ہے مگر قرآن نے ان کے حسن کا بالتصریح ذکر نہیں کیا ہے۔ نہ اس کے ضمن میں تشبیہات واستعارات کی زبان سے کلام کو طول دیا ہے۔ البتہ اس نے اپنے انداز کلام سے ان کے حسن جسمانی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ قرآن کی نظر میں حسن جسمانی ایک خوبی ہے مگر اس کے نزدیک اس سے بڑی خوبی عمل صالح ہے" جسمانی حسن بغیر سعی وعمل کے ملتا ہے۔ وہ عطیۂ خداوندی ہے انسان کا کمال نہیں۔ صاحب جمال کا اپنے جمال پر ناز کرنا حقیقت سے بے بہرہ ہونے کا ثبوت دینا ہے۔ اسی طرح حسن جسمانی پر فریفتہ ہونا بھی کم نظری ہے۔ حسن اشیاء میں ہو یا انسانوں میں وہ ذات خداوندی کی صفت جمال کا مظہر ہے اور جب وہ عمل صالح کا ذریعہ بنے اسی وقت مستحسن ہے۔ دوسرے عطیات خداوندی کی طرح حسن خداداد کی قدر شکر واحسان مندی ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔

پہلی بار جب حضرت یوسف کو ان کے بھائی کنوئیں میں ڈال کر چلے جاتے ہیں اور آنے والے قافلے کا سقہ کنوئیں میں اپنا ڈول ڈال کر نکالتا ہے تو دیکھتا ہے حضرت یوسف ہیں۔ اس موقعہ پر قرآن کا بیان دیکھئے۔

قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ وَاَسَرُّوْهُ	سقہ پکار اٹھا مبارک ہو یہاں ایک لڑکا ہے۔ ان
بِضَاعَةً (یوسف ۱۹)	لوگوں نے اس کو مال تجارت سمجھ کر چھپا لیا۔

حضرت یوسف جن لوگوں کو ملے تھے وہ تاجر تھے۔ وہ ہر چیز کو تجارتی فائدہ کے نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ اس کمال درجہ خوبصورت نیز نیک سیرت لڑکے کو انھوں نے ایک خزانہ سمجھا اور ان کے چھپانے میں یہ راز تھا کہ وہ کہیں کسی دوسرے آقا کا غلام نہ ہو جو بھاگ کر آیا ہو اور اسے دیکھ کر وہ واپس مانگنے لگے۔ حضرت یوسف غیر معمولی حسین نہ ہوتے تو بھی انھیں چھپانے کی زیادہ ضرورت نہ تھی۔ ایسے خزانے کو کون ہاتھ سے نکل جانے دیتا۔ آگے آنے والے وقت نے بازار مصر میں یہ راز عیاں کیا کہ یوسف کی کیا قیمت تھی۔ قرآن کے ایک مختصر فقرے میں کیسی بلاغت اور کتنے لطیف نکات ہیں۔

جب زلیخا ملامت کرنے والی زنان مصر کو دعوت دیتی ہے اور وہ شان دلربائی سے صوفوں پر

لیٹی ہوئی ہاتھ میں پھل لے کر چھری سے کاٹنے کے لیے تیار ہوتی ہیں عین اس وقت زلیخا حضرت یوسف کو اشارہ کرتی ہے کہ وہ ان کے سامنے آجائیں۔ زنان مصر پر ایک بجلی گرتی ہے۔ وہ پھل کے بجائے اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھتی ہیں۔ قرآنی زبان میں:

فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ (یوسف: ۳۱)

"جب ان عورتوں کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ دنگ رہ گئیں اور اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں اور بے ساختہ پکار اٹھیں حاشاللہ یہ شخص انسان نہیں یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔"

دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ حضرت یوسف کا جمال دیکھ کر زنان مصر کے دلوں میں جنسی جذبات نہیں بھڑک اٹھتے حضرت یوسف کو ملک کریم کہہ کر وہ ان کے حسن کی پاکیزگی تسلیم کرتی ہیں جو ان کو عشق و ہوس کے جذبات کی طرف مائل ہی نہیں ہونے دیتا۔ قرآن نے ایک پورے واقعے کو جس کی رنگینی و رعنائی شاعرانہ خیال آفرینیوں کو دعوت دیتی ہے کس صداقت و نزاکت کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ جس پر محاکاۃ اور تمثیل نگاری قربان ہے۔

پوری سورۂ یوسف ایک تمثیلی قصہ ہے جس کے تمام کردار شرافت، صبر، استقلال، حسد، انصاف اور عفو و رحم کی علامات ہیں۔ جس جامعیت، حسن، اثر اور عبرت پذیری سے یہ قصہ بیان ہوا ہے صحیح یہ ہے کہ وہ احسن القصص ہے۔ قرآن کے اعجاز بیان کی دو ایک مثالیں اور ملاحظہ ہوں جن سے ادب کے رہنما اصول اخذ کر سکتے ہیں۔ عزیز مصر کی بیوی حضرت یوسف کو ورغلاتی ہے۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ (یوسف: ۲۳)

جس عورت کے گھر میں وہ تھا وہ اس پر ڈورے ڈالنے لگی۔

دیکھئے قرآن نے اس کا نام نہیں لیا اور نہ اس کے کردار پر رائے زنی کی۔ یہ اخفائے راز بھی ہے، شرافت بھی اور کلام کی پاکیزگی بھی۔ اب قصے کے اس مقام پر آئیے جہاں حسن اور عشق رو بہ رو ہوتے ہیں۔

وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ۭ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ

وہ دروازے بند کر کے بولی۔ آجا۔ یوسف نے کہا خدا کی پناہ۔ میرے رب نے تو مجھے اچھی منزلت بخشی اور میں یہ کام کروں۔ ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پایا کرتے۔ وہ اس کی طرف بڑھی اور یوسف

وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ط (یوسف، ۲۴)　　بھی اس کی طرف بڑھتا اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا۔

دیکھیے چند الفاظ میں ایک داستان پوشیدہ ہے۔ ایک ایک لفظ مفہوم کو حد درجہ بلاغت، شرح اور واقعیت کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔ خامکار ہوس کا دور تک پتہ نہیں۔ بلکہ ایک نہایت شریف اور باعظمت نوجوان کا کردار سامنے آتا ہے۔ یہ موقعہ دیکھیے کہ کسی نے داستان شوق یوں مختصر بیان کی ہے کہ هیت لك اور دوسری طرف ایک نوجوان ہے، اپنے وطن اور خویش و اقارب سے دور، کنوارا، خالی مکان، ایک حسین عورت، حسین ہی نہیں اس کی معزز مالکہ نفس کے مطابق اپنی خواہش کا اظہار کرتی ہے غرض کیا نہیں ہے جو ہنگامہ شوق مطلوب ہو۔ کون ہے جس کے پاؤں ڈگمگا نہ جائیں مگر حضرت یوسف نے جس طرح دفاع کیا صرف وہی ایک کامیاب دفاع ہو سکتا تھا کہ معاذ اللہ میرے رب نے مجھے اچھی منزلت بخشی اور وہ ظالموں کو فلاح نہیں دیتا۔ انھوں نے سوال و جواب میں وقت ضائع نہیں کیا بلکہ فوراً بات کو اس حد تک پہنچا دیا جہاں ترغیب و تحریص کے منہ میں زبان نہیں رہ جاتی۔ بہت ممکن ہے اگر حضرت یوسف جذباتی طور پر زلیخا سے گفت و شنید کرتے تو ان کو مجبور کر دیا جاتا یا ان کے ضبط کا بند ٹوٹ جاتا، ان کے قدم ڈگمگا جاتے مگر خدا کی اس دلیل نے انھیں بچا لیا کہ مرے رب نے مجھے یہ عزت بخشی اور میں یہ کام کروں۔ معلوم ہوا کہ ــــــ کسی انسان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ چالاکی سے پھیلائے ہوئے دام ہوس میں اپنی عقلمندی کے ذریعے بچ جائے بلکہ صرف خدا کا خوف اور اس کی توفیق و تائید سے ہی ایسا ہو سکتا ہے۔

جب دو آدمی، حضرت یوسف کے جیل کے ساتھی ان سے اپنے خواب کی تعبیر پوچھنے آتے ہیں تو حضرت یوسف اس موقعہ کو تلقین حق کے لیے موزوں خیال کرتے ہیں حالانکہ ان کا ساتھ بہت دنوں سے تھا۔ آپ فرماتے ہیں

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (یوسف: ۳۹)　　اے زنداں کے ساتھیو تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا ایک وہ اللہ جو سب پر غالب ہے"!

نکتہ یہ حاصل ہوا کہ تبلیغ حق کے لیے صحیح موقعہ مخاطب کی توجہ و اعتماد اور داعی کے لیے علم اور حکمت درکار ہیں۔

حضرت نوح کا نافرمان بیٹا جوان کے ساتھ کشتی میں نہیں آیا اور کہتا تھا کہ میں پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا اور پانی سے بچ جاؤں گا بالآخر پانی میں ڈوب گیا۔ جب پانی تھما تو حضرت نوح نے اللہ سے فریاد کی کہ خداوندا تو نے میرے خاندان کو بچانے کا وعدہ کیا تھا میرا بیٹا کیوں ڈوب گیا۔ ارشاد ربانی ہوتا ہے:

یٰنُوۡحُ اِنَّہٗ لَیۡسَ مِنۡ اَہۡلِکَ ۔۔۔ اے نوح وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں
اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیۡرُ صَالِحٍ (ھود: ۴۶) ۔۔۔ ہے۔ وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے۔"

یہ حقیقت واشگاف کردی گئی کہ اگر بیٹا باپ کی نیکی کا وارث نہیں تو ناخلف ہے۔ صرف حیاتیاتی رو سے کسی کا بیٹا ہونا اور بات ہے۔ باپ کا صحیح جانشین ہونے کے لیے عمل صالح شرط ہے۔ حسب ونسب پہ بے جا فخر کرنے کی جڑ کاٹ دی گئی۔ عمل صالح کا سورج ہمیشہ چمکتا رہے گا۔

جن لوگوں کو قرآن کی تلاوت سے انسیت ہے اور جو اس کے معانی ومطالب پر غور وفکر کرتے ہیں ان سے پوچھئے وہ کہیں گے ؎

ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی۔ اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے۔

اسلام کا ضابطۂ انفاق

فراخدلانہ مگر ضابطہ بند

جناب سید معین الدین قادری

معاشی مسائل کے سلسلے میں جو ہدایات قرآن اور حدیث میں دی گئی ہیں ان میں انفاق پر بہت زور دیا گیا ہے۔ سود کے برخلاف جو دولت کو چند ہاتھوں میں مرتکز کرتا ہے انفاق، تقسیم دولت کے معاملے میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ انفاق کو یہ ترجیحی اہمیت اس لیے دی گئی ہے کہ دولت وثروت صرف اغنیاء کے درمیان گردش نہ کرتی رہے اور اس لیے بھی کہ وہ پیداوار اور صرف پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ انفاق سماجی ترقی کے لیے محرک اور وسیلے کا بھی کام کرتا ہے۔ انفاق کا محرک اگر رضائے الٰہی کی طلب ہو تو ہر صرفہ جس کی ابتدا اپنی ذات اور اہل و عیال سے ہو کر انتہا رفاہ عام اور خیرات پر ہوتی ہے فی سبیل اللہ میں شامل ہے۔ اور وہ "فی سبیل الشیطان" ہے جو نمود و نمائش کے لیے ہو یا مفاخرت اور دوسروں پر تفوق اور برتری جتانے کے لیے ہو۔ رضائے الٰہی کی طلب اگر حقیقی محرک ہو تو اسلامی معاشرے کے افراد ذاتی ضروریات پر خرچ اور سماجی ضروریات پر صرف میں امتیاز نہیں برتتے۔ میانہ روی اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ دونوں پر یکساں فراخ دلی خندہ جبینی، اخلاص اور کشادگی کے ساتھ خرچ کر سکیں۔ وہ راہب اور تارک الدنیا نہیں ہوتے کہ جائز اور ممکن راحت سے اپنے آپ کو محروم کرلینے کو تقرب الٰہی کا وسیلہ قرار دیں۔ عیش پرست اور بندۂ نفس نہیں ہوتے کہ زندگی ان کے نزدیک محض لذائذ و نعم حریر و دیبا اور لباس فاخرہ سے عبارت ہو وہ تنعم سے خبردار رہتے ہیں کیونکہ انھیں خبردار کیا گیا ہے کہ اللہ کے بندے تنعم سے سروکار نہیں رکھتے۔

انفرادی انفاق، اجتماعی خوشحالی کی ضمانت ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ اجتماعی خوشحالی انفرادی خوش حالی سے مختلف کوئی چیز نہیں ہوتی بالخصوص ایسے معاشرے میں جس میں اغنیاء مائل بہ انفاق ہوں اور مساکین خاک بسر کر دینے والے فاقے کے سوا کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنے

پر راضی نہ ہوں۔

نفع بخش کاروبار میں مال لگانا، پسندیدہ انفاق کی تعریف میں آتا ہے رفاہ عام کے لیے مالی امداد کے مطالبے پر لبیک کہنے میں مثالی اسلامی معاشرے کے افراد ادنیٰ تامل کو دخل نہیں دیتے ہاں اس بات کا لحاظ ضرور رکھتے ہیں کہ یہ تعاون ان کے وسائل اور متعلقہ ضرورت کی نوری اور شدید نوعیت سے مطابقت رکھتا ہو۔ انھیں یقین ہوتا ہے کہ رضائے الٰہی کی طلب کے پیش نظر جو بھی انفاق اللہ اور رسول کے مقرر کردہ ضابطے کے مطابق کیا جائے گا وہ اجتماعی خوش حالی کا ذریعہ بن جائے گا اور اضافۂ دولت میں مدد معاون ہوگا۔

انفاق پر زور دینے کا مطلب پس انداز کرنے کی کلی اور مطلق تردید نہیں ہے۔ ہاں "اکتناز" کی ہمت شکنی ضرور مقصود ہے اصل اہمیت جو بات رکھتی ہے وہ یہ کہ پس انداز کردہ رقم کی آخری منزل کیا ہے پس انداز کرنا بجائے خود اور مستقل بالذات کوئی پسندیدہ فعل نہیں لیکن اسراف اور دولت کو نمود و نمائش، مبالغہ آمیز آرائش و زیبائش لذت کوشی اور عیش طلبی میں ضائع کرنا بہر حال ناپسندیدہ اور مذموم فعل ہے۔ جب تک مقصد پاک ہے اور ضوابط وحدود کی خلاف ورزی نہیں ہو رہی ہے، ضرورت پر خرچ کرنے، پس انداز کرنے اور نفع بخش کاروبار میں لگانے، ہر شق کو اسلامی معاشرہ مساوی قرار دیتا ہے۔

اسلامی معاشرے میں انفاق کو ہر شخص اپنے اوپر لازم گردانتا ہے کسب زر محض زر اندوزی کی خاطر نہ صرف یہ کہ اسلامی معاشرے میں کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ مستحق وعید سمجھا جاتا ہے۔ "جو لوگ سونا چاندی اکٹھا کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انھیں دردناک سزا کی خوش خبر دو"۔ ایک دن وہ آئے گا کہ اس سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں کو داغا جائے گا یہ ہے وہ خزانہ جسے تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا سو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو (توبہ: ۳۴-۳۵)

اسلامی معاشرے کا ہر فرد جانتا ہے کہ اعتبار اسی انفاق کا ہے جو آدمی اپنی جائز اور حلال کمائی سے کرے اسے معلوم ہے کہ آدمی کے وسائل معیشت پر پہلا حق اس کی اپنی ذات کا ہے اور ان کا جو اس کے زیر کفالت ہوں۔ میانہ روی کے ساتھ۔ وہ آگاہ ہے کہ مآل اندیشی یا تقدم بالحفظ کے طور پر کوئی رقم محفوظ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ وہ معقول حد کے اندر ہو اور محض گنجینۂ زر پر روایتی سانپ بن کر بیٹھنے کی ذہنیت اس کی پشت پر کار فرما نہ ہو۔

انفاق کے ضمن میں اسلامی معاشرے کا جو مرقع اوپر پیش کیا گیا اس میں ہدایات ربانی اور ارشادات نبویؐ نے کیسے رنگ بھرا اس کا اندازہ کرنے کے لیے درج ذیل آیات و احادیث کا مطالعہ کیا جائے۔

(۱) وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ فَآتَتْ أُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَإِن لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (البقرہ۲: ۲۶۵)

جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضا جوئی کے لئے دل کے پورے ثبات و قرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے کسی سطح مرتفع پر ایک باغ ہو۔ اگر زور کی بارش ہو جائے تو دگنا پھل لائے اور اگر زور کی بارش نہ ہو تو ایک ہلکی پھوار ہی اس کے لیے کافی ہو جائے۔ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ کی نظر میں ہے۔

(۲) يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلْ مَا أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ (البقرہ ۲/ ۲۱۵)

لوگ پوچھتے ہیں ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو کہ جو مال بھی تم خرچ کرو اپنے والدین پر، رشتے داروں پر، یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو اور جو بھلائی بھی تم کرو گے۔ اللہ اس سے باخبر ہو گا۔

(۱) قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْفِقْ بِلَالُ وَلَا تَخْشَ مِنْ ذِي الْعَرْشِ إِقْلَالًا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے بلال خرچ کرو اور عرش والے سے قلت کا اندیشہ نہ کرو۔ (مشکوٰۃ)

(۲) عَنْ أَبِي ذَرٍّ قَالَ انْتَهَيْتُ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ جَالِسٌ فِي ظِلِّ الْكَعْبَةِ، فَلَمَّا رَآنِي قَالَ هُمُ الْأَخْسَرُونَ فَقُلْتُ فِدَاكَ أَبِي وَأُمِّي مَنْ هُمْ؟ قَالَ هُمُ الْأَكْثَرُونَ أَمْوَالًا إِلَّا مَنْ قَالَ هٰكَذَا وَهٰكَذَا وَ

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ راوی ہیں۔ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایسے میں حاضر ہوا کہ آپ کعبے کے سائے میں تشریف فرما تھے۔ آپ نے مجھے دیکھا تو فرمایا "وہ سب سے زیادہ خسارے میں پڑنے والے ہیں" میں نے عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان، کون ہیں وہ لوگ۔ فرمایا "وہ لوگ جن کے

هٰكَذَا مِنْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ وَقَلِيْلٌ مَا هُمْ۔
(بخاری ومسلم)

پاس ڈھیر سا مال ہے مگر وہ جو ایسا کرتے ہیں" پھر دست مبارک سے اشارہ کیا سامنے، پیچھے اور دائیں جانب (یعنی ایسے خرچ کرنے والے (اور فرمایا) ایسے لوگ کم ہی ہیں۔

(۳) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنْ یَوْمٍ یُصْبِحُ الْعَبْدُ فِیْهِ اِلَّا مَلَكَانِ یَنْزِلَانِ فَیَقُوْلُ اَحَدُهُمَا اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا وَیَقُوْلُ الْاٰخَرُ اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا (بخاری ومسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندہ کسی بھی دن کی صبح نہیں کرتا کہ دو فرشتے نہ نازل ہوتے ہوں۔ ایک کہتا ہے بارالٰہا خرچ کرنے والے کو مزید عطا فرما دوسرا کہتا ہے اے اللہ کنجوس کو ضیاع (مال) سے دو چار کر۔

(۴) عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَا ابْنَ اٰدَمَ اِنَّكَ اَنْ تَبْذُلَ الْفَضْلَ خَیْرٌ لَّكَ وَاَنْ تُمْسِكَهٗ شَرٌّ لَّكَ وَلَا تُلَامُ عَلٰى كَفَافٍ وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ (ترمذی)

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے فرزند آدم زائد از ضرورت جو مال تیرے پاس ہے اس کو تو خرچ کر دے یہی بہتر ہے۔ تو اُسے روک رکھے یہ تیرے لیے برا ہے رہا اگر اتنا ہی ہے کہ صرف تیری ضرورت پوری ہو سکے تو تجھے ملامت نہ کی جائے گی اس کے بعد خرچ کی ابتدا ان سے کر جو تیرے زیر کفالت ہوں۔

(۵) عَنْ عَدِیِّ ابْنِ حَاتِمٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَا مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا سَیُكَلِّمُهُ اللّٰهُ لَیْسَ بَیْنَهٗ وَبَیْنَهٗ تَرْجُمَانٌ فَیَنْظُرُ

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا: تم میں سے ہر ایک سے اللہ ہم کلام ہوگا ایسے کہ درمیان میں کوئی ترجمان نہ ہوگا آدمی اپنے دائیں دیکھے گا تو وہی نظر آئے گا جو اس نے پہلے بھیجا ہوگا (یعنی اس کا

ایمن منہ فلا یری الا ما قدم وینظر اشام منہ فلا یری الا ما قدم وینظر بین یدیہ فلا یری الا النار تلقاء وجہہ فاتقوا النار ولو بشق تمرۃ (بخاری ومسلم)

عمل)۔ بائیں دیکھے گا تو وہی نظر آئے گا جو اس نے پہلے بھیجا ہوگا (اللہ کی راہ میں دنیا میں جو خرچ کیا ہوگا یا جو نیکی کی ہوگی وہاں موجود پائے گا) سامنے دیکھے گا تو آتش دوزخ بھڑک رہی ہوگی۔ پس آگ سے بچنے کی فکر کرو۔ خواہ ٹکڑا کھجور ہی (اللہ کی راہ میں) دے کر۔

(۶) عن ثوبان قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افضل دینار ینفقہ الرجل علی عیالہ ودینار ینفقہ علی دابتہ فی سبیل اللہ ودینار ینفقہ علی اصحابہ فی سبیل اللہ (مسلم)

حضرت ثوبان رضی اللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے زیادہ فضیلت اس دینار کو ہے جو آدمی اپنی اولاد پر خرچ کرتا ہے (اور اپنی براہ راست ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتا ہے) پھر اس کو جو وہ جہاد میں استعمال کی جانے والی اپنی سواری پر کرتا ہے پھر اس کو، جو وہ اپنے جہاد کے ساتھیوں پر صرف کرتا ہے (تاکہ وہ جہاد میں حصہ لے سکیں)

(۷) عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من تصدق بعدل تمرۃ من کسب طیب ولا یقبل اللہ الا الطیب فان اللہ یتقبلھا بیمینہ ثم یربیھا لصاحبہ کما یربی احدکم فلوہ حتی تکون مثل الجبل وفی روایۃ حتی ان اللقمۃ تصیر مثل احد (بخاری مسلم ترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنی پاک کمائی میں سے اور اللہ پاک ہی مال قبول کرتا ہے۔ ایک کھجور کے برابر (یا بقدر اس کی قیمت کے) صدقہ کرے گا تو اللہ اس کو اپنے دائیں ہات میں لے گا (خوشنودی کے ساتھ اس کو قبول فرمائے گا) پھر اس کو صدقہ دینے والے کے لیے پروان چڑھائے گا اور بڑھاتا رہے گا جیسے تم اپنے بچھڑے (گھوڑی کے بچے) کو پرورش کرتے اور بڑھاتے ہو یہاں تک تھوڑا سا پاک صدقہ پہاڑ کی مانند ہو جائے گا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ ایک لقمہ بھی صدقہ کیا تو وہ احد پہاڑ کے برابر ہو جائے گا۔

تشریح :۔ صدقہ کے طور پر دی جانے والی شے یا رقم کی مقدار کم سے کم بھی لیکن جائز کمائی سے ہو اور اللہ کی رضا طلب کرنے کے خالص اور بے آمیز جذبے سے ہو تو پروردگار اس کا اجر اپنی رافت و رحمت سے اتنا دے گا جتنا بڑی سے بڑی مقدار یا رقم پر ملنا چاہئے ظاہر ہے کہ انعام کی مقدار کا فیصلہ منعم کی خوشنودی پر منحصر ہے اور منعم جب اللہ ہو تو انعام کی حد کون جان سکتا یا مقرر کرسکتا ہے۔

اس حدیث سے حکمت تبلیغ اور تفہیم نبوی کے اسلوب اور انداز پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ایسی مثالوں کا انتخاب جو صحرائی عربوں کی زندگی کا لازمی حصہ تھیں اور ان کی تخیل کو حرکت میں لا سکتی تھیں ایک عرب کو اجر و ثواب کی افزونی کا تصور اس سے بہتر طریقے سے نہیں دیا جا سکتا تھا۔

(۸) رُوِیَ عَنْ اَبِیْ بَکْرِنِ الصِّدِّیْقِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلٰی اَعْوَادِ الْمِنْبَرِ یَقُوْلُ ، اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَۃٍ فَاِنَّہَا تُقِیْمُ الْعِوَجَ وَتَدْفَعُ مِیْتَۃَ السُّوْءِ وَتَقَعُ مِنَ الْجَائِعِ مَوْقِعَہَا مِنَ الشَّبْعَانِ

(زاد راہ بحوالہ ترغیب)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہتے ہیں کہ میں نے (مسجد نبویؐ کے) منبر پر صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا : اے لوگو آتش دوزخ سے بچو خواہ کھجور کا ایک ٹکڑا ہی دے کر کیونکہ صدقہ کجی (اخلاق اور فکر اور عمل کی) کو راستی سے بدلتا ہے۔ مرگ زشت سے محفوظ رکھتا ہے اور بھوکے کو شکم سیر جیسے آدمی کی سی تسلی بخشتا ہے۔

۹۔ عَنْ اَبِیْ ہُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَوْ کَانَ لِیْ مِثْلُ اُحُدٍ ذَہَبًا لَیَسُرُّنِیْ اَنْ لَا یَمُرَّ عَلَیَّ ثَلٰثُ لَیَالٍ وَ عِنْدِیْ مِنْہُ شَیْءٌ اِلَّا شَیْءٌ اَرْصُدُہٗ لِدَیْنٍ (بخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگر میرے پاس کوہ احد کے برابر بھی سونا ہوتا تو بھی مجھے مسرت اس بات سے ہوتی کہ وہ تین راتوں سے زیادہ میرے قبضے میں نہ رہے (اس مدت کے اندر ہی میں پہاڑ کے برابر سونے کو اللہ کی راہ میں خرچ کردوں) ہاں اتنا ضرور بچا رکھتا جتنا ادائے قرض کے لیے مطلوب ہوتا۔

۱۰۔ عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، رسول

صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اتَّقُوا الظُّلْمَ فَإِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاتَّقُوا الشُّحَّ فَإِنَّ الشُّحَّ أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حَمَلَهُمْ عَلٰى أَنْ سَفَكُوا دِمَاءَهُمْ وَاسْتَحَلُّوا مَحَارِمَهُمْ (رواہ مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ظلم وجور سے اجتناب کرو اس لیے کہ ظلم روز قیامت کی تاریکیاں ہے اور بخل وحرص سے احتراز کرو کیونکہ یہی وہ شے تھی جس نے تم سے پہلے قوموں کو ہلاک کیا۔ اسی نے ان کو باہم خونریزی پر اُبھارا اور ایک دوسرے کی حرمتوں کو حلال کر لینے پر برانگیختہ کیا۔

(۱۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَارَسُولَ اللهِ أَيُّ الصَّدَقَةِ أَعْظَمُ أَجْرًا قَالَ أَنْ تَصَدَّقَ وَأَنْتَ صَحِيحٌ شَحِيحٌ تَخْشَى الْفَقْرَ وَتَأْمُلُ الْغِنٰى وَلَا تُمْهِلُ حَتّٰى إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُومَ قُلْتَ لِفُلَانٍ كَذَا وَقَدْ كَانَ لِفُلَانٍ (متفق علیہ)

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں: ایک شخص نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول کس صدقے میں خیر کی توقع زیادہ ہے" فرمایا "اس صدقے میں جو تم اس حال میں کرو کہ صحت منداور تندرست ہو، تم نے مال ومتاع سنبھال رکھا ہو، محتاجی سے اندیشہ ناک ہو، دولت وثروت کے آرزو مند ہو۔ یہ نہیں کہ (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو ٹالتے رہو یہاں تک جب جان حلق میں اٹکے تو لوگوں کے حق میں وصیت کرنے لگو، یہ اس کو، یہ اس کو حالانکہ اب وہ تو فلاں کا ہو ہی گیا۔

۱۲- عَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَادِرُوا بِالصَّدَقَةِ فَإِنَّ الْبَلَاءَ لَا يَتَخَطَّاهَا (رواہ رزین)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صدقہ دینے کے لیے سبقت کرو اس لیے کہ مصیبت اس کو پھلانگ کر تم تک نہیں پہنچ سکتی۔

۱۳- عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِشَرِّ النَّاسِ مَنْزِلًا قِيلَ نَعَمْ قَالَ الَّذِي يُسْأَلُ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "میں تمھیں بتاؤں مرتبہ ومقام کے لحاظ سے بدترین آدمی کون ہے" عرض کیا گیا "ہاں" فرمایا وہ جو

بِاللّٰہِ وَ لَا یعطی بِہٖ۔

(رواہ احمد)

اللہ کا حوالہ دے کر خود تو مانگتا ہے لیکن اللہ کے نام پر کچھ دیتا نہیں۔

۱۴۔ عَنْ عائشۃَ انّھُمْ ذبحُوا شاۃً فقال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ما بقی منھا قالت مابقی منھا اِلَّا کتفھا قَالَ بقی کُلُّھَا غیرکتفِھَا (رواہ الترمذی)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بیان ہے کہ بکری ذبح ہوئی (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہ تھے تشریف لائے تو) دریافت فرمایا کتنی بکری رہ گئی (تقسیم سے کتنا گوشت بچ گیا) عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا "کچھ نہیں صرف دست کا حصہ رہ گیا ہے" فرمایا؛ "کل (جو تقسیم گیا) باقی رہ گیا بجز دست کے (جو چیز اللہ کی راہ میں تقسیم کردی جاتی ہے وہ توشہ آخرت بن جاتی ہے اور باقی رہتی ہے۔ جو کھایا وہ فنا ہوا، جو پہنا وہ بوسیدہ ہوا۔)

۱۵۔ عَنْ عَمْرِو بنْ شُعَیبٍ عَنْ ابیہِ عَنْ جَدِّہٖ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَ تَصَدَّقُوْا وَالبسوا مَا لَمْ یُخَالِطْ اِسْرَافٌ وَّلَا مَخِیْلَۃٌ (مشکوٰۃ)

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے والد ما جد رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کھاؤ، پیو اور صدقہ کرو (یہ سارے کام) درست ہوں گے جب تک ان کاموں میں فضول خرچی اور خود بینی کو دخل نہ ہوگا۔

۱۶۔ و عَنْ سراقۃ بن مالک ان النَّبِی صلی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسلم قال اَلا اَدُلُّکُمْ عَلٰی اَفْضَلِ الصَّدَقَۃِ اِبْنَتُکَ مَرْدُوْدَۃً لَیْسَ لَھَا کَاسِبٌ غَیْرُکَ۔

(ابن ماجہ)

سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " میں تمھیں بتلاتا ہوں سب سے زیادہ فضیلت کس صدقے کو حاصل ہے۔ تمھاری بیٹی جو ٹھکرا دی گئی ہو (مطلقہ یا بیوہ ہو) اس کا کوئی کمانے والا نہ ہو سوا تمھارے (انفاق کے سلسلے میں حقوق کی ترجیحات کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے)

۱۷۔ عن ابی ھریرۃ قال یارسول اللہ ای الصدقۃ افضل قال جھد المقل وابدأ بمن تعول (مشکوٰۃ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ انھوں نے دریافت کیا " اے اللہ کے رسول کس صدقے کو زیادہ فضیلت حاصل ہے فرمایا نادار اور مفلس کی کوشش ـــــــ مگر ابتدا، زیر کفالت اشخاص کرو (آمدنی تھوڑی ہے پھر بھی آدمی تنگی ترشی سے کچھ بچا کر اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ اس کی بڑی قدر و قیمت ہے مگر ترجیح زیر کفالت اشخاص کے حق کو ہے)

۱۸۔ عَنْ ابی ھریرہ وحکیم ابن حزام قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہ صَلَّی اللہ علیہ وَسَلَّم خَیْرُ الصَّدَقَۃِ مَا کَانَ عَنْ ظَھرِ غِنیً وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ (بخاری ومسلم)

حضرت ابوہریرہ اور حکیم ابن حزام رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہترین صدقہ وہ ہے جو خوش حالی برقرار رکھ کر کیا جائے لیکن ابتدا ر بہر حال زیر کفالت اشخاص سے ہونی چاہیے۔

۱۹۔ عَنْ اَبِی ھَرِیرَۃ قال قَال رَسُوْلُ اللہ صَلَّی اللہ علیہ وَسلم دینار انفقتہ فِیْ سبیل اللہِ و دینارٌ انفقتہ رَقبۃ وَ دِیْنَارٌ تَصَدَّقْتَ بہ عَلیٰ مِسْکِیْنٍ وَ دِیْنَارٌ اَنْفَقْتَہٗ عَلیٰ اَھْلِکَ اَعْظَمُھَا اَجْراً الَّذِیْ انفقتہ عَلیٰ اَھْلِکَ (رواہ مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ایک دینار تو وہ ہے جو تم نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔ ایک وہ ہے جس سے تم نے کسی کی گردن چھڑائی (غلام کو طوق غلامی سے چھٹکارا دلایا) ایک وہ جو تم نے کسی مسکین کو دیا اور ایک وہ ہے جو تم نے اپنے گھر والوں پر صرف کیا سب سے زیادہ اجر اسکا ہے جو تم نے اپنے گھر والوں پر خرچ کیا۔ (اس لیے کہ وہ رقم ادائگی حقوق اور ایک لازمی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے پر صرف ہوئی)

عَنْ اَبِی مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَنْفَقَ الْمُسْلِمُ نَفَقَۃً عَلٰی اَھْلِہٖ وَھُوَ یَحْتَسِبُھَا کَانَتْ لَہٗ صَدَقَۃً (متفق علیہ)

حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی مرد مسلمان اپنے اہل و عیال پر رضائے الٰہی کی طلب کے جذبے (احکام الٰہی کی بجا آوری کی نیت) سے کچھ خرچ کرتا ہے تو (ہرچند کہ اس کا یہ خرچ کسی دوسرے پر نہیں اپنے ہی اہل و عیال پر پڑ رہا ہے) یہ خرچ اس کے لیے اجر و ثواب کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

۲۱- عَنْ سُلَیْمَانَ بِنْ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلصَّدَقَۃُ عَلَی الْمِسْکِیْنِ صَدَقَۃٌ وَھِیَ عَلٰی ذِی الرَّحِمِ ثِنْتَانِ صَدَقَۃٌ وَصِلَۃٌ (احمد۔ ترمذی۔ نسائی)

حضرت سلیمان بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسکین پر صدقہ تو محض صدقہ ہے (اس کے اجر کا مستحق بناتا ہے لیکن رشتہ دار پر صدقہ کرنے کا دوہرا اجر ہے۔ صدقے کا ثواب اور پاس قرابت (صلہ رحم) کا ثواب

۲۲- عَنْ ابی ھریرۃ قال جاء رجل الی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال عندی دینار قال انفقہ علی نفسک قال عندی آخر قال انفقہ علی ولدک قال عندی آخر قال انفقہ علی اھلک قال عندی آخر قال انفقہ علی خادمک قال

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا میرے پاس ایک دینار ہے، فرمایا، اپنے اوپر خرچ کرو، اس نے عرض کیا میرے پاس ایک دینار اور ہے" فرمایا" اپنے بیٹے پر خرچ کرو" آنے والے نے عرض کیا" ابھی ایک دینار اور ہے میرے پاس" فرمایا" اپنے گھر والوں پر خرچ کرو" وہ بولا" ابھی ایک اور ہے، فرمایا" اپنے خادم پر خرچ کرو" اس شخص نے عرض کیا" ابھی ایک دینار اور ہے" فرمایا" اب تم بہتر جانتے ہو تمھارے

عندی آخر قال انت اعلم

(مشکوٰۃ، بحوالہ ابوداؤد)

۲۳۔ عَنْ سَعِید بن وَقاص قَالَ جَاءَ نِی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وَسَلَّمَ یَعُوْدُنِی فِی عَامِ حجۃ الوَداع مِنْ وَجْعٍ اِشْتَدَّ بِی فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنِّی قَدْ بَلَغَ بِی مِنَ الوَجْعِ مَا تَرٰی وَاَنَا ذو مَالٍ وَلَا یَرِثُنِی اِلَّا ابنۃٌ اَفا تَصَدَّقُ بِثُلُثَی مالی قَالَ لَا قُلْتُ فَالشَّطْرُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ فَقَالَ لَا قُلْتُ فالثُّلُث یا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اَلثُّلُثُ وَالثُّلُثُ کثیرٌ اِنَّکَ اَنْ تَذَرَ وَرَثَتَکَ اغنیاء خیرٌ مِنْ اَنْ تَذَرَھُمْ عَالَۃً یتکففون النَّاس وانک لَنْ تنفق نفقۃً تبتغی بھا وجہ اللّٰہِ اِلَّا اُجِرْتَ بِھَا حَتّٰی اللُّقمَۃَ ترفعھا اِلٰی فِیْ امْرَاَتِکَ (متفق علیہ)

رشتہ داروں، پڑوسیوں اور ساتھیوں میں کون زیادہ تمھاری امداد کا مستحق ہے)

حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: حجۃ الوداع کے سال جب میں درد شدید میں مبتلا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کو تشریف لائے میں نے عرض کیا شدت درد نے میرا جو حال کر دیا ہے آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ میں مالدار آدمی ہوں اور ایک بیٹی کے سوا میرا کوئی وارث نہیں ہے۔ میں اپنے مال کا دو تہائی حصہ صدقہ نہ کر دوں؟ (مطلب تھا کہ ایک تہائی بیٹی کے لئے چھوڑ دوں) آپ نے فرمایا "نہیں" میں نے عرض کیا" اچھا تو نصف مال صدقہ کر دوں (نصف بیٹی کے لیے رہ جائے گا) فرمایا "نہیں" میں نے عرض کیا" تو پھر ایک تہائی صدقہ کر دوں اے اللہ کے رسول" فرمایا" ایک تہائی" اور ہاں ایک تہائی بہت ہے۔ تم اپنے ورثاء کو دولت مند چھوڑ کر دنیا سے) جاؤ یہ بہتر ہے اس سے کہ تم انھیں تنگ حال چھوڑو، وہ لوگوں کے دست نگر ہوں۔ (بنیادی بات یہ ہے کہ تم جو کچھ بھی خرچ کرو اس سے مقصود رضائے الٰہی ہو گا تو تم کو اجر ملے گا یہاں تک کہ (اگر ادائے حقوق سے متعلق اللہ کے حکم کی اطاعت کے جذبے سے) اپنی ہی بیوی کے منھ کی طرف ایک لقمہ بڑھاؤ گے (تو وہ بھی نیکی شمار ہو گا اور اس کا

اجر ملے گا)

وعنہٗ (ابی ھریرۃ) قال قال رسولُ اللّٰہ صلیَّ اللّٰہ علیہ وسلم مَا نقصتْ صدقۃٌ من مَالٍ وما زاد اللّٰہ عبْدًا بعفوٍ الاّ عزًّا وما تواضعَ احدٌ الاّ رفعہٗ (رواہ مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صدقہ مال کو کم نہیں کرتا ہے۔ اور کوئی شخص درگذر سے کام لیتا ہے تو اللہ اس کی عزت میں ضرور اضافہ کرتا ہے نیز جو شخص تواضع اختیار کرتا ہے اللہ اس کا مرتبہ بلند ہی کرتا ہے۔

عَنْ حارثۃ بن وَھَبْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہ صَلَّی اللّٰہ علیہ وَسَلَّم تَصَدَّقُوْا فاِنَّہ یاتی علیکم زمانٌ یمشی الرَّجُلُ بِصَدَقَتِہٖ فَلَا یَجِدُ مَنْ یَقْبَلُھا یَقُوْلُ الرَّجُلُ لَوجِئْتَ بالْاَمس لَقَبِلْتُھا فَاَمَّا الْیَوْمَ فلاحاجۃ لِیْ بِھَا (متفق علیہ)

حضرت حارثہ بن وہب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ کرلو اس لیے کہ یقیناً تم پر ایک وقت ایسا آنے والا ہے کہ ایک شخص صدقہ دینے چلے گا تو اس کو صدقہ لینے والا کوئی نہ ملے گا۔ جس کو دینا چاہے گا وہ کہے گا آپ کل آئے ہوتے تو میں اس کو قبول کرلیتا مگر آج تو مجھے اس کی حاجت ہی نہیں ہے۔

انفاق معاشرے کی معاشی بحالی میں مدد و معاون ہوتا ہے۔ اس کے سبب معاشرہ "قلت" کا شکار نہیں ہوتا بلکہ عام خوش حالی میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں پورے معاشرے کی اجتماعی و انفرادی معاشی سطح بلند ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا حدیث میں اس بات کا اشارہ موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت اور معیشت کی معقول اور مفید ضابطہ بندی کے نتیجے میں تیزی کے ساتھ معاشی فراغت وجود پذیر ہوئی جس کی بشارت اس حدیث کے علاوہ بھی متعدد احادیث میں مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔

مسلمانوں کا نظام تعلیم

کمزوریاں اور تدارک

جناب محمد حبیب الدین احمد، رجسٹرار جامعۃ دارالہدیٰ حیدرآباد

انگریزوں کے زمانہ میں جو نظام تعلیم اس ملک میں رایج ہوا وہ ایسا نہیں تھا کہ جس سے مسلمانوں کی خودی بیدار ہوتی اور ان کی نسلیں خود اپنی تاریخ، فلسفہ اور ملّی مقاصد سے آشنا ہوتیں بلکہ انھوں نے یہ نظام تعلیم اس لیے جاری کیا تھا کہ اس ملک میں جو اقتدار انھیں حاصل ہو گیا تھا اس کی گاڑی کھینچنے کے لیے انھیں دیسی قلی حاصل ہوتے رہیں۔ لارڈ مکالے اور اس کی ذریات کو ہمارے ساتھ اتنی ہمدردی نہیں ہو سکتی کہ وہ اس ملک میں ایسا نظام تعلیم جاری کرتے جو ہم کو اپنے نصب العین سے آشنا کرتا۔

پندرہویں صدی میں جب انگلستان نے پارلیمنٹ کے ذریعہ قائم ہونے والی کمپنیوں کی وساطت سے بین الاقوامی تجارت کا ایک عالمی جال پھیلایا تو یورپ کے عیسائی پادریوں نے اس بات کو محسوس کر لیا کہ یہ ان کے لیے مشرق میں اثر و نفوذ کا نادر موقع ہے۔ اس مقصد کے لیے ایشیا و افریقہ کے تقریباً تمام اہم تہذیبی مراکز کی طرف عیسائی مبلغین بھیجے گئے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی مشنری تعلیمی ادارے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ عیسائی پادریوں کو تعلیم و تبلیغ کے مواقع فراہم کرے اور جہاں جہاں ان کی کوٹھیاں قائم ہوں وہاں تعلیم کی ذمہ داریاں ان کے سپرد کرے نیز اپنے تجارتی جہازوں پر بھی ان کو کام کرنے کا موقع دے۔ ہندوستان میں اس پالیسی کے تحت کمپنی کے قدم رکھنے کے فوراً بعد ۱۶۱۴ء میں مشنری مقاصد کے لیے تعلیم کا آغاز کیا گیا۔ چنانچہ برطانوی پارلیمنٹ نے ایک Missionary clause منظور کی جس کے ذریعہ لازم کیا گیا کہ کمپنی کے ہر جہاز، ہر فیکٹری اور ہر مرکز پر عیسائی مبلغین کا بندوبست کیا جائے اور نو آباد کاروں کے لیے عیسائی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

جیسے جیسے کمپنی کا اقتدار بڑھتا گیا عیسائی مبلغین کی سرگرمیاں بڑھتی گئیں اور خصوصیت سے ان کے نئے نئے تعلیمی ادارے وجود میں آئے۔ یہ اسکول نہ صرف عیسائیوں اور نو آبادکاروں

کے لیے کھولے گئے بلکہ غیر عیسائیوں اور ہندوستان کے عام باشندوں کے لیے بھی قائم کیے گئے اور بالآخر مسلمانوں نے اس کے خلاف پوری قوت سے آواز اٹھائی جبکہ ہندوؤں نے بالعموم ان اداروں سے فایدہ اٹھایا۔ اٹھارویں صدی کے اختتام تک اس اجتماعی ردعمل کا اثر یہ ہوا کہ کمپنی کے حکام کو سیاسی مصالح کی بنا پر اپنی پالیسی میں ایک گونہ نرمی پیدا کرنی پڑی۔ کمپنی کے وہ حکام جو زیادہ بالغ نظر اور فہم تھے وہ مغربی تعلیم تو ضرور دینا چاہتے تھے لیکن ان کا اصرار تھا کہ یہ تعلیم مشرقی علوم کی سرپرستی کے ساتھ ہونا چاہیے اور مشرقی علوم میں بھی بنیادی اہمیت فکر وفن کو نہیں بلکہ زبان وادب کو دینی چاہیے۔ اس مقصد کے لیے اولین اہمیت سنسکرت اور ثانوی اہمیت عربی اور فارسی کو دی جائے۔ مدرسوں اور پاٹھ شالوں کو قائم رہنے دیا جائے اور اعلیٰ مذہبی تعلیمی اداروں کو مالی مدد بھی دی جائے اور پنڈتوں ومولویوں کو مختلف قسم کے انعامات وخطابات سے بھی نوازا جائے۔ یہ وہ گروہ ہے جسے مغربی مستشرقین کا مکتب فکر کہا جاتا ہے۔ ان ہی کے زیر اثر ۱۷۸۱ء میں کلکتہ کا مدرسہ اور بنارس کا سنسکرت کالج قائم ہوئے۔ نیز سنسکرت پر تحقیقات کا آغاز ہوا، پرانی کتابیں شائع کی گئیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ سارے وسائل ہندو لٹریچر کی اشاعت پر صرف ہوئے اور مسلمانوں کی ایک بھی قابل ذکر چیز شائع نہیں کی گئی۔

اس دور کے جائزے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ کمپنی کے حکام کوئی سخت گیر پالیسی پر آمادہ نہ تھے اور وہ مقامی نظام سے تصادم مول لئے بغیر مغربی تعلیم اور خصوصاً مشنری تعلیم کی سرپرستی کرنا چاہتے تھے اور ہندوستان میں اپنے نظام تعلیم وتمدن کو رواج دینا چاہتے تھے غالباً سیاسی مصالح مجبور کرتے تھے کہ کھل کر یہاں کے نظام سے ٹکراؤ نہ لیں اور ایسی پالیسی اختیار کریں جس سے یہاں کا تعلیمی نظام سسک سسک کر اپنی موت آپ مر جائے اور ایک دوسرا نظام فطری رفتار کے ساتھ مکمل غلبہ وتسلط حاصل کرلے اور انھیں یہاں کے نظام کو تشدد کے ساتھ مٹانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ گویا سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے مغربی مورخین اس دور کو غیر جانب داری کا دور قرار دیتے ہیں حالانکہ اس دور کی پالیسی نہایت ہوشیاری اور عیاری سے بنائی گئی تھی۔ آخری مقاصد اس کے بھی وہی تھے لیکن وہ اس کام کو بتدریج تدبیر کے ساتھ کرنا چاہتے تھے۔ ہم ان کی اس پالیسی کو Slow poison ing کی پالیسی کہہ سکتے ہیں۔

کمپنی کی اس پالیسی کی توثیق observation state policy کے چارٹر سے بھی ہوتی ہے۔ جس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

"ہمارا لائحہ عمل یہ ہوگا اور ہم اس کو اس احساس کے ساتھ پیش کر رہے ہیں کہ یہ بات ہماری قوت و اختیار میں ہے کہ ہم اہل ہند کو بتدریج سب سے پہلے اپنی زبان سکھائیں پھر اس زبان کے ذریعہ اپنے ادب کی آسان تخلیقات سے متعارف کرائیں جو متنوع موضوعات پر موجود ہیں۔ ہماری اس بات پر بے صبری کے ساتھ چیں بہ چیں نہ ہوا جائے۔ آہستہ آہستہ ہم اس ذریعے سے اہل ہند کو اپنے فلسفے اور بالآخر اپنے مذہب تک لے آئیں گے۔ ان تمام کا حصول آہستہ آہستہ اور پوری خاموشی کے ساتھ اہل ہند کے نظام بد کو نیست و نابود کر دے گا"،

یہ تھی وہ فکری بنیاد جس پر نئی برطانوی تعلیمی پالیسی قائم ہوئی اور جسے مکالے نے ترقی دے کر ایک فلسفہ اور ایک نظام بنا دیا۔

قومی نقطہ نظر سے اس زمانہ میں ہندوستان میں چند اہم رجحانات رونما ہوئے جن میں سے ہر ایک کے اثرات تعلیم کے دایرے پر بھی مرتب ہوتے۔ ہندوؤں کا ردعمل یہ تھا کہ انھوں نے نئی تعلیم کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور مسلمانوں سے سبقت لے جانے کی کوشش کی ہندوؤں کے ایک طبقہ نے ہند و تہذیب اور تاریخ کے نظر انداز کیے جانے پر توجہ ضرور کیا لیکن بہ حیثیت قوم ان کا رویہ تعاون و اشتراک عمل کا تھا اس کے برعکس مسلمانوں میں دو متخالف رجحانات رونما ہوئے۔ سواد اعظم نے نئی تعلیم کا بائیکاٹ کیا۔ محض اس لیے نہیں کہ اس میں انگریزی کی تعلیم تھی کیونکہ محض انگریزی کی تعلیم پر انھیں کوئی اصولی اعتراض نہ تھا اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے یہ فتویٰ بھی دیا تھا کہ انگریزی زبان سیکھنے میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ مسلمانوں کا اصل اعتراض یہ تھا کہ نئی تعلیم اپنے مزاج، اپنے مقاصد، اپنے نصاب تعلیم اور اپنے اجتماعی ماحول کے اعتبار سے دین اسلام اور اسلامی ثقافت سے کاٹنے اور دور لے جانے والی چیز تھی اور اس کی روح پر مادیت اور عیسائیت کا غلبہ تھا۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کا رویہ عدم تعاون کا تھا اور یہ بڑی حد تک پہلی جنگ عظیم تک رہا۔ ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں کا یہ گروہ کوئی انقلابی اقدام کرنے سے اپنے آپ کو معذور پاتا تھا۔ اس لیے اس نے جس بات کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی وہ یہ تھی کہ اپنے علمی سرمایہ کو جس حد تک محفوظ کیا جا سکتا ہو محفوظ کر لے اور اس کو طوفان کی زد سے بچا لے۔ یہ ایک فاعلانہ نہیں بلکہ ایک منفعلانہ ردعمل تھا جس پر حالات

نے ان کو مجبور کر دیا تھا لیکن مسلمان نیا راستہ نکالنے کے لیے برابر پریشان اور مضطرب رہے اور ایک قابل ذکر کوشش ندوۃ العلما کے قیام کی صورت میں انھوں نے کی جس میں قدیم و جدید کے امتزاج کی طرف قدم اٹھایا گیا نیز ہر موقع پر مسلمانوں نے یہ مطالبہ کیا کہ جدید تعلیمی اداروں میں کم از کم ان کی مذہبی تعلیم کی گنجائش پیدا کی جائے۔ نیز یہ کہ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے خصوصی انتظامات کیے جائیں تاکہ مسلمانوں میں تعلیم کا اوسط بلند ہو سکے۔

مسلمانوں میں دوسرا ردعمل ان کا تھا جنھوں نے نئی تعلیم کو قبول کر لیا اور اس بات کی کوشش کی کہ جس حد تک اس میں اسلامیات کی پیوندکاری کر سکیں کر لیں لیکن بہ حیثیت نظام کے نئی تعلیم ہی کو قبول کر لیں۔ یہ ردعمل بھی منفعلانہ تھا لیکن ایک دوسری نوعیت کا اول الذکر گروہ مقاومت کی روش اختیار کیے ہوئے تھا اور آخر الذکر مفاہمت کی

اس مختصر سے جائزے سے اس دور کے تعلیمی نظام کی جو خصوصیات نمایاں طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں

۱۔ یہ نظام تعلیم نہ ملک کی ضرورتوں کو پورا کرتا تھا اور نہ ملت کی اور نہ ہی اس تعلیم کا کوئی تعلق ہندوستان کی سرزمین اور یہاں کی تاریخ، تمدن اور ثقافتی ضروریات سے تھا۔ بین الاقوامی پیمانے پر مشرق و مغرب کی جو کشمکش رونما تھی اور جو نظریاتی تصادم درپیش تھا اس تعلیم میں اس کا کوئی شعور نہیں پایا جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ یہ تعلیمی نظام محض جی حضوریے تو پیدا کر سکا لیکن ایسے انسان نہ پیدا کر سکا جو نئے حالات میں نئی راہیں نکالتے۔

۲۔ تعلیم کو فلسفہ حیات، مقاصد تعلیم، اخلاقی اقدار اور حقائق زندگی سے کاٹ کر محض تمدنی خوشہ چینی اور ادنیٰ ملازمین کی ایک فوج تیار کرنے میں استعمال کیا گیا۔ یہ ہندوستان کا ہی نہیں خود تعلیم کا بھی المیہ ہے کہ تعلیم کو محض سیاسی اغراض کے لیے آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ مسلمانوں کے نقطہ نظر سے یہ دور سب سے زیادہ تلخ، تباہ کن اور مضرت رساں رہا۔ اس لیے کہ مغربی تعلیم میں اصل ہدف مسلمان ہی تھے اور انگریز اپنی چال میں کامیاب رہا اس لیے کہ انھوں نے محض تعلیم کو ہی تباہ نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کی نئی نسلوں کے ذہن و فکر کو بھی بگاڑا۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر نے کبھی بھی نئے نظام سے سمجھوتہ نہیں کیا اور ہمیشہ اس کے خلاف بغاوت کرتا رہا لیکن یہ کوشش زیادہ موثر نہ ہو سکی۔ ریاست کی ساری قوتوں کے ساتھ جو تباہ کن انقلاب برپا کیا جا رہا تھا اس کا راستہ نہ روکا جا سکا۔ کچھ تو اس سیلاب میں بہ رضا و رغبت بہہ گئے اور کچھ مجبوراً لیکن اپنے کو سنبھالنا

سب کے لیے مشکل ہو گیا۔ اس وقت مسلمانوں کو جو تعلیمی مسئلہ درپیش ہے وہ دراصل اسی تاریخی صورت حال کا پیدا کردہ ہے۔ ہم ایک ایسے نظام تعلیم میں گھرے ہوئے ہیں جو ہماری تاریخ، ہماری ثقافت، ہمارے مذہب، ہمارے ادب اور ہماری روایات ہر ایک کے لیے ایک چیلنج ہے۔

۲۔ جو بات اس نظام تعلیم کے حق میں زیادہ سے زیادہ کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں مغربی فکر و ادب تک رسائی ہوئی اور مغرب کے اصول تنقید کی روشنی میں مشرقی علوم کا از سر نو مطالعہ شروع ہوا۔ ہندوستانی زبانوں میں خصوصیت سے سنسکرت پر تحقیقی کام کیا گیا۔ طباعت اور صحافت نے ایک حد تک ترقی کی۔ مغرب کے سیاسی نظام اور سیاسی جد و جہد کے اسالیب نے یہاں راہ پائی اور انگریزوں کا مقابلہ انگریزوں ہی کے فراہم کردہ ہتھیاروں سے ہوا لیکن ان تمام باتوں کو فراخ دلی سے مان لینے کے باوجود ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ سبب یا ان میں سے کوئی بھی تعلیمی نظام کا مقصد نہ تھا۔ ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ایک ضمنی نتیجے کی ہے اور جو نقصان اس نظام تعلیم نے پہنچایا اس کو ان معمولی تبدیلیوں سے کوئی نسبت نہیں۔

مسلمانوں کا روایتی نظام تعلیم :-

مسلمانوں کے روایتی نظام تعلیم کا جائزہ لیتے ہوئے اگر اس کے پس منظر پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ تعمیر و اصلاح کے داعی جب کبھی بھی سیاست کے دائرے میں خوفناک مزاحمتوں کے سبب پسپا ہوئے ہیں تو وہ اکثر تعلیم کے مورچے سنبھالے ہیں۔ بنو امیہ کے دور میں کٹھن حالات میں اصلاح پسند عناصر نے فقہ و اجتہاد کی مجالس اور اکیڈمیوں کو قائم کیا اور ان کے ذریعہ نوجوان اور ذہین طبقے کو اپنے گرد سمیٹا اور ان کے سینوں میں نظریہ حق اور نظام خیر و فلاح کے بیج ڈالنے کا پورا پورا اہتمام کیا اسی کے ساتھ ساتھ ایسا علمی اور تحقیقی لٹریچر بھی تخلیق کیا جو معاشرے کے مجموعی ماحول پر تادیر اثر انداز ہوتا رہے۔ اسی طرح تاتاریوں کی تاخت کے بعد جب دوسرا بڑا دھکا تعمیری رجحانات کو پہنچا تو اسی کے ردعمل کے تحت تصوف نے ایک نیا محاذ قائم کر دیا۔ یہ خانقاہی نظام تعلیم و تربیت تھا۔ اس کا اصل منشا یہ تھا کہ ناسازگار حالات میں عملی سیاست سے الگ تھلگ رہ کر ایسے حلقے منظم کر دئے جائیں جن میں سچی خدا پرستی، دنیا سے بے نیازی، ایثار و قربانی، حسن خلق اور دعوت الی اللہ کا ولولہ موجود ہو۔ گوشہ ہائے خلوت میں بیٹھ کر اس طرح کا سرمایہ محفوظ کرنے کا ایک عبوری دور گذارا جائے اور پھر جب بھی حالات موقع دیں تو اس سرمایہ کو

اجتماعی دائرے میں کھپا دیا جائے۔ مگر بدقسمتی سے انفرادی روحانیت کا کیف اصل مقصود سے تغافل کا موجب بن گیا اور تصوف اجتماعیت کے مقابلے میں بجائے خود ایک مستقل نظام بن کر رہ گیا۔ اسی طرح ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد جب نظام حیات کی باگ ڈور پوری طرح الحاد اور سیکولرزم کے قبضے میں چلی گئی تو دعوت اسلامی کے علم بردار مسجدوں حجروں میں تعلیمی مراکز کھول کر بیٹھ گئے چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ ایک وقت میں دیوبند نے بھی اور ندوہ نے بھی اپنے طرز فکر کے کردار تیار کر کے سیاسی و اجتماعی سرگرمیوں پر بڑا اثر ڈالا لیکن یہاں بھی وہی ہوا کہ آہستہ آہستہ اصل نصب العین اور اس کے وسیع تقاضے نگاہوں سے اوجھل ہوتے چلے گئے اور ہماری دینی درس گاہیں فقط خطیب، مناظر، مفتی اور مدرس پیدا کرنے میں لگ گئیں۔

ہندوستان میں مغربی نظام تعلیم سے عدم اطمینان اور بے چینی کے شدید ردعمل کے طور پر مسلمانوں میں چند تعلیمی تحریکات اٹھیں اور ان رجحانات کی نمایندہ درس گاہیں قایم کی گیئں لیکن ان درس گاہوں کے قیام کے پیچھے جو جذبہ غالب اور کارفرما تھا وہ نئے نظام تعلیم سے کلی انقطاع اور عدم تعاون اور پرانے نظام تعلیم کے تحفظ و بقا کا تھا۔ جس طرح طوفان کے تھپیڑوں سے ٹوٹ جانے والی کشتی کے ملاح ٹوٹے ہوئے تختوں سے چمٹ جاتے ہیں اسی طرح دم توڑتے ہوئے پرانے نظام تعلیم کے چند اجزا کو سینے سے لگا لیا گیا اور بس اسی میں نجات سمجھی گئی۔ اسلام کو جو نئے فکری اور دینی چیلنج درپیش تھے اس کا کوئی شعور اس نظام تعلیم میں نہیں پایا جاتا تھا۔

میں اس سخت جان دینی نظام تعلیم کے حق میں اپنے جذبہ اعتراف کو پیش کرتا ہوں کہ نہایت ناسازگار ماحول میں اس نظام نے اپنے آپ کو سالہا سال سے برقرار رکھا ہے۔ وہ اشخاص اور ادارے بڑے ہی قابل قدر ہیں جنھوں نے اسلام کے بالکل خلاف کام کرنے والے نظام اجتماعی کے دایرے میں بہت ہی کم آمدنیوں پر دینی تعلیم گاہوں کو چلایا اور روکھی سوکھی کھا کر اور درویشانہ رہن سہن اختیار کر کے ایک ملی خدمت کے لیے بیٹھ گئے۔ پھر قابل داد ہیں وہ فرزندان ملت بھی جنھوں نے دنیوی ترقیوں سے قطع نظر کر کے دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے زندگیاں کھپا دیں۔ ان ہی قربانیوں کا یہ کم سے کم حاصل ہمارے سامنے ہے کہ کسی نہ کسی درجے میں اسلام کے آثار فضا میں باقی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری تعلیمی تحریکیں اولاً ہمیشہ ایک انقلابی و تعمیری رجحان کے تحت رونما ہوتی رہیں اور ان کا منشا نظام حق کے ایسے علم بردار پیدا کرنا تھا جو نظریہ اسلامی

کے امانت دار ہوں اور دنیاوی مفاد کو تج دے کر رضائے الٰہی کے لیے انقلابی تحریک بپا کرنے میں موزوں وقت پر اپنا حصہ لے سکیں۔ اب یہ اس ملت کی بدقسمتی ہے کہ آج جب کہ حق و باطل کی کشمکش زوروں پر ہے اور ایک فیصلہ کن مرحلہ درپیش ہے تو ہمارے ذہنی مراکز تعلیم اس معرکے کی پشت پناہی کرنے اور اس میں بہترین افراد سے کمک پہنچانے کا فریضہ ادا نہیں کر رہے ہیں۔ ان درسگاہوں کے فارغین کہیں بھی ان قابلیتوں اور اوصاف سے متصف نہیں ہیں الا ماشاء اللہ جن سے یہ زندگی کی گاڑی کے ڈرائیور بن سکیں۔ ہر جگہ یہ صرف ایک بریک کا کام دے رہے ہیں جس کا کام اس سے زیادہ نہیں کہ وہ مغرب زدہ اور دین کے علم و فہم سے عاری لوگ جوامت مسلمہ کی گاڑی کو نہایت تیزی کے ساتھ اسلام کی مخالف سمت میں لیے جارہے ہیں اس میں رکاوٹ پیدا کرے اور رفتار کو سست کرتا رہے۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہر ملک میں یہ بریک روز بروز کمزور ہوتا جارہا ہے بلکہ بعض ملکوں میں تو بدمست ڈرائیور اس بریک کو توڑ چکے ہیں اور الحاد و فجور کے راستے پر بے تحاشا اپنی قوم کو دوڑائے لیے جارہے ہیں۔ قبل اس کے کہ وہ وقت آئے جبکہ یہ بریک ٹوٹ چکا ہو۔ ہمیں ایک ایسا نظام تعلیم قائم کرنے کی فکر کرنی چاہئے جس سے بیک وقت دین و دنیا کے عالم تیار ہوں اور جس سے نکلنے والے بریک کی جگہ نہیں بلکہ ملت کی گاڑی کے ڈرائیور کی جگہ سنبھالنے کے قابل ہوں اور اپنے اخلاق و کردار کے اعتبار سے اور ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی مغربی طرز تعلیم کی درس گاہوں سے فارغ ہونے والوں کی نسبت فائق تر ہوں۔

دینی درس گاہوں میں جو جمود آ گیا ہے اس کو دور کرنے اور ان کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ درس گاہیں زندگی کے سیاسی و معاشی مسایل اور تمدنی و اجتماعی معاملات سے کٹے ہوئے انفرادی مذہب کی تعلیم نہ دیں بلکہ ایک تحریکی فلسفے اور ایک اجتماعی نظام زندگی کی تعلیم دیں۔ بدقسمتی سے اب تک کی تعلیمی سرگرمیاں انفرادی مذہب سکھانے کے لیے اسلوب پر جاری ہیں۔ چند عقاید اور ان کے متعلق کلامی بحثیں، بنیادی عبادات اور ان سے متعلق فقہی مسائل، مختلف فرقوں کے اعتقادی نظام کے مناظرانہ و مجادلانہ طریق فکر، مسلمانوں کے پرسنل لا کی حد تک بالکل مقلدانہ اور غیر اجتہادی دین سے قانونی تیاری پر مشتمل ہے۔ یہ نظام تعلیم صدیوں پرانا ہے جو اُس وقت کے لیے تو موزوں تھا لیکن دور حاضر میں اپنی افادیت کھو چکا ہے کیونکہ یہ برسوں کی کاوشں کے بعد بھی ایسے افراد تیار کر کے نہیں دیتا جو عالم گیر پھیلنے پر زندگی اور تمدن کے وسیع نظریات و مسائل پر ماہرانہ رائے دے سکیں اور جو باطل سے پنجہ آزمائی کرتے ہوئے

ماحول کی تمام سرگرمیوں میں حصہ لے سکیں اور زندگی سے من حیث المجموع دلچسپی لیں۔ اگر اسلام کو غالب اور کارفرما دیکھنا ہے تو اس کے لیے ہمیں ایسے افراد تیار کرنا ہوگا جو فعال اور متحرک ہوں اور اپنے نظریات کی برتری کا پورا پورا شعور رکھتے ہوں۔ ان میں ایسا ذہن پیدا کرنا ہوگا جو دور حاضر کے استدلالی ذہن کو بے تکلفی سے مخاطب کر سکے اور موجودہ باطل نظریات و افکار پر گہری تنقید کے ذریعہ ان کا کھوکھلا پن واضح اور ثابت کر سکے۔ مغربی فلسفے و تہذیب سے مرعوبیت دور کر کے اسلام کو خالص علمی اور استدلالی انداز میں پیش کر سکے۔ یہ صلاحیت دینی مدارس اپنے طلبا میں اس وقت تک پیدا نہیں کر سکتے جب تک کہ انھیں جدید فلسفہ، نفسیات سیاسیات و معشیت کے علوم سکھائے جائیں اور انھیں مغربی نظام حیات کا اسلامی نظام حیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ نہ کرائیں۔ آج اگر ایک داعی حق نظریہ ارتقار کو نہیں جانتا اور وہ ضبط ولادت کے اساسی تصورات سے آگاہ نہیں ہے اور اگر اس کو مارکسزم سے آگاہی نہیں ہے اور بین الاقوامی سیاست کا شعور نہیں ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ چند عقیدوں، عبادتوں، اور اخلاقی ہدایات پر وعظ سنا کر نئی نسلوں کو اپنے گرد سمیٹ سکے گا۔

کوئی بھی نظام تعلیم اسی صورت میں کامیابی کے ساتھ چل سکتا ہے جبکہ وہ اپنے سانچوں میں ایسے انسان ڈھال کر دیتا ہو جو عملاً ایک دور تمدن میں اپنی جگہ بنا سکیں۔ ہر نظریاتی تعلیم کو کارفرما اور کارکن عناصر تیار کرنے ہوتے ہیں اس لیے ہماری درس گاہوں سے طلبا نکلیں تو زندگی کے کارزار تمدن میں کوئی نہ کوئی مقام ان کو طلب کرے۔ ان میں ایسی صلاحیتیں ہوں کہ وہ تمدن میں کسی نہ کسی شعبے یا ادارے کو چلانے کے اہل ہوں۔ وہ میدان میں آئیں تو نظام رائج سے کشمکش کرتے ہوئے معاش کے راستے نکال سکیں۔

ان حقایق کی روشنی میں جب تک پورے نظام تعلیم کی اصلاح حسب ذیل خطوط پر نہیں کی جاتی اس وقت تک مطلوبہ نتایج حاصل نہیں ہو سکتے۔

۱۔ نصاب تعلیم کی اصلاح:۔ جب تک نصاب تعلیم میں دین و دنیا کی تفریق مٹا کر دونوں کو یک جان اور جدید و قدیم کا حسین امتزاج نہیں بنایا جاتا اس وقت تک یہ دور حاضر کے تقاضوں کو کما حقہٗ پورا کرنے سے قاصر رہے گا۔ دینی و عصری علوم کو ایک دوسرے سے مربوط اور نظریاتی آہنگ دیا جائے دوسرے معنی میں عصری علوم کو کلمہ پڑھا کر مسلمان بنا کر تعلیم دی جائے۔

۲۔ اساتذہ کا انتخاب: دوسری بنیادی بات جو اس نظام تعلیم میں ملحوظ رکھی جائے وہ مناسب اور موزوں اساتذہ کا انتخاب ہے۔ طلبا میں اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کا انحصار بڑی حد تک معلمین کے علم و عمل اور طرز فکر پر ہے۔ اساتذہ کا صرف ماہر فن ہونا ہی کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ پورے اور پکے مسلمان بھی ہوں۔ جب ہم اسلامی نظام تعلیم و تربیت پر گفتگو کرتے ہیں تو بالعموم اس پہلو کو نظر انداز کر جاتے ہیں جو ایک باصلاحیت اور پرعزم استاد اپنے شاگردوں کی زندگیاں ڈھالنے میں ادا کرتا ہے۔ اچھے استاد کا نہ ملنا ہماری تعلیم کا اصل المیہ ہے۔ اس وقت یہ مسئلہ کافی اہم ہے کہ قابل اور باصلاحیت افراد کو کیسے اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ ان آسائشوں کو جو زندگی کے دوسرے شعبوں سے وابستگی اور سرکاری ملازمتوں میں حاصل ہوتی ہیں چھوڑ دیں اور ایثار و قربانی سے کام لیتے ہوئے زندگی کے سب سے عظیم میدان عمل، ملت کے تعلیمی اداروں میں قدم رکھیں اور اسلام کی سربلندی کے لیے جد وجہد کریں۔ جب تک ان اساتذہ کو معقول مشاہرہ نہیں دیا جاتا ان کو اس جانب راغب کرنا مشکل ہے۔ ہمیں یہ کام بہر قیمت کرنا ہے کیونکہ کسی بھی نظام تعلیم کی کامیابی کا انحصار اور دوسرے عوامل کی بہ نسبت اساتذہ کی محنت خلوص اور لگن پر ہے۔

۳۔ درسگاہ کا ماحول: درس گاہ میں ایک زندہ اسلامی ماحول پیدا کیا جائے اور اس کا عملی ظہور طلبا و اساتذہ کے لباس، معاشرت، آداب و اطوار میں ہونا چاہئے۔ درس گاہوں میں نمازوں کی پابندی اور شعائر اسلامی کا پاس و لحاظ ضروری ہے۔ اس کے حدود میں فرنگیت اور ہپی ازم کا کلی استیصال کیا جائے تاکہ یہ ماحول طلبا کو اپنی ملی تہذیب پر فخر کرنے کے جذبہ کے ساتھ ساتھ ان میں اسلامی اخلاق و کردار پیدا کرے۔ مختصر یہ کہ درس گاہ اسلامی کلچر کی خادم بن جائے۔

دنیا کی رہنمائی

اگر اسلام دوبارہ دنیا کا رہنما بن سکتا ہے تو اس کی بس یہی ایک صورت ہے کہ مسلمانوں میں ایسے مفکر و محقق پیدا ہوں جو فکر و نظر اور تحقیق و اکتشاف کی قوت سے ان بنیادوں کو ڈھا دیں جن پر مغربی تہذیب کی عمارت قائم ہوئی ہے۔ قرآن کے بتائے ہوئے طریق فکر و نظر پر آثار کے مشاہدے اور حقائق کی جستجو سے ایک نئے نظام فلسفہ کی بنا رکھیں جو خالص اسلامی فکر کا نتیجہ ہو (تنقیحات صد ۱۷)

اخبار وافکار:

تیونس میں اسلامی تحریک پر مظالم

"لے کے ھر بوند نکلتی ھے ھتھیلی پہ چراغ"

محمد مسعود عالم قاسمی

تیونس کے سیکورٹی کورٹ نے ایک مہینہ تک ایک غیر معمولی مقدمہ کی سماعت کے بعد، ۲ر ستمبر ۱۹۸۷ء کو اپنا فیصلہ مکمل کرلیا۔ یہ مقدمہ ان نوے۹۰ افراد کے خلاف دائر کیا گیا تھا جن کا تعلق تیونس کی اسلامی تحریک" حرکۃ الاتجاہ الاسلامی" سے ہے ان میں تحریک کے ممبران، کارکنان ہمدردان اور رہنما جناب پروفیسر راشد غنوشی شامل ہیں۔ ان پر الزام لگایا گیا تھا کہ انھوں نے ایران کی مدد سے حبیب بورقیبہ کی حکومت کا تختہ الٹنے اور اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ الزام کا ایک قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ یہ لوگ اگست ۱۹۸۶ء میں مشرقی ساحل کے ہوٹلوں پر حملوں اور بم دھماکوں میں ملوث تھے۔ جن کے نتیجے میں بارہ برطانوی اور اطالوی سیاح ہلاک ہوگئے تھے اور بورقیبہ حکومت کا تختہ الٹنے کا پلان تنظیم کے رہنما راشد غنوشی نے بنایا تھا۔

جن نوے ۹۰ افراد کے خلاف مقدمہ چلایا گیا ہے حکومت نے ان کے لیے سزائے موت کا مطالبہ کیا تھا۔ مجرم حکومت کی اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے عدالت نے تحریک کے رہنما پروفیسر راشد غنوشی کو عمر قید کی سزا سنائی ہے جبکہ سات کارکنوں کو موت، اور بقیہ افراد کو دو سے بیس سال تک قید بامشقت کی سزا دی ہے۔ نام نہاد سیکورٹی عدالت کی صدارت اٹارنی جنرل ہاشمی زمال نے حکمراں پارٹی کے دو ممبروں کے ساتھ کی۔ (ہندوستان ٹائمز ۲۸ ستمبر ۱۹۸۷ء سہ روزہ دعوت یکم اکتوبر ۱۹۸۷ء)

بی بی سی کی اطلاع کے مطابق جن افراد کو سزائے موت دی گئی ہے ان میں سے دو کو پھانسی دیدی گئی ہے (انا للہ وانا الیہ راجعون) یہ تو وہ سزائیں ہیں جن کا نفاذ حال ہی میں بورقیبہ کی مجرم حکومت نے کیا ہے اس سے پہلے بھی تیونس کی تحریک اسلامی مسلسل ذہنی اور جسمانی اذیت اور ظلم و بربریت کا سامنا کرتی رہی ہے، اس سلسلہ کا عبرت آموز اور شرمناک پہلو وہ ہے جس کا ارتکاب بورقیبہ حکومت نے پردہ نشین خواتین اور

طالبات کے ساتھ کیا ہے۔ ایمینسٹی انٹرنیشنل لندن کے ایڈیٹر کے نام ایک خط میں تحریک کے ایک رفیق نے یہ انکشاف کیا ہے کہ تیونس کی پولس نے صرف تحریک کے ممبروں ہی کو گرفتار نہیں کیا بلکہ انھوں نے معصوم اور پرہیزگار لڑکیوں کو تیونس یونیورسٹی، منوبا یونیورسٹی اور بورقیبہ لسانی اسکول سے یہاں تک کہ سڑکوں پر چلتے ہوئے گرفتار کیا ہے۔ یہ گرفتاری اس وقت شروع ہوئی جب طلبا اور پولیس تصادم میں ایک پولیس کی جان گئی۔ اس کے نتیجہ میں وزیر داخلہ نے حکم دیا کہ جو لڑکی بھی باپردہ نظر آئے اسے گرفتار کر لیا جائے جو کہ مسلمانوں کا باضابطہ لباس ہے۔ ان لڑکیوں کو راہ چلتے روکا گیا ان کو زود کوب کیا گیا اور برسر عام ان کے حجاب کو نوچ کر پارہ پارہ کیا گیا۔ سب سے زیادہ بری چیز جس نے مجھے آپ تک پہونچنے پر مجبور کیا وہ یہ ہے کہ ان مقامات سے جو بیسیوں طالبات گرفتار کی گئیں ان کو جیل میں ڈال دیا گیا اور ان کو برہنہ کر دیا گیا، جس طرح ان کو شب و ستم کا نشانہ بنایا گیا ہم اپنے اندر اس کو بیان کرنے کی طاقت نہیں رکھتے (ایمینسٹی انٹرنیشنل ۱۲ تا ۲۵ جون ۱۹۸۶ء لندن)

رکاوٹیں اور پریشانیاں، جبر و تشدد اور تباہ کاریاں، تعذیب و توہین اور گرفتاریاں، قید و بند کی مشقت اور سزائے موت ان حوصلہ شکن آزمائشوں سے تیونس کے بیدار ذہن مسلمان مسلسل دو چار ہیں اور ان حالات کی وجہ وہ نام نہاد حکومت ہے جو رمضان کے روزے تک رکھنے سے اپنے کارندوں کو روکتی ہے۔ ان مسلمانوں کا جرم اس کے علاوہ کیا ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کرنا چاہتے ہیں اور اللہ کی زمین پر اللہ احکام کے نفاذ کا مطالبہ کرتے ہیں۔

اس پیغام کے ساتھ تحریک اسلامی صرف تیونس ہی میں نہیں بلکہ جہاں کہیں بھی سرگرم عمل ہے باطل اور مفسد طاقتوں کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے اور ظلم و بربریت کا نشانہ بنائی جاتی ہے۔ خواہ وہ بھارت ہو یا پاکستان، بنگلہ دیش ہو یا ترکی، مصر افغانستان اور مرکزی ایشیا ہو یا لیبیا، سیریا اور اریٹیریا ہو یا یوگوسلاویہ۔ خواہ نام نہاد مسلم مملکتیں ہوں یا جمہوری ریاستیں۔ کم و بیش ہر جگہ تحریک اسلامی کو مشکلات و مصائب کے طوفانوں کا سامنا ہے، لیکن جبر و تشدد اور ابتلا و آزمائش کے یہ طوفان کسی بھی جگہ اسلامی تحریک کو مٹانے میں کامیاب نہ ہو سکے، بلکہ تباہ کاری کی ہر کوشش ایک نئی صبح کے طلوع کے امکانات کو قریب کرتی گئی۔ چنانچہ محترم پروفیسر راشد غنوشی کا یہ قول صرف ان کی ذاتی واردات نہیں بلکہ تحریک اسلامی کا ایمان اور اعتماد ہے۔

" اگر مجھے سزائے موت دی گئی تو یہ اللہ کی مرضی پر منحصر ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ میری موت رائیگاں نہیں جائے گی کیونکہ میرے بعد ہزاروں لاکھوں مسلمان ہوں گے جو اس راستے پر چلیں گے۔"

گرفتاری سے پہلے مارچ ۱۹۸۰ء میں شیخ غنوشی سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ مسجد میں خطبہ دینا بند کردیں جسے شیخ ایک اسلامی معلم کی حیثیت سے نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ حکومت نے ان کے دو حالیہ خطبوں کو خاص طور پر ان پر حملہ کا سبب بنایا ایک خطبہ صبر سے متعلق تھا اور دوسرا ایمان پر تھا۔ ان خطبات کا مواد امام غزالی کی احیاء العلوم الدین پر مبنی تھا۔ شیخ غنوشی کے ساتھ تحریک اسلامی کے چالیس کارکنوں کو گرفتار کیا گیا اور اب گرفتار شدہ حضرات کی تعداد تین ہزار سے زیادہ ہو چکی ہے۔ بغاوت اور انقلاب کے الزامات تو بعد میں تراشے گئے اور پھر اس جبر و تشدد کو فرانس میں کچھ لوگوں کی گرفتاری سے جوڑ دیا گیا جو دہشت گردی کی فرانسیسی اور ایرانی سیاست میں ملوث تھے، تیونس کے حکمرانوں کے لیے یہ ایک بڑا ثبوت تھا کہ تحریک کا ایران سے دہشت پسندی میں تعلق ہے۔ ہم نے آزادانہ اور کھلے طور پر کام کرنے کا اسلامی طریق کار اختیار کر رکھا ہے اسے ترک کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ جو لوگ ہماری تنظیمی آزادی کا انکار کرتے ہیں دیر یا سویر ان کو تسلیم کرنا ہوگا۔

س :۔ ایران کے ساتھ آپ کا تعلق کس طرح کا ہے ؟

ج :۔ حکومت کے ترجمان نے ایک عیسائی مائیز جرنلسٹ کو ثبوت میں ایرانی کرنسی پانچ سو ریال کا نوٹ خردہ، لاٹھیاں، سائیکل کے چین وغیرہ دکھایا۔ اس سے پہلے انھوں نے دو ہزار ڈالر کے چیک کی فوٹو کاپی شائع کی جو ویٹیکن میں ایرانی سفیر جناب ہادی خسروشاہی نے ہمارے ایک ممبر کی اہلیہ کے نام ارسال کیا تھا، یہ ایک کھلا اور ریکارڈ شدہ معاملہ تھا۔ خسروشاہی نے محترمہ کے شوہر کی ایک کتاب کے نسخے خریدے تھے اور اس کا زرمبادلہ ارسال کیا تھا۔ اس سے وہ مبینہ الزامات ثابت نہیں ہوتے جو لگائے گئے ہیں۔ ماضی میں ہمارے بعض کارکنوں نے ایران کی زیارت کی تھی جس طرح دوسرے ممالک کے مسلمان کرتے رہے ہیں۔ لیکن ہمارا ایران سے کسی طرح کا تعلق نہیں ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ حرکۃ الاتجاہ الاسلامی۔ ایران کے سیاسی طریق کار پر یقین نہیں رکھتی کیونکہ ایران اور تیونس دو مختلف سیاسی اور سماجی حالات کی نمائندگی کرتے ہیں مزید براں حرکۃ الاتجاہ الاسلامی اخوان المسلمون سے متاثر ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ اخوان اور ایران کے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ خاص طور پر شام میں وحشیانہ طریقہ پر مسلمانوں کے کچلے جانے پر ایران کی خاموشی کی وجہ سے۔

گرفتاری سے پہلے یعنی مارچ ۱۹۸۰ء میں شیخ غنوشی نے اسٹریا کے ایک عربی رسالہ الحوار کو انٹرویو دیتے ہوئے ایرانی حکومت کی پالیسی اور طریقہ کار پر سخت تنقید کی تھی۔ تاہم یہ آپ کے لیے دلچسپی

جن الزامات کی بنا پر تحریکی نوجوانوں کو تیونس کی مجبور عدالت نے موت اور عمر قید کی سزائیں دی ہیں ان کی حقیقت کیا ہے، اوران میں کس حد تک صداقت پائی جاتی ہے اس کو جاننے کے لیے امپیکٹ کے نامہ نگار نے حرکۃ الاتجاہ الاسلامی کے ایک فعال کارکن جناب حامدی محمد الہاشمی سے انٹرویو لیا ہے حامدی صاحب تحریک کے سیاسی امور کے رکن ہیں اور ایک اچھے مصنف اور صحافی ہیں۔ حامدی صاحب نے پروفیسر غنوشی صاحب کی عربی تحریروں کا ایک مجموعہ "اللہ کی رسی اور مکڑی کے جال" بھی مرتب کیا ہے اور ان کی اپنی تصنیف کردہ کتابیں بھی ہیں۔ ذیل میں اس انٹرویو کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ نام نہاد مسلم حکمرانوں اور دین حق کے علم برداروں کے کردار الگ الگ سامنے آجائیں۔

س:۔ بورقیبہ حکومت کے ساتھ تحریک اسلامی حرکۃ الاتجاہ اسلامی کے تعلقات اگرچہ کبھی بھی دوستانہ نہیں رہے تاہم ایسی کیا غلطی ہوئی جس کی وجہ سے آج وہ آپ کے سروں کی قربانی طلب کرتے ہیں۔؟

ج:۔ معاملہ تحریک اسلامی کا نہیں بلکہ بنیادی طور پر مسئلہ حکومت کے غیر محفوظ ہونے کا ہے اور اس عدم تحفظ کی وجہ بہت سے غیر حل شدہ معاشی اور سماجی مسائل ہیں حکومت جن کا سامنا کرنے میں ناکام ہے۔ اوراس کی عوامی بنیادیں کم سے کم تر ہوتی جا رہی ہیں۔ دوسری وجہ وہ مغربی نفرت بھی ہو سکتی ہے جو اسلام کے بارے میں گفتگو کرتے ہی مسلمان حکومت میں پیدا ہونے لگتی ہے۔

دوسری طرف معاملہ یہ ہے کہ ۱۹۸۱ء تا ۱۹۸۷ء میں شدید مزاحمت کے باوجود تحریک اسلامی طلبا، ٹریڈ یونین اور شہروں اور گاؤں کے عوام میں مسلسل مقبول ہوئی ہے۔ تحریک نے طلبا یونینوں کی رہنمائی اور تیونس کے انسانی حقوق کی لیگ میں فعال کردار ادا کیا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ وہ مفاد پرستوں کے لیے چیلنج بن گئی ہے۔

س:۔ تو کیا مقابلہ اور تصادم ناگزیر ہو گیا تھا؟

ج:۔ کوئی بھی اپنے معاشرہ میں، جو کہ مسلم معاشرہ ہے تصادم کو پسند نہیں کرتا، تحریک اسلامی کا سیاسی طریقہ کار اسلام، بات چیت اور مفاہمت پر مبنی ہے۔ اگر ہم کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا چاہتے تو پھر ہمیں سیاسی پارٹی کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے ملک کے دستوری قانون کے تحت اجازت طلب کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ لیکن اگر دوسرا تصادم کو مسلط کردے تو آخر اس کا کیا علاج ہے؟

کا باعث ہو گا کہ ۱۹۷۹ء میں جب ایران میں انقلاب آیا تو حبیب بورقیبہ کی حکومت ان چند عرب حکومتوں میں سے تھی جنھوں نے اس انقلاب کو خوش آمدید کہا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ ایران کے ساتھ اس تحریک کے تعلق کا الزام محض اس لیے لگایا جا رہا ہے کہ حکومت ان تمام حکومتوں اور سماجوں کی ہمدردی حاصل کرلے جو ایران سے کسی بھی وجہ سے نفرت کرتے ہیں۔ اگر یہ الزام نہ لگایا جائے تو حکومت تحریک پر جو مظالم ڈھا رہی ہے، عوام انھیں اسلامی ہمدردی یا انسانی حقوق کی پاسداری کی بنا پر مردود قرار دیں گے۔

س:۔ ۳ر اگست ۸۶ء کو بم دھماکہ جو واقعہ رونما ہوا وہ تحریک سے جوڑا گیا کیا اس سلسلہ میں تیونس کے ٹی.وی پر اقبالی بیان بھی آیا۔

ج:۔ تحریک نے بم دھماکہ سے لاتعلق کا اظہار ہے، یہ ہمارا طریقہ نہیں ہے اور ہم اس طرح کے کسی بھی الزام کی قطعی تردید کرتے ہیں۔ بم دھماکہ کے دس ملزمین میں سے نو پچھلے جون سے قیدمیں تھے اگر انھوں نے ہوٹلوں کو بم دھماکہ کا نشانہ بنایا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو اس مقصد کے لیے رہا کر دیا گیا تھا۔ اور یہ تیونس میں کوئی نئی بات نہیں ہے اس سے پہلے جب حکومت نے ٹریڈ یونین کے لیڈر پر فرد جرم عائد کرنا چاہا تو کچھ لوگوں کو ٹی وی پر یہ کہتے ہوئے دکھایا کہ مذکورہ لیڈر نے ان لوگوں کو ایسا کرنے کو کہا تھا۔

۱۹۸۰ء میں جب حکومت نے کیمونسٹ حضرات کے مقدمہ پر فیصلہ کیا تو ان کو ٹی وی پر اقبال جرم کرتے ہوئے دکھایا گیا۔ پھر حالیہ مقدمات میں ایک شخص کو اس مظاہرہ میں حصہ لینے کا ملزم ٹھہرایا جاتا ہے جس میں پولیس کی کچھ گاڑیوں کو نقصان پہنچایا گیا تھا، ملزم نے صفائی دیتے ہوئے کہا کہ مظاہرہ کے وقت تو میں جیل میں تھا، اس پر جج ہاشمی زمال نے کہا بہت اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ اس مظاہرہ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے، ملزم نے جواب دیا۔ یہ میرے خیال ظاہر کرنے کی جگہ نہیں ہے میں اپنا خیال ظاہر کرنے کے لیے یا تو کسی رسالہ میں مضمون لکھوں گا یا اگر اجازت ملی تو عوامی خطاب کروں گا۔ یہ حقیقت ہے ان مضحکہ خیز مقدمات اور تحریک کے خلاف جھوٹے الزامات کی۔

س:۔ ان حالات میں تحریک اسلامی کس پیغام پر زور دیتی ہے؟

ج:۔ ہمارے مقاصد بالکل ابتدائی ہیں، ملک کو درپیش مسائل صرف آزادانہ اور افہام و تفہیم کے ماحول میں حل ہو سکتے ہیں۔ جبکہ اس کا متبادل نفرت، تصادم اور انہا دہے ۱۹۸۶ء کی

گرمیوں میں ہم نے ایک قومی منشور پیش کیا تھا جو آزادی، بنیادی حقوق کے تحفظ اور سیاسی اجتماعیت کا آوازہ تھا۔

س :۔ کیا اس میں کمیونسٹ پارٹی کو بھی دعوت دی تھی؟

' یہاں کمیونسٹ پارٹی تسلیم کی جا چکی ہے اور بحیثیت سیاسی جماعت کے کام کر رہی ہے، سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ کشیدگی اور گھٹن کا ماحول جس قدر جلد ممکن ہو ختم ہونا چاہئے۔ اس وقت تمام غیر سرکاری رسالے اور اخبارات پابند ہیں کوئی شخص حکومت کی حمایت کے علاوہ کچھ بول نہیں سکتا۔

س :۔ تیونس کے عوام نے موجودہ صورت حال پر کس قسم کے رد عمل کا اظہار کیا۔ اور اگر بورقیبہ اپنی خونریزی کی خواہش کو پوری کرنے کے قابل ہو جائے تو کیا یہ تحریک اسلامی کی انتہا ہوگی؟

ج :۔ تیونس کے عوام بالعموم وہ لوگ جو ہماری تحریک سے ہمدردی رکھتے ہیں، مرعوب ہونے والے نہیں ہیں الزامات اور مقدمات کے ذریعہ عوام میں اعتماد بحال نہیں کیا جا سکتا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ سارے الزامات من گھڑت ہیں، یہاں تک کہ حکمراں جماعت اور حزب مخالف سے وابستہ سیکولر ذہنیت کے بیشتر لوگ جو تحریک کے پروگراموں سے اتفاق نہیں رکھتے ان الزامات کے جھوٹا ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ کچھ وزیروں اور اعلیٰ عہدیداروں نے ذاتی طور پر کوشش کی کہ وہ اپنے آپ کو حکومت کی پالیسیوں سے الگ رکھیں جس کا وہ ایک حصہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ ان واقعات کا سبب یہ بوڑھا بورقیبہ ہے یہ لوگ نہیں۔ کوئی بھی شخص بورقیبہ کے سامنے کھڑا ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا جبکہ صدر کی حیثیت حکومت میں ایک دیوتا کی ہے۔ تیونس کا معاشرہ مہذب اور تعلیم یافتہ ہے اور تشدد اس کے مزاج کے خلاف ہے، تحریک کو تیونس کی سب سے بڑی سیاسی جماعت ہونے کا دعویٰ نہیں مگر یہ عوام کے جائز امیدوں اور تمناؤں کی نمائندگی ضرور کرتی ہے۔ ماضی میں حکومت کو یہ بات اس وقت تسلیم کرنی پڑی تھی جب ۱۹۸۵ء میں یہودیوں نے پی ایل او کے مرکزی دفاتر پر بمباری کی تھی، اس وقت کے وزیراعظم محمد مزالی نے تحریک کی قیادت کو باضابطہ تسلیم کیا تھا۔ اور تحریک کے اعتدال، حب الوطنی اور حکمت عملی کی تعریف کی تھی شاید یہ بات بھی محمد مزالی کے سقوط اور تحریک پر مظالم کے سلسلہ میں ایک وجہ بن گئی۔

جبر و تشدد کی وجہ سے تحریک کو عوام کی ہمدردی حاصل ہوئی ہے۔ جب لوگ دیکھتے ہیں کہ تیونس کے وہ نوجوان جو سادہ زندگی اور قابل احترام حیثیت کے حامل ہیں اپنی فطری اسلام پسندی کی

بناپر گرفتار یا قتل کئے جارہے ہیں تو ان کے اندر ان مظلوموں سے ہمدردی کے جذبات ابھرتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ انشاء اللہ تحریک کا یہ اذیت ناک مرحلہ ختم ہوگا۔ اعلیٰ کمیٹی کے اسی ۸۰ فی صد افراد اور مجلس شوریٰ کے تین یا چار ارکان حکومت کے اس جبر وتشدد کو چیلنج کر چکے ہیں اور اپنے دعوتی کام میں مصروف ہیں پولیس ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ جبر وتشدد کی موجودہ لہر تحریک کے لیے مسئلہ نہیں ہے بلکہ تیونس کے لیے مسئلہ ہے۔ سات ملین کی اس آبادی میں پانچ لاکھ عوام بے روزگار ہیں۔ ملک پر ۵ بلین ڈالر کا غیر ملکی قرضہ ہے۔ ۳۱ سال سے ملک ترقی یافتہ، قابل اعتماد اور وفادار اداروں کے بغیر چل رہا ہے، بورقیبہ عنقریب مرنے والا آج نہیں تو کل، پھر آج کے چھوڑے ہوئے چیلنج کا تیونس کس طرح مقابلہ کرے گا۔

س:۔ کیا اس صورت حال کا سبب صرف بورقیبہ ہے؟

ج:۔ نہیں تنہا سبب نہیں ہے اگرچہ بہت بڑا سبب ہے۔ موجودہ وزیر تعلیم سیاح جو کہ ایک سیکولر آدمی ہے کی طرح دوسرے لوگ بھی ہیں۔ بورقیبہ کی ۸۴ سالہ بھتیجی سعدیہ سیاسی بھی ہے جس نے صدر کی سابقہ بیوی کے انتقال کے بعد وزارت عظمیٰ کا منصب حاصل کرلیا ہے۔ اگر منظر کے پیچھے کچھ دوسری چیزیں ہیں تو ان کا ہمیں علم نہیں۔ تاہم ان لوگوں کا مقصد تیونس کو سیاسی، سماجی اور معاشی طور پر غیر مستحکم کرنا عرب اور اسلامی ملکوں میں اس کے مثبت کردار سے انکار کرنا ہوگا مگر یہ مسلم ہے کہ جو شخص پاؤں کے موزے کی طرح ہر وقت وزیر اعظم اور دیگر وزرا کو بدل سکتا ہے اور اپنی بیوی کو دوسرے اسباب کے ساتھ اپنی ذات پر اس کی تنقید کی وجہ سے طلاق دے سکتا وہ ایک روادار انسان نہیں ہوسکتا۔

بہر حال ایسا لگتا ہے کہ بورقیبہ نے اپنے اوپر اسلامی تحریک کو مٹانے کی ذمہ داری اوڑھ لی ہے۔ جیسا کہ انھوں نے اپنے قریبی ساتھیوں کو بتایا ہے۔

(امپیکٹ انٹرنیشنل ۸ راکتوبر ۱۹۸۷ء)

کسی دیوار نے سیل جنوں روکا نہیں اب تک
کوئی مجنوں یہ مصرع لکھ گیا دیوار زنداں پر

(مولانا سید احمد عروج قادریؒ)

تراجم واقتباسات :-

قاضی ابوبکر ابن عربی۔ حیات وخدمات

البشیر علی احمد الترابی ــــ ترجمہ ابوسفیان اصلاحی

قاضی ابوبکر ابن عربی محمد بن عبداللہ بن محمد عبداللہ بن العربی المعافری اشبیلیہ کے رہنے والے تھے اور مالکی مذہب کے پیرو تھے۔ آپ کے والد محترم وقت کے بہت بڑے قاضی تھے۔ انھوں نے اپنے عہد کے شیوخ سے سماع حدیث کیا ابومحمد بن عتاب الجذامی، ابومروان عبدالملک بن سراج (۴۸۹ھ میں وفات پاگئے) اس وقت کے نامور شیوخ ہیں۔

اشبیلیہ میں آپ کے والد ماجد ایک اہم مقام پر فائز تھے اور بہت بڑی ریاست کے مالک تھے۔ ۲۲ شعبان ۴۶۸ھ کو ابن العربی کی ایک علمی ماحول میں ولادت باسعادت ہوئی۔ اس طرح ایک علمی ماحول میں پروان چڑھے اور بچپن ہی میں قرآن کریم حفظ کر لیا۔ والد محترم اور شہر کے دوسرے شیوخ سے حصول علم کا سلسلہ شروع کر دیا۔ حصول علم کے لیے انھوں نے محدثین کرام اور سلف صالحین کا راستہ اپنا کر سفر کرنا شروع کر دیا جمادی الاولیٰ ۴۸۵ھ کے سخت دنوں میں انھوں نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ شام آکر ابوبکر محمد ابن الولید الطرطوشی سے مل کر فقہ میں صلاحیت پیدا کی۔ شام ہی میں اور بہت سے محدثین عظام اور علماء کرام سے ملے۔

بغداد آئے تو وہاں بھی بہت سے اہل علم حضرات سے شرف ملاقات حاصل کیا اور ان سے بہت کچھ استفادہ کیا جن میں ابوالحسن مبارک بن عبدالجبار الصیرفی کا نام سر فہرست ہے۔ اس سفر کے بعد انھوں نے حج بیت اللہ کا قصد کیا ۴۸۹ھ کے اس سفر میں بھی انھوں نے بہت سے عالم فاضل سے ملاقات کی۔ حج کے بعد دوبارہ بغداد کا سفر کیا اور حصول علم کے لیے ہر طرح کے آلام ومصائب سہے، وہاں ائمہ حدیث سے بے شمار احادیث حفظ کیا اس طرح ان کے یہاں احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ اور ان کو مسئلہ فوجداری، اصول فقہ اور احکامات کے باب میں بہت زیادہ معلومات فراہم ہوئیں۔

یہاں سے ابن عربی اپنے وطن عزیز اندلس آئے، لوٹتے ہوئے مصر رک کر اسکندریہ گئے جہاں پرانے شیخ طوسی کے یہاں قیام کیا اب خود شیخ نے اپنے شاگرد سے استفادہ کیا جو کچھ کہ ابن عربی نے دوسرے

علما و شیوخ سے حاصل کیا تھا۔ مصر ہی سے مشرق کے سفر کا اختتام ہوا اور اندلس پہنچ گئے، اس طرح علم سے گرانبار ہو کر وطن میں حاضر ہوئے، تاریخ ہمیں یہ بتلاتی ہے کہ سفر سے اتنا کثیر علم لے کر ابھی تک کوئی واپس نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے اپنی کتاب "احکام القرآن" میں لکھا ہے کہ یہ علمی سرمایہ آٹھ سالہ سفر کا نتیجہ ہے۔

ابن عربی بیک وقت مختلف فنون میں درک رکھتے تھے، حدیث اور فقہ میں اپنے عہد کے یکتا تھے۔ مختلف علمی موضوعات پر اظہار خیال کرتے، اپنے عہد کے اہل علم حضرات سے گہرے مراسم تھے، اور وہ ان کی محفلوں میں شریک بھی ہوا کرتے۔ وہ نہایت ذہین، حاضر دماغ، احیا علم کے شائق، فصاحت و بلاغت کے امام حافظ قرآن، ادیب، شاعر اور خاموش طبع انسان تھے اپنی وسعت علم کے باوجود نہایت بااخلاق اور خوش مزاج تھے، وہ نہایت صابر اور ثابت قدم تھے۔ ابن زبیر فرماتے ہیں کہ ابن عربی اشبیلیہ میں دین اسلام کے بہت بڑے داعی تھے، وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں پیش پیش تھے۔ اس سلسلے میں اپنی کتابوں سے بہت مدد لی اور بے پناہ روپے بھی دعوت دین کے سلسلے میں صرف کیا۔ اللہ کے راستہ میں گزند پہنچی تو اسے ہنس کر ٹال دیا۔

ابن عربی کے لاتعداد تلامذہ گزرے ہیں، تلامذہ میں مشہور قاضی عیاض بن موسیٰ الیحصبی ہیں جنھوں نے اشبیلیہ میں آپ سے ملاقات کی۔ ابن عربی نے واپس آنے کے بعد شہر اشبیلیہ کے مشرقی حصہ میں قیام کیا۔ جہاں درس حدیث دیتے اور تفسیر، فقہ اور اصول حدیث پر بھی اظہار خیال کرتے۔ وقتاً فوقتاً وہ لوگوں کو یاد دہانی کے لیے عذاب قبر اور روز جزا، کا ذکر کرتے۔ یہ کام بڑی ہی پابندی سے کرتے۔ رجب ۵۲۸ھ میں انھیں شہر اشبیلیہ کا قاضی مقرر کر دیا گیا۔ اللہ نے انھیں بے پناہ قوت فیصلہ سے نوازا تھا۔ انھیں حق سے محبت اور ظلم و سرکشی سے نفرت تھی۔

منصب قضاء سے ہٹنے کے بعد گوشہ نشین ہو کر تصنیف و تالیف میں منہمک ہو گئے۔ اسلامیات کے مختلف موضوعات پر انھوں نے اہل اسلام کے لیے ایک قیمتی سرمایہ پیش کیا۔ ایک بار ابن عربی اپنے شہر اشبیلیہ کے کچھ لوگوں کے ساتھ ایک وفد کی شکل میں مراکش جا رہے تھے تاکہ "موحدین" کی ریاست کی حفاظت کے ساتھ ساتھ "مرابطین" کی ریاست کا خاتمہ کیا جا سکے، لیکن وہاں پہنچنے سے قبل ہی مراکش میں قید کر لیے گئے۔ ایک سال کی قید بامشقت کے بعد واپس ہو رہے تھے کہ شہر فارس کے قریب ربیع الثانی ۵۴۳ھ کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ وہاں سے انھیں لا کر "باب جبیہ" میں مدفون کیا گیا جو "باب محروق" کے باہر پڑتا ہے۔

تصنیفات:۔ ابن عربی کثیر التصانیف مصنف ہیں۔ اپنی تصانیف میں بیش بہا خزانے پیش کئے ہیں، تفسیر قرآن سے متعلق تین اہم کتابیں ہیں (۱) انوار القرآن اس کے بارے میں اپنی کتاب "القبس" میں فرماتے ہیں کہ یہ بیس سال کی عمر میں تصنیف کیا۔ یہ کتاب نو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ (۲) دوسری "احکام القرآن" یہ نہایت علمی اور مستند کتاب ہے (۳) تیسری "القانون فی تفسیر القرآن" ہے ان کے علاوہ علوم قرآن پر ایک کتاب "الناسخ والمنسوخ" ہے۔ احادیث پر بھی انھوں نے نہایت جامع کام کیا ہے۔ "عارضۃ الاحوذی"، یہ ترمذی شریف کی شرح ہے، دوسری "القبس علی موطا الامام مالک"، یہ ابھی تک شائع نہ ہو سکی، اس کے علاوہ بھی بہت سی کتابیں محتاج اشاعت ہیں۔ موطا کی ایک اور شرح "المسالک فی شرح موطا مالک" کے نام سے ترتیب دیا ہے ایک کتاب "المسلسلات" ہے جو اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ پر لکھی گئی ہے۔ اصول حدیث اور فقہ میں ان کی معروف کتابیں "المحصول والخلافیات" اور "الکافی بان لادلیل علی النافی" اور "ملجئۃ المتفقہین" ہیں۔

اس کے علاوہ "السباعیات" "شرح غریب الرسالۃ" "تلخیص التلخیص" اور "الرد علی من خالف اہل السنۃ من ذوی البدع والالحاد" ہیں

ان کی ایک اہم کتاب "العواصم من القواصم" ہے، جس کے کئی ایڈیشن اب تک داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کے واقعات اور صحابہ کرام کے مابین جو کچھ واقع ہوا اس پر بحث کی گئی ہے۔ بحث عالمانہ و فاضلانہ ہے۔

فرض اور انعام

بعض مذہبی حلقے والے لوگ آپ کو اس غلط فہمی میں ڈال رہے ہیں اور شاید خود بھی اس دھوکہ میں ہیں کہ "حکومت تو ایک انعام ہے جو نمازیں پڑھنے اور نیکیاں کرنے کے صلہ میں خدا کی طرف سے ملا کرتا ہے، اس کے حصول کی کوشش محض دنیا پرستی اور اس کو مقصود بنانا خلاف اسلام ہے"۔ یہ باتیں جو لوگ کرتے ہیں انھوں نے اس معاملہ کو سرے سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ وہ اگر برا نہیں تو میں کہوں گا کہ وہ سمجھنا چاہتے بھی نہیں ہیں کیونکہ اس طرح وہ عیش معطل ہو جائے گا جو موجودہ نظام کی فرمانروائی میں ان کو حاصل ہے یا حاصل ہونے کا امکان ہے۔ یہ لوگ اس سارے معاملہ کو انعام کے پہلو سے دیکھ رہے ہیں اور فرض کا پہلو ان کی نگاہ سے اوجھل ہے (مودودیؒ)

تنقید و تبصرہ:-

ہم تحریک اسلامی کے کارکن کیسے بنیں ؟

از۔ مولانا سید جلال الدین عمری ، صفحات ۲۴ قیمت ۱/۵۰ ناشر:- مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی

ماہنامہ زندگی نو کے مدیر مولانا سید جلال الدین عمری کا یہ تازہ ترین کتابچہ ہے جو دعوت و تربیت کی ایک بڑی ضرورت کو پوری کرتاہے ، اس کتابچہ میں دو مقالات ہم تحریک اسلامی کے کارکن کیسے بنیں؛ اور اقامت دین کے لیے علمی تیاری کی ضرورت شامل ہیں۔ یہ دونوں مقالات پہلے زندگی نو میں شائع ہوئے اور پھر ہند و پاک کے متعدد رسائل نے انھیں اپنے صفحات میں نقل کیا۔ مذکورہ دونوں مقالات میں موصوف نے علمی اور فکری پختگی پر زور دیا ہے اسلام کو علمی سطح سے پیش کرنے کی ضرورت کا احساس دلایاہے۔ اور بعض ان پہلوؤں کی نشاندھی کی ہے جو دین کا کام کرنے والوں کے لیے انتہائی حد تک قابل غور ہیں ایک جگہ فرماتے ہیں :"

" ہماری علمی ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ شاید یہ بھی رہی ہے کہ ہم نے علمی لحاظ سے کم تر درجہ کے لوگوں کو اپنا مخاطب بنا نا شروع کر دیا ہے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ تک پہونچنے کی کوشش نہیں کی۔ انسان اپنے سے کم تر درجہ کے لوگوں کو لاجواب کرکے فریب علم میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ یہی ساری دنیا کی ذہنی سطح ہے اور وہ اپنے دلائل کے زور سے ہر ایک کو زیر کر سکتاہے۔ یہیں سے اس کا علمی زوال ہونے لگتاہے " صنہ

کتابچہ مختصر ہونے کے باوجود فکر انگیز اور انتہائی مفید ہے انداز بیان بھی سلیس اور معیاری ہے دعوتی مقاصد کے لیے اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہونی چاہئے۔ کتابت و طباعت عمدہ اور سرورق دیدہ زیب ہے امید ہے کہ اس کتابچہ سے قارئین کو فائدہ پہونچے گا۔

آؤ دین سکھیں : مولف ظہور احمد قریشی ، صفحات ۸۹ کتابت طباعت مناسب بلاقیمت ملنے کا پتہ ، ادارہ کتاب و سنت ۵۰ ر ۱۴ اکبار ی پورہ اورنگ آباد۔

ہمارے معاشرہ میں اس طرح اوہام و خرافات اور شرک و بدعات کا جال پھیلا ہوا ہے، کہ اسلام کی صاف ستھری اور سادہ تعلیمات گویا بے اثر ہوکر رہ گئی ہیں۔ اس صورتحال میں ہر درد مند مسلمان کا جی کڑھتا ہے ، ظہور احمد صاحب ایسے ہی درد مند مسلمان ہیں۔ انھوں نے شرک و بدعات کے ازالہ اور اسلام کی سادہ تعلیمات کی تبلیغ کے لیے یہ کتاب لکھی ہے ، اور اسی لیے اسے بلاقیمت

تقسیم کرنے کا اہتمام کیا ہے، اس جذبہ اور خدمت کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔
اظہارتشکر، پیش لفظ تعارف صاحب مقدمہ، مولانا اسماعیل شہیدؒ اور مقدمہ کے بعد اصل مباحث آتے ہیں۔ کتاب کا نام اگرچہ آؤ دین سیکھیں ہے مگر اسلام کی مثبت تعلیمات پر زور دینے کے بجائے زیادہ توجہ شرک و بدعات کی تردید وغیرہ پر دی گئی ہے، اگر نام بھی اسی کے لحاظ سے رکھا جاتا تو مناسب تھا یا پھر یہ کہ پہلے تفصیل سے یہ بتایا جاتا کہ اسلام کیا ہے اور پھر اس پر زور دیا جاتا کہ اسلام کیا نہیں ہے، تو کتاب کی افادیت بڑھ جاتی۔ کتاب پڑھتے ہوئے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ مباحث میں تسلسل کے بجائے تفریق ہے جس نے مباحث کو الگ الگ اکائی بنا دیا ہے مثلاً یہ مباحث، حضرت جنید بغدادی اور اتباع سنت، شکم پرست علماء شریعت اور طریقت کے بارے میں خواجہ معصوم کا مکتوب اسلام کی تخریب میں یہودیوں کا حصہ، شیعی اثرات دور کرنے میں علماکرام کی سعی تبلیغ، اسلام اور صلیبی جنگیں اکبر اور دین الٰہی کا فتنہ وغیرہ آخر میں چار تقریظات ہیں۔ جن کی یہ مختصر کتاب متحمل نہیں معلوم ہوتی۔ باہم کتاب لائق مطالعہ اور اور قابل استفادہ ہے۔

ماہنامہ رہگذر (خصوصی اشاعت) صفحات ۲۵۶ قیمت ۲۵ روپے۔ مدیر عبدالحفیظ خاں، پتہ ۶۸/۳-۲-۱۰ ہمایوں نگر حیدرآباد

دی اسلامک ہسٹری آف انڈیا نے ۱۵ / ۱۶ / اگست ۱۹۸۷ء کو حیدرآباد میں "چالیس سالہ دور آزادی ہند اور مسلمان" کے عنوان پر ایک کل ہند کانفرنس کے انعقاد کا اہتمام کیا تھا، ماہنامہ رہگذر کا یہ خصوصی شمارہ اس کانفرنس کی روداد، رپورٹس، مقالات اور خطبات پر مشتمل ہے۔
تاریخ کسی بھی قوم کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے، جو قوم اپنی تاریخ کو فراموش کر دے وہ اپنی تہذیب کی حفاظت نہیں کر سکتی، مسلمانوں کی تاریخ ملک کی دوسری قوموں کی تاریخ سے بہت زیادہ بہتر اور روشن ہے، مگر انگریزوں کی سیاسی حکمت عملی نے مسلمانوں کی اس تاریخ کو مسخ کرنے اور بعض افراد کی کمزوریوں کو پوری ملت کے کردار کی حیثیت سے پیش کرنے کی جو کوشش کی تھی ہندو احیاء پرستی اور سیاسی مفاد پرستی نے آج اسے نقطہ عروج تک پہونچا دیا ہے۔ جس کے بھیانک نتائج ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔
مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ ان کی تاریخ کو مسخ کرنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں ان کا تعاقب

کریں اور صحیح صورت حال واضح کریں یہ بات خوش آیند ہے کہ اسلامک اکیڈمی آف ہسٹری آف انڈیا حیدر آباد نے وقت کی اس ضرورت کو محسوس کیا ہے اور خطوط کار کی تعین کے ساتھ منصوبہ بند طریقہ پر کام کا آغاز کیا ہے، جس کی پہلی کڑی مذکورہ کانفرنس ہے زیر تبصرہ مجلہ میں جن لوگوں کے خطبات و مقالات شامل ہیں ان میں جسٹس رفیع الدین، جناب سید حامد، ڈاکٹر نثار فاروقی، مولانا ابو العرفان ندوی، مولانا سید جلال الدین عمری، ڈاکٹر انور معظم، ڈاکٹر احمد اللہ خاں۔ مولانا عاقل حامی، مولانا عبدالعزیز، مولانا سلیمان سکندر، ڈاکٹر سید معین الدین قادری، ڈاکٹر عبدالمجید خاں اور جناب عبدالحفیظ خاں قابل ذکر ہیں۔ یہ چیز اگر باعث مسرت ہے کہ کانفرنس کے بیشتر شرکار ملک کے ممتاز علماء اور دانشور ہیں تاہم ہسٹری کانفرنس میں اگر ملک کے نامور مورخین اور اساتذہ تاریخ کی بھی شرکت ہوتی تو شاید موضوع کے بہت سے وہ پہلو بھی سامنے آجاتے جو ان مقالات میں نہیں آسکے ہیں۔

ایک اور بات جو کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ خطبات اور مقالات میں صحت طباعت کا کچھ زیادہ اہتمام نہیں کیا گیا ہے، بعض جگہوں پر ایسی غلطیاں رہ گئی ہیں جن سے پورا مضمون متاثر ہو گیا ہے مثلاً ص۲۲ پر، آیت کے ترجمہ میں تصرف کی جگہ نصرت چھپ گیا ہے، ص۱۹۵ پر تحریک اسلامی کی جگہ تاریخ اسلامی متعدد بار طبع ہو گیا ہے، وغیرہ خدا کرے جس جذبہ سے کانفرنس منعقد کی گئی ہے اس میں برکت ہو اور امت کا تعاون اسے حاصل ہو۔ (محمد مسعود عالم قاسمی)

مسلمانان ہند کے لیے صحیح راہ عمل ۔ ان کے منصب و مقام، اسلامی تعلیمات اور واقعات و حقائق کی روشنی میں۔ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ صفحات ۲۹۔ قیمت دو روپیہ پچاس پیسے۔ ناشر مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ندوۃ العلماء لکھنؤ

محترم جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی زید مجدہم کا زیر نظر مقالہ کلیدی خطبہ ہے جو جامعہ اسلامیہ دارالعلوم حیدر آباد کی دوسری عالمی کانفرنس (منعقدہ ۱۷/۱۸ مارچ ۱۹۸۷ء حیدر آباد) میں پیش کیا گیا تھا۔ یہی مقالہ اب کتابچہ کی صورت میں مصنف کی طرف سے مفکرین و قائدین ملت، قومی کارکنوں اور عام مسلمانوں کے مطالعہ و غور و فکر کے لیے ایک ملی منشور اور میثاق کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے۔ ... مقالہ نگار کا کہنا ہے کہ اس کے اندر متعدد اہم حقائق ہندوستان میں ملت اسلامیہ ہندیہ کے فرائض اور ذمہ داریوں کی وضاحت، صورت حال کی

تصویر کشی اور اس کے تقاضوں کی تشریح کے سلسلے میں بعض ایسی اصولی اور بنیادی باتیں اس وضاحت اور قوت کے ساتھ آگئی ہیں، جن کی نوبت اس سے پہلے نہیں آئی تھی۔/ ہم (پیش لفظ)۔

یہ حقیقت ہے کہ اس وقت ہندوستان کی ملت اسلامیہ گوناگوں پہلوؤں سے جس مخصوص صورت حال سے دو چار ہے پوری اسلامی تاریخ میں وہ بہت کچھ نرالی اور انوکھی ہے۔ ایک طرف اسے اس ملک میں بے پناہ مسائل اور مشکلات کا سامنا ہے، دوسری طرف "خیر امت" ہونے کی حیثیت سے اس کے سینوں میں آخری خدائی دین کی وہ امانت ہے جسے بہر حال اور بہرصورت اسے برادران وطن تک منتقل کرنا ہے۔ اس مقالہ میں ان دونوں نکات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مصنف نے مسلمانان ہند کے لیے جس راہ عمل کی نشاندہی کی ہے وہ بڑے غور وفکر کی طالب ہے۔

لیکن مصنف کی پوری گفتگو زیادہ تر اصولی اور ترغیبی نوعیت کی ہے۔ حالانکہ اصل ضرورت اس بات کی تھی کہ اس کے لیے متعین لائحہ عمل اور واضح خطوط کار کی نشاندہی کی جاتی جس کی دو صورتیں ہیں یا تو اس مقصد کے لیے ایک باقاعدہ علٰحدہ تحریک کی بنیاد ڈالی جائے۔ یا یہ کہ مسلمانوں کی موجودہ تنظیموں اور جماعتوں میں جس کے اندر بالقوۃ ان مقاصد کی صلاحیت ہو اور جو اپنے وسائل کی حد تک بالفعل ان کو روبہ عمل لانے کی جد و جہد میں لگی ہوئی ہو، اس کی تقویت کا سامان کیا جائے اور اس کے حق میں رائے عامہ کو زیادہ سے زیادہ ہموار کیا جائے۔ صرف مدارس اور مساجد کے قیام اور شبینہ اور صباحی مکاتب کے قیام سے جیسا کہ مصنف نے کہا ہے/۲۲ یہ مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

اصول تصنیف کے نقطۂ نظر سے عبارتوں کے بیچ کثرت سے قوسین کا استعمال بھی کھٹکتا ہے۔ جسے آسانی سے مسلسل عبارت میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ کتابچہ کے شروع میں پیش لفظ و تعارف، میں ایک چیز زائد ہے۔ پیش لفظ یا تعارف ایک ہی کافی ہے۔ کتابچہ کا طول طویل نام بھی غیر ضروری سا محسوس ہوتا ہے۔

(سلطان احمد اصلاحی)

ماہنامہ **زندگیِ نَو** نئی دہلی

جلد ۷ ✪ دسمبر ۱۹۸۷ء مطابق ربیع الثانی جمادی الاول ۱۴۰۸ھ ✪ شمارہ ۶

فہرست مضامین

شذرات

مقالات

[illegible]

[illegible]

ادارتی امور کے لئے خط و کتابت کا پتہ:
مدیرہ زندگی نو، پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ترسیلِ زر و انتظامی امور کے لئے:
منیجر ماہنامہ زندگی نو، ۱۵۲۵، سوئیوالان نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

● سالانہ زرِ تعاون -/۵۵ روپے ● (بیرونِ ہند) -/۲۲۵ روپے انڈین ● فی شمارہ =/5 روپے ●

سرخ نشان، علامت ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لئے فوری زرِ سالانہ ارسال فرمائیں یا اگلا شمارہ کسی اطلاع کے نہ ملنے پر بذریعہ وی۔پی ارسال کیا جائے گا۔

پرنٹر و پبلشر محمد حبیب اللہ قادری نے دعوت ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی جانب سے جمال پرنٹنگ پریس، جامع مسجد، دہلی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ "زندگی نو" ۱۵۲۵، سوئیوالان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔ فون: ۲۷۳۲۴۸ ★ ۲۶۵۳۱۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

جماعت اسلامی کے اساسی تصورات

(اپنے قیام کے پس منظر میں)

سید جلال الدین عمری

اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری دین ہے۔ جماعت اسلامی کا ایمان اور عقیدہ ہے کہ اللہ کا یہ دین ہر پہلو سے اور پوری طرح مکمل ہے اور رہتی دنیا تک کے لیے ہے۔ وہ اس میں کسی کمی بیشی یا حذف واضافہ کو معصیت اور گناہ تصور کرتی ہے اور اپنے ہر کام میں اسی سے رہنمائی حاصل کرتی ہے۔ وہ ان ہی باتوں پر زور دیتی ہے جن پر اسلام نے زور دیا ہے اور اتنا ہی زور دیتی ہے جتنا اسلام نے دیا ہے۔ جن باتوں کو اسلام نے جتنی اہمیت دی ہے وہ اس کے نزدیک اتنی ہی اہمیت کے حامل ہیں اور جن باتوں کو اسلام نے اہمیت نہیں دی ہے ان کی اس کے نزدیک بھی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ اسلام کو اس کی اسی کامل شکل میں قائم اور غالب کرنے کے لیے اٹھی ہے۔ یہی اس کا نصب العین ہے اور یہی اس کی تمام کوشش اور جدوجہد کا مرکز و محور ہے۔

۲۶ر اگست ۱۹۴۱ء کو جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ اس وقت پوری دنیا میں مغرب کے افکار کا غلغلہ تھا۔ حق وہ تھا جسے مغرب کی زبان حق کہے اور جسے وہ باطل قرار دے اس کے باطل ہونے کے لیے کسی اور دلیل کی ضرورت نہ تھی۔ خود ہمارے ملک پر بھی یہی نظریات چھائے ہوئے تھے۔ ان سب نظریات کی بنیاد الحاد پر تھی، جو پہلے ہی قدم پر خدا، رسول اور آخرت کا انکار کرکے آگے بڑھتا ہے۔ اس کے بطن سے تین بڑے فلسفے ابھرے۔

ایک فلسفہ تھا قومیت کا۔ اس نے یہ تصور دیا کہ قومیں جغرافیائی حدود، زبان، نسل اور مذہب کی بنیاد پر وجود میں آتی ہیں۔ ایک خاص علاقہ میں رہنے والے یا خاص زبان کے بولنے والے یا خاص نسل یا خاص مذہب سے تعلق رکھنے والے ایک وحدت ہیں، وہ دوسروں سے الگ اور آزاد ہیں۔ کسی دوسری قوم کو ان پر حکمرانی کا حق نہیں ہے۔ ان پر خود ان کی مرضی چلے گی اور وہ اپنے معاملات

خود طے کریں گے۔

دوسرا فلسفہ جمہوریت کا تھا جو بتاتا ہے کہ قوموں کی سیاسی طاقت کا مرکز اس کے جمہور ہیں۔ وہی اس کے سیاسی نظام کے بارے میں فیصلہ کرسکتے ہیں اور اسے جس رخ پر چاہیں چلا سکتے ہیں انھیں کو قانون سازی کا حق ہے جس چیز کو جمہور کی تائید حاصل ہو وہ جائز قانون ہے اور جسے وہ تسلیم نہ کرے وہ ناجائز ہے۔

تیسرا فلسفہ کیمونزم یا سوشلزم کا تھا۔ یہ انسان کی معاشی زندگی کو ایک خاص رخ دیتا ہے۔ اس فلسفہ کی رو سے پوری انسانی تاریخ معاشی کشمکش کی تاریخ ہے۔ یہ کشمکش محنت اور سرمایہ کے درمیان مسلسل جاری رہتی ہے۔ سرمایہ محنت کا استحصال کرتا ہے اور محنت اپنا حق طلب کرتی ہے۔ اس کشمکش کو ختم کرنے کے لیے اس نے کہا کہ وسائل حیات کچھ افراد کے ہاتھ میں نہ ہوں بلکہ ان پر ریاست کا کنٹرول ہو اور ریاست ہر فرد کی بنیادی ضروریات فراہم کرنے کی ذمہ دار ہو۔

پوری دنیا میں ان ہی نظریات کا چرچا تھا کہ ملک میں آزادی کی تحریک چلی۔ کانگریس اور پھر مسلم لیگ ابھر کر سامنے آئی اور دونوں تحریکیں پورے ملک پر چھا گئیں۔ کانگریس کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھوں میں تھی وہ مغرب کے پروردہ اور مغربی فلسفوں کے دل دادہ تھے۔ آزادی کا تصور بھی انھوں نے مغرب ہی سے لیا تھا اور آزادی کے بعد ملک کی تعمیر بھی مغرب ہی کے فلسفوں کے تحت کرنا چاہ رہے تھے۔

مغرب اس فلسفے پر مطمئن تھا کہ مذہب انسان کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔ اس کے لیے یہ سوال ہی کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا بلکہ بے معنیٰ تھا کہ سیاسی مسائل میں مذہب سے فتویٰ پوچھا جائے اور اس کی رہنمائی حاصل کی جائے۔ چنانچہ آزادی کی جنگ اس طرح لڑی جا رہی تھی کہ مذہب ہر قوم اور فرد کا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت نہ تو اس میں مداخلت کرے گی اور نہ وہ حکومت کے معاملات میں دخل دے گا۔

آزادی کی اس تحریک میں مسلمانوں کی جو جماعتیں کانگریس سے قریب تھیں یا اسے تقویت پہنچا رہی تھیں انھوں نے بھی خوش دلی سے یا سیاسی مجبوریوں اور مصلحتوں کے پیش نظر اس فلسفہ کو عملاً قبول کرلیا تھا اور یہ بات زیر بحث ہی نہیں تھی کہ اسلام کی روشنی میں پوری تحریک کا جائزہ لیا جائے اور اسے اسلامی رُخ دیا جائے۔ پھر یہ سوال تو دور دور تک نہیں پیدا ہوتا تھا کہ آئندہ ملک کا نظام اسلام کی بنیاد پر قائم ہوسکے گا یا نہیں۔ اس کے لیے کسی کوشش کا تو ذکر ہی نہیں۔

جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے وہ مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ہوم لینڈ (آزاد مملکت) کا مطالبہ

کر رہی تھی اس کے لیے وہ اسلام کا بار بار نام بھی لے رہی تھی، لیکن نہ تو اس کے رہناؤں کی زندگیاں اسلام کی ترجمانی کر رہی تھیں اور نہ اس کا مجموعی رُخ ہی یہ بتا رہا تھا کہ اس کے مطلوبہ ہوم لینڈ میں اسلام کی حکومت ہوگی اور اسلامی نظام قائم ہوگا۔

بہت سی دینی شخصیتوں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ان کے پیش نظر غالباً یہی بات تھی کہ مسلمانوں کی ایک الگ مملکت کے وجود میں آنے کے بعد وہاں اسلام ہی کی فرماں روائی ہوگی لیکن اس کا کوئی واضح تصور ان کے ذہنوں میں نہیں تھا۔

مسلمانوں میں کانگریس اور لیگ سے جو لوگ تعلق رکھتے تھے ان سے ہٹ کر بھی بڑی بڑی مذہبی شخصیتیں تھیں، ادارے تھے اور جماعتیں تھیں۔ ان کے ذریعہ بعض بہت ہی مفید خدمات انجام پا رہی تھیں لیکن اس کے باوجود یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ دین کا اجتماعی اور سیاسی شعور امت کے اندر بہت کمزور تھا، اسے بیدار اور مضبوط کرنے کی صحیح معنی میں کسی طرف سے کوشش نہیں ہو رہی تھی۔

قرآن و حدیث پر نظر رکھنے والا کوئی بھی شخص اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ دین انسان کی پوری زندگی کو اپنی گرفت میں لیتا ہے اور کسی شعبۂ حیات کو آزاد نہیں چھوڑتا۔ لیکن عملاً دین کو مختلف خانوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعض احکام کی شدت سے پابندی ہو رہی تھی اور بعض احکام سے غفلت برتی جاتی تھی، چھوٹے چھوٹے مسائل نے وہ اہمیت اختیار کر لی تھی کہ ان کے مقابلہ میں بڑے بڑے احکام کی اہمیت نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی، اوراد و وظائف اور نوافل و مستحبات کے چھوٹنے پر تو تنبیہ اور باز پرس کی جاتی تھی، لیکن معیشت و معاشرت میں بڑی بڑی خلاف ورزیوں کو برداشت کر لیا جاتا تھا۔ سیاست تو جیسے دین کا جزو ہی نہ ہو۔ اس میں کوئی بھی رویہ اختیار کرنے کی ایک طرح سے آزادی حاصل تھی۔

بعض حلقے ایک خاص دائرہ میں امت کے اندر دینی شعور بیدار کرنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن دین کو غالب کرنے کی جدوجہد اس دائرہ میں نہیں آتی تھی۔ وہ حکومت و اقتدار کو اللہ تعالیٰ کا انعام قرار دے کر اس جدوجہد سے دامن کش رہنا چاہ رہے تھے حالانکہ کسی بھی مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد ضروری ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہی انسان انعام و اکرام کا بھی مستحق ہوتا ہے۔

بہت سے وہ لوگ بھی تھے جن کے نزدیک اسلام تاریخ کا ایک مثالی دور تھا۔ وہ اسے ماضی کے ایک درخشاں باب کی حیثیت سے پیش کرتے تھے، اس کے فضائل و مناقب کے بیان سے ان کی زبان تر رہتی تھی۔ اس کے پیدا کردہ اخلاق، محبت، عدل و انصاف، قانون و سیاست ہر چیز کے د

...اخوان تھے، لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کا احیا بھی چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ان ...طرف سے کوئی کوشش بھی نظر نہیں آتی تھی۔ یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل تھا کہ وہ اسے آج کے دور میں ...بل عمل سمجھتے بھی ہیں یا نہیں۔

مسلمانوں میں ایسے افراد کی بھی کمی نہیں تھی جو اجتماعی معاملات کو مذہب سے آزاد ہی رکھنا چاہ رہے تھے۔ وہ کبھی پلٹ کر بھی یہ دیکھنے کے لیے تیار نہ تھے کہ تہذیب و تمدن اور ریاست وسیاست کے بارے میں اسلام کی کچھ ہدایات بھی ہیں یا نہیں۔ وہ مذہب کو نجی زندگی تک محدود رکھنا چاہ رہے تھے۔ گو کہ ان کی نجی زندگی بھی بڑی حد تک اس سے آزاد ہو چکی تھی۔

مسلمانوں نے سیکولر طرز کے ادارے بھی قائم کر رکھے تھے اور ان کے خالص دینی ادارے بھی تھے۔ سیکولر اداروں کا مطمح نظر بڑی حد تک قومی اور مادی تھا۔ وہ خالص اسلامی نقطۂ نظر سے سوچنے اور ...م کرنے کے لیے تیار نہ تھے بلکہ یہ کہنا بھی شاید غلط نہ ہوگا کہ اس طرح کے بہت سے ادارے اسلام کے صحیح تصور ہی سے خالی تھے۔

مسلمانوں کے جو خالص دینی ادارے تھے وہ اس حیثیت سے متعارف تھے کہ وہ قرآن وحدیث ...کی تعلیم کے مراکز ہیں۔ بعض پہلوؤں سے ان کے ذریعہ امت کو بڑا فائدہ پہنچ رہا تھا لیکن وہاں بھی ...ین کا جامع تصور نہیں تھا۔ وہ تقلید اور عدم تقلید، رفع یدین اور عدم رفع یدین جیسے مسائل میں ...لجھے ہوئے تھے اور اس بات سے بے خبر تھے کہ موجودہ دور میں کن مسائل نے اہمیت اختیار کر لی ہے ...ر اسلام کو کن پہلوؤں سے چیلنج درپیش ہے۔

بعض حلقے تزکیہ وطہارت اور تربیت و اخلاق کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ اس خدمت ...کی اہمیت اور عظمت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر کہ یہ اپنے مقصد میں کس حد ...تک کامیاب رہے اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ خدمات امت کے داخلی استحکام ...کے لیے تھیں۔ یہ خارج کے لیے کوئی نقشۂ کار نہیں فراہم کرتی تھیں۔ کسی زندہ امت کے لیے داخلی استحکام ...کے ساتھ خارج کے پروگرام کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ خارج میں اگر کوئی ہدف نہ ہو تو وہ اپنے خول میں ...بند ہو جائے گی۔ اور دنیا پر چھا جانے کی صلاحیت ختم ہو جائے گی۔

ان حالات میں جماعت اسلامی قائم ہوئی۔ جب بھی کوئی تحریک اٹھتی ہے وہ حالات کے لحاظ ...سے دیکھتی اور فیصلہ کرتی ہے کہ اسے وقت کے کن افکار و خیالات پر ضرب لگانی ہے اور کن باتوں ...پر زور دینا اور نمایاں کرنا ہے؟ جماعت اسلامی نے فکری لحاظ سے جن پہلوؤں کو نمایاں کیا ان میں

سے بعض یہ ہیں۔

(۱) اس نے بتایا کہ الحاد مذہب کے خلاف ایک ردعمل کے طور پر ابھرا ہے۔ اس کے حق میں کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے۔ کائنات کا مشاہدہ، انسان کی عقل اور اس کی فطرت اس کی تردید کرتے ہیں، لہٰذا اس کی بنیاد پر اٹھنے والے تمام فلسفے ایک فریب اور سراب ہیں۔ یہ عمل کے میدان میں بھی ناکام ہو چکے ہیں۔ دنیا ان کا تلخ تجربہ کر چکی ہے اور مسلسل کر رہی ہے۔ جو لوگ الحاد کے زیر اثر خدا، رسول اور آخرت کا انکار بلکہ مذاق اڑا رہے تھے ان کے سامنے اسلام کو اس حیثیت سے پیش کیا کہ وہ اللہ کا آخری دین ہے، جو ہماری عقل کو پوری طرح مطمئن کرتا ہے اور ہمارے تمام مسائل کو الحادی فلسفوں کے مقابلہ میں بہتر طریقہ سے حل کرتا ہے۔

(۲) اسلام کو اللہ تعالیٰ کا دین ماننے کے باوجود جو لوگ اس کے خلاف ورزی میں مبتلا تھے اور جن کی زندگیوں پر غیر اسلامی نظریات کی حکومت تھی، جماعت اسلامی نے ان کے تضاد فکر و عمل کو نمایاں کیا اور بتایا کہ اسلام محض عقیدت و محبت کے اظہار کے لیے نہیں بلکہ عمل کے لیے ہے۔ محض تعریف و تحسین کے ذریعہ اسلام کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ یہ حق اسی وقت ادا ہو سکتا ہے جب کہ اس کی مکمل اتباع کی جائے۔

(۳) جن حلقوں میں اسلام محض عبادات یا صرف بعض اخلاقیات تک محدود تھا یا جو اسے شعوری طور پر سیاسی و سماجی زندگی سے دور ہی رکھنا چاہ رہے تھے، جماعت نے ان کے سامنے اس حقیقت کو ابھارا کہ اسلام پوری زندگی میں اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان اس کے سامنے سر بھی جھکائے اور اطاعت بھی کرے، اسی کا حکم گھر اور بازار میں چلے، عدالت کی کرسی سے اسی کے قانون کا نفاذ ہو اور ایوان سیاست میں اسی کی بالادستی قائم رہے۔ یہ عقیدہ و عمل کا ایک مربوط نظام ہے۔ اس کا ایک جز دوسرے جز سے جڑا ہوا ہے۔ یہ ایک وحدت ہے جس کے حصے بخرے نہیں کئے جا سکتے۔ اس کے بعض احکام کو اختیار کرنا اور بعض دوسرے احکام کو چھوڑ دینا صحیح نہیں ہے۔

(۴) اس وقت کی سیاسی تحریکیں قومیت کے نشہ میں سرشار تھیں، قومی نقطہ نظر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ اس کے خلاف کوئی بات سننا ان کے لیے گوارا نہ تھا۔ جماعت اسلامی ان تحریکوں سے الگ تھلگ رہی اور قوم پرستی کے نقصانات سے آگاہ کیا۔ اس نے بتایا کہ قوم پرستی انسانوں کے اندر تعصب، نفرت اور عداوت کے بیج بوتی اور رواداری اور محبت کے جذبات کو نقصان

پہونچاتی ہے۔ جب یہ حد سے آگے بڑھتی ہے تو دوسری قوموں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی اور ایک قوم کو دوسری قوم کا حریف بنا دیتی ہے۔ اسی سے فاشزم نے جنم لیا اور جنگ عظیم کی شکل میں دنیا کو اس تباہی کا سامنا کرنا پڑا جس سے وہ آج بھی پناہ مانگتی ہے۔

اسی قوم پرستی میں بڑی حد تک مسلمان بھی مبتلا تھے۔ جماعت اسلامی نے مسلم قوم پرستی کی بھی مخالفت کی، اس نے یاد دلایا کہ مسلمان ایک قوم نہیں بلکہ ایک ملت ہیں۔ اس ملت کو جغرافیائی حالات نے جنم نہیں دیا ہے۔ بلکہ یہ بعض اصول و نظریات کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے۔ جو ان نظریات کو مانے وہ مسلمان ہے اور جو ان کو نہ مانے وہ اس سے خارج ہے۔ یہ امت جس دین کی حامل ہے وہ کسی خاص گروہ کا دین نہیں ہے۔ وہ تمام انسانوں کے لیے ہے لیکن اگر یہ امت ایک قوم بن جائے اور ایک قوم کی حیثیت سے سوچنے لگے تو اس کا دین بھی ایک قومی دین یا مذہب بن کر رہ جائے گا۔ دوسری قوموں اور ملتوں کے لیے اس میں کوئی کشش باقی نہ رہے گی۔

سیاسی میدان میں جماعت اسلامی نے حاکمیت اللہ کے تصور کو نمایاں کیا۔ انسان اپنی زندگی کے لیے ایک قانون چاہتا ہے۔ قانون کے بغیر وہ ایک دن گزار نہیں سکتا۔ سوال یہ ہے کہ یہ قانون کون دے اور کس کا قانون اس پر چلے؟ اس کے تین جواب ممکن ہیں۔

ایک یہ کہ انسان خود اپنے لیے قانون بنائے لیکن انسان جذبات و خواہشات سے آزاد ہو کر کوئی قانون نہیں بنا سکتا یہ اس کے لیے بھی مفید نہیں ہے اور معاشرہ بھی ہر شخص کی مرضی پر عمل نہیں کر سکتا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی ایک فرد یا کچھ افراد قانون بنائیں اور دوسرے اس پر عمل کریں۔ لیکن یہ بات بالکل غیر فطری اور نامعقول ہے کہ کسی فرد یا بعض افراد کو قانون سازی کا مقام حاصل ہو اور باقی سب لوگ اس کی اتباع کریں۔ بادشاہت، آمریت اور جمہوریت سب اسی کی شکلیں ہیں۔ انسان نے اپنی عقل تجربہ اور روایات کے تحت جو قوانین بنائے وہ سب ناکام ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد بھی انسان کا اپنے خود ساختہ قوانین پر اصرار کرنا بہت بڑی نادانی ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ ایک بلند تر ہستی کا قانون، جو تمام خامیوں سے پاک ہو، انسان پر حکمرانی کرے۔ یہ بلند تر ہستی صرف خدا ہی کی ہو سکتی ہے جو اس کا خالق و مالک ہے۔ جماعت اسلامی نے مختلف پہلوؤں سے یہ حقیقت واضح کی کہ وہی ہمارا حاکم تکوینی بھی ہے اور حاکم تشریعی بھی۔ اسی کا قانون صحیح اور جائز قانون ہے۔ کسی فرد، ادارہ یا گروہ کو اس سے آزاد ہو کر قانون سازی کا کوئی حق نہیں ہے جو اس حق کا دعویٰ کرے وہ اپنی حد سے تجاوز کرتا ہے اور ایک ایسی حیثیت کا دعویٰ کرتا ہے

جو فی الواقع اسے حاصل نہیں ہے

سب سے اہم بات یہ کہ جماعت اسلامی نے غلبۂ دین کے تصور کو ابھارا۔ اس نے بتایا کہ اسلام غالب ہونے کے لیے آیا ہے، وہ کسی دوسرے نظام کے تابع یا اس کا آلۂ کار بن کر رہنا نہیں چاہتا بلکہ دوسرے نظاموں کو اپنے تابع رکھنا چاہتا ہے۔ اسے جماعت نے حاکمیت اللہ کے ایک لازمی تقاضے کی حیثیت سے پیش کیا۔ جب اللہ تعالیٰ ہمارا حاکم ہے تو فطری بات ہے کہ پوری زندگی پر اسی کی حکومت ہونی چاہئے۔ عبادت اسی کی ہو، اخلاقیات اسی کے تابع ہوں، قانون اسی کا چلے۔ معیشت اسی کے احکام کی پابند ہو۔ سیاست میں اسی سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ غرض ہر شعبۂ حیات میں اسی کی ہدایات کی اتباع کی جائے۔ جب تک انسان پر انسان کی حکومت ہے اور کچھ افراد پوری دنیا کو نئے نئے فلسفوں کے تحت غلامی کا درس دے رہے ہیں، اللہ کے دین کو یہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ قیادت و سیادت کا منصب اللہ کے دین کو حاصل ہو اور ہر میدان میں وہ فیصلہ کن رول ادا کرے اس کے لیے بڑی طویل جد و جہد کرنی پڑے گی اور اس راہ کی شدائد اور مشکلات برداشت کرنی ہوں گی۔

بعض دینی حلقے اس جد و جہد کو ناپسند کرتے تھے۔ اس کی انھوں نے مخالفت بھی کی۔ جماعت اسلامی نے اس کی تردید کی اور ثابت کیا کہ اللہ کا دین اگر غالب ہونے کے لیے آیا ہے تو یہ جد و جہد ضروری ہے۔ اسلام کی محکومی اور زیردستی پر مطمئن ہو جانا اور اس کو سربلند کرنے کی کوشش سے کنارہ کش رہنا ایمان کی کمزوری کی دلیل ہے۔ ایمان کا واضح تقاضا یہ ہے کہ آدمی دین کی محکومی پر تڑپ اٹھے اور اپنا سر دے کر بھی اسے غالب کر سکتا ہو تو دریغ نہ کرے۔ اس کے ساتھ اس نے دین کے مغلوب اور محکوم ہونے کے نقصانات واضح کئے اور بتایا کہ اس سے دین و شریعت کے بہت سے شعبے عملاً معطل ہو جاتے ہیں اور دین کے اسی حصہ پر عمل ممکن ہوتا ہے جس پر عمل کی نظام غالب اجازت دے۔ یہ اجازت اسی حد تک ہوتی ہے جس حد تک اس کے مفاد کو ٹھیس نہ پہونچے۔ اس کی مزاحمت نہ ہو تو یہ اجازت محدود سے محدود تر بھی ہو سکتی ہے اور ایک وقت وہ بھی آسکتا ہے جب کہ اسلام کا نام لینا بھی دشوار ہو جائے۔ پھر یہ کہ ایک محدود دائرہ میں اسلام پر عمل ہو تو اس کے وہ ثمرات بھی ظاہر نہیں ہو سکتے جو اس وقت ظاہر ہو سکتے ہیں جبکہ ہر طرف اس کی حکمرانی ہو۔

مقالات:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی

ایک نمونہ

ڈاکٹر محمد زکی، شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ازدواجی زندگی انسان کی بنیادی ضرورت بھی ہے اور نسل انسانی کی بقا کا معقول و مناسب ذریعہ بھی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کی تقریباً آدھی زندگی اپنے گھر میں اہل و عیال کے ساتھ گزرتی ہے۔ اس کا گھر ہی اولین تربیت گاہ اور تجربہ گاہ بھی ہے، اور یہاں جو زندگی گزرتی ہے۔ وہی معاشرتی زندگی کے دوسرے شعبوں پر اثرانداز ہوتی ہے اس لیے ازدواجی زندگی کی بہت اہمیت ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بہت سے مذاہب اور رہنماؤں نے ازدواجی زندگی میں نظم و ضبط پیدا کرنے اور اسے زیادہ سے زیادہ خوشگوار بنانے کے لیے کچھ نہ کچھ اصول و ضوابط مقرر کیے ہیں۔

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زندگی کے بعض دوسرے شعبوں کی طرح ازدواجی زندگی سے متعلق کچھ اصولوں کا جان لینا کافی نہیں بلکہ یہاں بھی ایک عملی نمونے کی ضرورت ہے جسے ہر انسان اپنے سامنے رکھ سکے اور اسی سانچے میں اپنی زندگی بھی ڈھالنے کی کوشش کر سکے اور اس یقین کے ساتھ کہ جن اصولوں کی اسے تعلیم دی جا رہی ہے وہ قابل عمل بھی ہیں۔

اس مقصد کے پیش نظر جب دنیا کی مقدس ترین ہستیوں یعنی انبیاء کرامؑ اور دوسرے مذہبی رہنماؤں کی طرف نظریں اٹھتی ہیں تو دو ہی باتیں نظر آتی ہیں، وہ یہ کہ یا تو انھوں نے ازدواجی زندگی اختیار ہی نہیں کی جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام، یا اگر انھوں نے ازدواجی زندگی گزاری ہے تو ان کی زندگی کے اس شعبے کے بارے میں آج دنیا کے سامنے مفصل اور مستند معلومات موجود نہیں ہیں۔ یہ بات حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسری مقدس ہستیوں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

اس کی بظاہر دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ازدواجی زندگی ایک ایسا شعبہ حیات ہے جسے نجی اور پرائیوٹ سمجھا جاتا ہے اور عام طور پر یہ عوام کے سامنے نہیں آتا، نیز اس ساز کے کچھ تار ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی مضراب کے متحمل نہیں ہوتے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان پاکیزہ ہستیوں کے ماننے والوں اور مقلدوں نے ان معلومات کے محفوظ رکھنے کا بھی اہتمام نہیں کیا جو ان پر ظاہر ہو گئی تھیں۔

پوری انسانی تاریخ میں صرف ایک ہی ذات اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے، اور وہ ہے اللہ کے آخری رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی جن کے بارے میں خود خالق کائنات نے اعلان فرمادیا ہے کہ:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ؕ (الاحزاب، ۲۱)	درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ تھا، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرلے۔

یہاں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کو بلا تخصیص و تفصیل بہترین نمونہ قرار دیا گیا ہے جس میں آپؐ کی حیات مبارکہ کا وہ حصہ بھی شامل ہے جو آپؐ نے اپنے احباب کے ساتھ گذارا اور وہ بھی جو ازواج کے ساتھ گذارا۔

آپؐ کی ازدواجی زندگی کے دو پہلو ہیں، ایک تو یہ کہ اس میں اہل ایمان کے لیے سرمایہ رہنمائی ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ کس طرح زندگی گذاریں، اُن کے ساتھ کس طرح پیش آئیں اور دوسرا یہ کہ مسلمان عورتوں کے لیے بھی نمونہ ہے کہ وہ اپنے شوہروں کے ساتھ کس طرح زندگی گذاریں ان کے کیا حقوق ہیں اور کیا کیا فرائض ہیں اور کس طرح خوشگوار و کامیاب زندگی گزار سکتی ہیں۔

ازدواجی زندگی کا جامع نمونہ کثرت ازدواج کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ تو ایک بالکل واضح حقیقت ہے کہ مردوں کے مختلف طبقات ہیں اور اسی طرح عورتوں کے بھی اور ان میں سے ہر ایک کے وسائل و مسائل، عادات و خصائل، جذبات و احساسات، امنگیں اور آرزوئیں دوسرے سے مختلف ہیں اس لیے کسی ایک خاص طبقے سے تعلق رکھنے والے مرد یا عورت کی زندگی تمام مردوں یا عورتوں کے لیے نمونہ حیات نہیں بن سکتی۔ مثلاً اگر ایک مال دار شخص نے دولت کی فراوانی اور ہر طرح کے عیش و آرام کے ساتھ ایک خوش گوار ازدواجی زندگی گزاری ہے تو وہ ایک غریب انسان کے لیے نمونہ نہیں بن سکتا، یا اگر کسی شخص نے کسی بیوہ سے شادی کی اور بہت

خوش گوار زندگی بسر کی تو وہ اس شخص کے لیے نمونہ نہیں بن سکتا جس نے کسی کنواری لڑکی سے شادی کی ہو۔ یہ جامعیت صرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سیرت میں مل سکتی ہے کیوں کہ آپؐ نے ایک دو نہیں، کم از کم گیارہ شادیاں کیں اور آپؐ کی ان ازواج مطہرات کا تعلق عورتوں کے مختلف طبقات سے تھا اور اس طرح یہ ہر طبقے کی نمایندگی کر رہی تھیں، ان میں عرب بھی تھیں اور غیر عرب بھی۔ عام اور اوسط گھرانوں کی بھی اور سرداروں کی بیٹیاں بھی، بیوائیں بھی اور کنواری بھی، آپؐ سے بہت زیادہ عمر کی بھی اور بہت کم عمر کی بھی اور درمیانی عمر کی بھی، وہ کنیزیں بھی جنھیں آزاد کر کے آپؐ نے حرم میں داخل فرمایا اور وہ بھی جو کنیز ہی کی حیثیت میں رہیں، وہ بھی جن سے آپؐ کے اولادیں ہوئیں اور وہ بھی جن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

مختصراً یوں سمجھئے کہ نبی کی زندگی اپنے اپنے دور میں لوگوں کے لیے نمونہ رہی ہے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس تمام انبیاء کرامؑ کی سیرتوں کی جامع ہے، آپؐ کے گلشن حیات میں تمام نبیوں اور رسولوں کی سیرتوں کے پھول جمع ہو گئے ہیں اس طرح آپ کی ازدواجی زندگی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہر نبی کی ازدواجی زندگی کا عکس مل جائے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کے ہر انسان کے لیے آپؐ کی ازدواجی زندگی میں بہترین اور مکمل نمونہ موجود ہے۔

اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ دنیا میں جتنی بھی مقدس اور پاکباز خواتین گزری ہیں ان سب کی سیرتوں کی جھلک آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کی زندگیوں میں مل جائے گی۔ بالفاظ دیگر آپؐ کی ازواج مطہرات تمام جہاں کی عورتوں کے لیے نمونہ ہیں جن کے مطابق عورتیں اپنی اپنی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کر سکتی ہیں۔

اب یہ بات آپ کی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی شادیاں نہ کی ہوتیں تو تمام مردوں کے لیے ازدواجی زندگی کا ایسا جامع اور مکمل نمونہ نہیں مل سکتا تھا اور نہ ہی عورتوں کے لیے قابل تقلید نمونے موجود ہوتے اور اس طرح انسانی زندگی کا یہ شعبہ تشنہ رہ جاتا۔ آپؐ کی کثرت ازدواج نے اس کمی کو پورا کر دیا، ازدواجی زندگی کا ایک جامع نمونہ پیش کر دیا تاکہ ہر مرد اور عورت اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال سکے۔

یہ جامعیت ثبوت ہے آپؐ کی رسالت کا ازدواجی زندگی کا اتنا جامع اور مکمل نمونہ کوئی دوسرا انسان آج تک پیش کر سکا نہ کر سکتا ہے۔ اس کی وجوہ ظاہر ہیں۔ پہلی تو یہ کہ ازدواجی زندگی

ہر انسان کی بالکل نجی اور پرائیویٹ زندگی ہوتی ہے جسے کوئی شخص بھی عوام کے سامنے بے نقاب کرنا نہیں چاہتا نیز اس کے بعض پہلو اتنے نازک ہوتے ہیں کہ انھیں راز ہی میں رکھنا پسند کرتا ہے۔ اس کے علاوہ انسان کی بہت سی کمزوریاں ایسی ہوتی ہیں جو دوسروں پر چاہے ظاہر نہ ہوں اس کی شریک حیات سے چھپی نہیں رہتیں، اُن کے بارے میں بھی ہر انسان یہی چاہتا ہے کہ یہ راز ہی میں رہیں۔ اس لیے کوئی بھی انسان ان گوشوں کو دوسروں کے لیے بطور نمونہ پیش نہیں کرسکتا۔

لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ چوں کہ آپ کی پرورش وتربیت ابتدا ہی سے خاص اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں ہوئی تھی اور آپؐ کی پوری زندگی کو نمونہ عمل بنانا مقصود تھا اس لیے آپؐ کی ہر حرکت وسکون، قول و عمل اللہ کی رضا میں ڈھلا ہوا تھا چنانچہ آپؐ کی ازدواجی زندگی میں بھی ہر گوشہ پاکیزہ اور حق کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا، یہاں کوئی کمزوری نہیں تھی جس پر پردہ ڈالنے کی ضرورت ہوتی۔ اس لیے ہر گوشے کو بے نقاب کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی تاکہ امت ہر ہر ادا میں پیروی کر سکے۔ اللہ کے رسول کے سوا ایسی عام اجازت کوئی دوسرا انسان نہیں دے سکتا، اور نہ کسی دوسرے انسان کی عظمت کی ضمانت دی جا سکتی ہے، اس اعتبار سے یہ بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی علامت ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی انسان یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس کا قول وفعل ہمیشہ اور ہر حال میں اللہ کی مرضی ہی کے مطابق ہوگا اس لیے ہر ہر معاملے میں اس کی پیروی کی جاسکتی ہے۔ بالخصوص ازدواجی زندگی میں جذبات کا زیادہ دخل ہوتا ہے، جن پر ہمیشہ کوئی انسان قابو نہیں پا سکتا، مثلاً خوشی، غم اور غصے کی حالت میں۔

یہ خصوصیت بھی صرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ہے کہ ان تمام کیفیات اور حالات میں بھی آپؐ کی زبان مبارک سے کوئی بات حق کے خلاف صادر نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی کیونکہ اس کی ضمانت خود خالق کائنات کے اس ارشاد میں موجود ہے۔

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں
إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (النجم ۳،۴) بولتا، یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔

۱؎ ایسا دعویٰ اللہ کے رسولوںؑ کے سوا کسی انسان نے نہیں کیا، اس لیے اگر لوگ ان کی جو رسول نہیں ہے ہر بات میں پیروی کرتے ہیں تو اس کی ذمہ داری خود پیروی کرنے والوں پر عائد ہوتی ہے۔

اس کلام میں آپؐ کی نجی زندگی کا کلام بھی شامل ہے اور وہ باتیں بھی جو کبھی غصے حتیٰ کہ ہنسی مذاق میں بھی آپؐ کی زبان مبارک سے صادر ہوئی ہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ جب کوئی انسان اپنی ہی عصمت کی ضمانت نہیں دے سکتا تو دوسروں کی عصمت کی ضمانت کس طرح لے سکتا ہے، یعنی ان عورتوں کی جنھیں وہ اپنے نکاح میں لاکر بطور نمونہ پیش کرسکے۔ وہ کس بنیاد پر دوسروں کو یقین دلا سکتا ہے کہ اس کی بیویاں عصمت و تقدس کا پیکر ہیں اور رہیں گی جب یہ بات ناممکن ہے تو یہ بھی ناممکن ہے کہ کوئی انسان ایک یا ایک سے زائد بیویوں کو بطور نمونہ پیش کرسکے۔

ایسی خواتین کا انتخاب وہی کرسکتا ہے جو ہر انسان کی صلاحیتوں سے واقف ہو، مستقبل کا علم رکھتا ہو، کامل قدرت رکھتا ہو تاکہ ان عورتوں کو توفیق دے کہ وہ حق کے مطابق زندگی گذاریں اور بہترین نمونہ پیش کرسکیں، اور ایسی ذات اس کائنات میں سوائے اللہ کے دوسری کوئی نہیں۔ چنانچہ اسی نے ان مقدس خواتین کا انتخاب فرمایا اور بعض کو براہ راست آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں دیا تاکہ آپؐ کی ازواج مطہرات تمام جہان کی خواتین کے لیے بہتر نمونہ بن سکیں۔

اور چوتھی وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص بھی انتہائی کوشش کے باوجود متعدد بیویوں کے ساتھ پورا پورا انصاف نہیں کرسکتا اور ازدواجی زندگی کا بہترین نمونہ پیش کرنے کے لیے دونوں باتیں ضروری ہیں یعنی متعدد عورتوں سے شادی کرنا اور سب کے ساتھ انصاف بھی کرنا۔

کثرت ازدواج اور سب کے ساتھ کامل انصاف کرنا بھی آپؐ کی رسالت کا ثبوت ہے

قرآن حکیم نے اس امر کا اعلان فرما دیا ہے کہ متعدد ازدواج کے ساتھ انصاف کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ ارشاد ہے:

اور تم اپنی طرف سے کتنے ہی خواہش مند ہو، لیکن یہ بات تمہاری طاقت سے باہر ہے کہ (ایک سے زیادہ) عورتوں میں کامل طور پر عدل کرسکو۔ پس ایسا نہ کرو کہ کسی ایک ہی کی طرف جھک پڑو، اور دوسری کو (اس طرح) چھوڑ بیٹھو گویا "معلقہ" ہے (یعنی ایسی عورت ہے کہ نہ تو بیوہ اور مطلقہ ہے کہ اپنا دوسرا انتظام کرے نہ شوہر اس کا حق ادا کرتا ہے کہ شوہر والی عورت کی طرح ہو، بیچ میں پڑی لٹک رہی ہے) (النساء ۴:۱۲۹)

چونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک مقصد ساری دنیا کے لیے ازدواجی زندگی کا بہترین نمونہ (اسوۂ حسنہ) بھی پیش کرنا تھا اور اس کے لیے، جیسا کہ عرض کیا جاچکا، ضروری

تھا کہ آپؐ متعدد ازدواج کو بہ یک وقت اپنے نکاح میں رکھیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو سب کے ساتھ انصاف کرنے کی غیر معمولی صلاحیت اور طاقت بھی عنایت فرمادی جو کسی دوسرے بشر کو نہیں دی گئی تاکہ یہ بھی آپؐ کی رسالت کی نشانی بن جائے۔

اور اس امر کی نہایت واضح اور محکم شہادتیں موجود ہیں کہ آپؐ نے دو چار نہیں کم از کم نو ازواج مطہرات بہ یک وقت اپنے حرم میں رکھ کر سب کے ساتھ انصاف اور بہترین سلوک کا وہ نمونہ پیش کیا ہے جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ملاحظہ ہو اس کی ایک جھلک۔

ازواج مطہرات کا مختصر تعارف جو مقدس اور پاکیزہ سیرت خواتین مختلف اوقات میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں ان کا مختصر تعارف یہ ہے۔

۱) **حضرت خدیجہؓ:** سب سے پہلے آپؐ کے نکاح میں حضرت خدیجہؓ آئیں، جو مکہ کی ایک شریف معزز، پاکیزہ سیرت، دولت مند اور حسین و جمیل خاتون تھیں۔ بیوہ ہو چکی تھیں۔ ان کا پہلا نکاح ابو ہالہ بن زرارہ تمیمی اور ان کے انتقال کے بعد عتیق بن عابد المخزومی سے ہوا تھا[1] اور ان کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ یہ رشتہ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہؓ (والدۂ حضرت زبیرؓ) کی بھاوج تھیں۔ جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا نکاح ہوا تو ان کی عمر تقریباً چالیس سال اور آپ کی تقریباً پچیس سال تھی۔

جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم رسالت سے نوازے گئے اور ہر طرف سے مخالفت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا تو حضرت خدیجہؓ آپؐ کی مونس و غم خوار رہیں اور آپ کی خاطر ہر قربانی پیش کی۔
جب تک یہ زندہ رہیں آپؐ نے دوسری شادی نہیں کی۔ جس وقت ان کا انتقال ہوا تو عمر تقریباً پینسٹھ سال اور آپ کی تقریباً پچاس سال ہو چکی تھی۔

ام المومنین حضرت خدیجہؓ مکہ میں مدفون ہوئیں۔

---

[1] بعض کے نزدیک پہلا نکاح عتیق سے ہوا۔ ان کے نام میں بھی اختلاف ہے مولانا شبلی وغیرہ نے "عتیق ابن عایذ" اور مولانا مودودی نے "عتیق بن عابد" لکھا ہے۔ دیکھئے سیرت النبیؐ ۲، ۲، ۲ سیرت سرور عالمؐ ۲، ۱۱۲

(۲) **حضرت سودہ بنت زمعہؓ**:۔ اکثر اصحاب سیر کے نزدیک حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر بار، بالخصوص بچیوں کی دیکھ بھال اور پرورش کی خاطر حضرت سودہ بنت زمعہؓ سے نکاح کیا۔ یہ قدیم الاسلام، اور بیوہ تھیں۔ ان کے شوہر سکران بن عمروؓ کا انتقال ہو چکا تھا۔ کافی سن رسیدہ تھیں[۱]۔ ان کا انتقال غالباً حضرت عمرؓ کی خلافت کے آخری دور میں ہوا۔

(۳) **حضرت عائشہؓ**:۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی ہیں۔ حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد مکہ ہی میں ان سے نکاح ہوا، اس وقت ان کی عمر چھ سات سال اور رخصتی مدینہ میں ہوئی جب کہ ان کی عمر تقریباً نو سال تھی۔ تمام ازواج مطہرات میں یہی وہ کنواری خاتون ہیں جو آپؐ کے نکاح میں آئیں۔ یہ نہایت سمجھ دار، اور حسین و جمیل تھیں اور آپؐ کی سب سے زیادہ محبوب زوجہ تھیں۔ ان کا انتقال ۵۸ھ میں ہوا جب کہ ان کی عمر تقریباً چھیاسٹھ سال تھی۔ بقیع میں مدفون ہیں۔

(۴) **حضرت حفصہؓ**:۔ یہ حضرت عمرؓ کی صاحبزادی ہیں۔ بعثت سے پانچ سال پہلے پیدا ہوئیں، یہ بھی بیوہ ہو چکی تھیں ان کے پہلے شوہر خنیس بن حذافہ السہمیؓ غزوۂ بدر یا احد میں زخم لگنے کی وجہ سے شہید ہو چکے تھے۔ ۳ھ میں خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح فرمایا۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ ذرا تیز مزاج تھیں۔ مشہور روایت ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ کے زمانۂ خلافت میں ۴۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

(۵) **حضرت زینب بنت خزیمہؓ**: فیاضی اور غربا پروری کی وجہ سے ام المساکین کے نام سے مشہور ہو چکی تھیں۔ ان کا نکاح حضرت عبداللہ بن جحشؓ سے ہوا تھا جو غزوۂ احد میں شہید ہو گئے تھے اور جن کا مشرکین کر نے بڑی بے دردی سے مثلہ کیا تھا۔ چنانچہ اسی سال آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کر لیا لیکن چند ماہ بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر تیس سال تھی۔ بقیع میں دفن کیا گیا۔

(۶) **حضرت ام سلمہؓ**: ان کا نام ہند تھا، شوہر کا عبداللہ بن عبدالاسدؓ، لیکن اپنے

---

[۱] انتی کر کچھ عرصے بعد انھوں نے اپنی باری حضرت عائشہؓ کو ہبہ کر دی تھی۔

بیٹے سلمہ کے نام پر حضرت ام سلمہؓ اور ابو سلمہؓ کی کینت سے دونوں مشہور ہیں۔ حضرت ابو سلمہؓ کی وفات غزوہ احد کے بعد ہوگئی تھی چنانچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کر لیا اور ابو سلمہؓ سے جو اولادیں تھیں ان کی پرورش کی بھی ذمہ داری لے لی۔

حضرت ام سلمہؓ کا انتقال غالباً ۶۳ھ کے آس پاس تقریباً ۸۴ سال کی عمر میں اور تمام دیگر ازواج مطہرات کے بعد میں ہوا۔

(۷) **حضرت زینب بنت جحشؓ:** یہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ لیکن آپؐ نے ان کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہؓ سے کر دیا تھا، اگرچہ ان کی مرضی نہیں تھی۔ یہ مان تو گئیں لیکن حضرت زیدؓ سے ان کا نباہ نہ ہو سکا، بالآخر حضرت زیدؓ نے انھیں طلاق دے دی۔ حضرت زینبؓ کی بے مثال قربانی کا انھیں یہ اجر ملا کہ ان کا نکاح خود اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کر دیا[1]۔ اسی بنا پر یہ روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بلا اذن ان کے گھر میں داخل ہو گئے اور خود حضرت زینبؓ دوسری ازواج مطہراتؓ سے فخریہ کہا کرتی تھیں کہ تمہارے نکاح تو تمہارے اولیاء نے کیے لیکن میرا خود اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا ہے۔

یہ بہت عبادت گزار، فیاض اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب تھیں۔ ان کا انتقال تمام ازواج مطہرات میں (آپؐ کے وصال کے بعد) سب سے پہلے تقریباً ۲۰ھ میں ہوا۔ جب کہ ان کی عمر تقریباً ۵۲ سال تھی (نکاح کے وقت عمر ۲۵ سال بتائی جاتی ہے)

(۸) **حضرت جویریہ بنت حارث:** یہ مشہور قبیلہ بنی المصطلق کے سردار حارث کی صاحبزادی تھیں اور ابن صفوان کی زوجہ۔

حارث نے ۵ھ میں مدینہ پر حملے کی تیاری کی تھی لیکن اس سے پہلے ہی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر حملہ کر دیا۔ یہ فرار ہو گیا مگر اس کے ساتھی اور سب لوگ گرفتار ہو گئے اور مال غنیمت کے ساتھ تقسیم کر دئے گئے۔ ان ہی میں حضرت جویریہؓ بھی تھیں جو ایک صحابی ثابت بن قیسؓ کے حصے میں آئیں لیکن ان سے مکاتبت کر لی یعنی یہ طے کر لیا کہ حضرت ثابت کو نو اوقیہ سونا ادا کر کے آزاد ہو جائیں گی۔ اتنا سونا ان کے پاس کہاں سے آتا۔ دربار رسالت میں امید لیے حاضر ہوئیں۔ آپؐ نے فرمایا اگر اس سے بھی بہتر سلوک کیا جائے تو قبول کرو گی۔ اور ظاہر ہے انھیں انکار

---

[1] تفصیل سورہ الاحزاب میں ہے۔

کیوں ہوتا۔ آپؐ نے یہ رقم ادا کر دی اور ان کی مرضی معلوم کر کے ان سے نکاح کر لیا۔ صحابہؓ کو جب ہی معلوم ہوا تو سب نے بنی المصطلق کے تمام قیدی (جو تقریباً ایک سو گھرانوں پر مشتمل تھے) آزاد کر دیے کیونکہ اس قبیلے کے لوگ آپؐ کے رشتہ دار ہو گئے تھے اور غلام نہیں رہ سکتے تھے۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ وہ فرماتی تھیں کہ میں نے نہیں دیکھا کہ کوئی عورت جویریہؓ سے زیادہ اپنی قوم کے لیے عظیم البرکت ثابت ہوئی ہو۔

۵ھ میں ان سے نکاح ہوا، اس وقت بیس سال کی تھیں اور ۵۰ھ میں انتقال ہوا جبکہ تقریباً پینسٹھ (۶۵) سال کی تھیں۔ بقیع میں دفن ہوئیں۔

(۹) **حضرت ام حبیبہؓ** : یہ اس وقت کے سب سے بڑے دشمن اسلام ابوسفیان کی صاحبزادی ہیں۔ ان کا نام رملہ اور بیٹی حبیبہ کے نام پر کنیت سے مشہور ہیں ان کی ولادت بعثت سے سترہ سال پہلے ہوئی۔ ان کا نکاح عبیداللہ بن جحش سے ہوا تھا۔ والد اور دیگر اعزا مخالفین اسلام تھے لیکن ان دونوں نے ابتدا ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا اور دونوں میاں بیوی نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ وہاں کچھ دنوں بعد ان کے شوہر نصرانی ہو گئے مگر یہ اسلام پر ثابت قدم رہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں جب آیا تو آپؐ نے حبشہ کے فرماں روا نجاشی کو پیغام بھیجا کہ وہ حضرت ام حبیبہؓ کا نکاح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دے۔ یہ خبر پاکر حضرت ام حبیبہ خوشی سے پھولی نہ سمائیں نکاح کے بعد شرحبیل بن حسنہؓ کی ہمراہی میں انھیں مدینہ بھیج دیا گیا۔ اس طرح (مشہور روایت کی رو سے) ۶ھ میں آپؐ کے عقد میں آئیں اور غالباً ۴۴ھ میں وفات پائی۔ (مدینہ ہی میں دفن ہوئیں)

(۱۰) **حضرت صفیہ بنت حیؓ** : یہ یہودیوں کے مشہور قبیلہ بنی نضیر کے سردار حیی بن اخطب کی بیٹی تھیں۔ ان کی شادی پہلے سلام بن مشکم قرظی اور پھر کنانہ بن ابی الحقیق سے ہوئی جو خیبر کا مشہور یہودی سردار تھا۔ ان کے باپ شوہر اور دوسرے اہل قبیلہ نے اسلام کی مخالفت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی، لیکن غزوۂ بنو قریظہ میں ان کے والد حی بن اخطب کو قتل کر دیا گیا تھا اور غزوۂ خیبر میں ان کا شوہر بھی قتل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد یہ آپؐ کے نکاح میں آئیں۔

یہ قیدی بنالی گئی تھیں اور ایک صحابی کے حصے میں آئی تھیں لیکن صحابہؓ کے اصرار پر آپؐ نے انھیں آزاد کر کے نکاح کر لیا۔ اس وقت ان کی عمر سترہ سال کے قریب تھی (یعنی ۷ھ میں) ۵۰ھ میں

وفات ہوئی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔

(۱۱) **حضرت میمونہ بنت الحارثؓ :** ابن سعد کی روایت کے مطابق یہی آخری خاتون ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں۔

ان کا پہلا نکاح مسعود بن عمرو بن عمیر الثقفی سے ہوا تھا۔ لیکن کچھ دن بعد انھیں طلاق دے دی اور پھر ابی رُہم بن عبدالعزیٰ کے نکاح میں آئیں اور ابو رُہم کے انتقال کے بعد آپؐ سے نکاح ہوا۔ ان کی وفات ۵۱ھ میں ہوئی۔

ان ازواج مطہرات کے علاوہ آں حضرت صلی اللہ کی چند کنیزیں، بھی تھیں ان میں زیادہ مشہور حضرت ماریہ قبطیہؓ ہیں جن کو مقوقس مصر نے ۷ھ میں آپؐ کی خدمت میں بھیجا تھا ان ہی کے بطن سے آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؓ پیدا ہوئے۔ اس لیے یہ ام ولد تھیں اور پردہ میں رہتی تھیں۔ ان کی وفات ۱۵ھ یا ۱۶ھ میں ہوئی اور بقیع میں دفن ہوئیں۔ محدثین اور اصحاب سیر کی تمام روایات اس پر متفق ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان ازواج مطہرات کے ساتھ کامل عدل فرماتے تھے۔ سب کا نفقہ برابر مقرر تھا، اور سب کی باری مقرر تھی جس میں فرق نہیں آتا تھا[1]، اور اس سلسلے میں کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملا۔

ازواج مطہرات کا آپ کی رفاقت پر دنیا کی ہر شے قربان کردینا بھی آپؐ کی رسالت کا کھلا ثبوت ہے۔

یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام ازواج مطہرات کے ساتھ کامل عدل فرماتے تھے، اور یہ وہ چیز ہے جو انسانی دسترس سے باہر ہے (جیسا کہ قرآن نے خود واضح کردیا ہے)۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان ازواج مطہرات کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت اور بے انتہا عقیدت نہ ہوتی۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر انھیں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر یقین محکم نہ ہوتا، اگر رسالت کی حسی اور واضح علامتیں انھوں نے ذات اقدس میں نہ دیکھی ہوتیں تو وہ آپؐ کی رفاقت کو دنیا و مافیہا پر ترجیح نہ دیتیں۔

---

[1] معمول یہ تھا کہ عصر کے بعد تمام ازواج (جن کی تعداد نو تھی) ایک گھر میں جمع ہوجاتی تھیں، اور آپؐ سب کی دلجوئی فرماتے اور پھر ان کے مکان میں شب کو قیام فرماتے جن کی باری ہوتی تھی۔ آپؐ کی ازواج مطہرات میں حضرت سودہؓ نے اپنی باری حضرت عائشہؓ کے حق میں ہبہ کردی تھی کیونکہ یہ کافی سن رسیدہ ہوچکی تھیں۔

اب آپ وہ حالات وشرایط ملاحظہ فرمائیں جو ازواج مطہرات کے سامنے تھیں اور پھر اس پر بھی غور فرمائیں کہ انھوں نے یہ بے مثال قربانیاں کس بنا پر پیش کیں۔ حالات یہ تھے:

(۱) جو مقدس خواتین آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں اور آرہی تھیں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں کہ آپ کے پاس نہ تخت تھا نہ تاج، دولت کی فراوانی تھی نہ عیش وعشرت اور شان وشوکت کا سامان ــــ اس کے برعکس فقر وفاقے کی زندگی، مصائب وآلام اور دنیوی دولت اور آرام سے محرومی کی زندگی تھی، اور یہ سب کی سب دنیوی اعتبار سے اچھے حالات سے آرہی تھیں لیکن فقر وفاقے کی زندگی کو ترجیح دے رہی تھیں۔ آخر کیوں؟

(۲) یہ بھی نہیں تھا کہ ان کی شادیاں کہیں اور نہیں ہوسکتی تھیں اور یہ توقع بھی نہیں تھی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی میں تنہا رہیں گی، آپ کی توجہ اور محبت میں کوئی دوسری خاتون شریک نہیں ہوگی، اس کے برعکس وہ جانتی تھیں اور دیکھ رہی تھیں کہ آپؐ کے حرم میں متعدد ازواج تھیں اور ان کی تعداد مقرر نہیں تھی، اضافہ ہو رہا تھا کمی نہیں۔ یہاں تک کہ تعداد بڑھتے بڑھتے بہ یک وقت نو تک پہنچ گئی تھی گو یا ہفتہ میں صرف انھیں ایک ہی شب میں آپؐ کی رفاقت حاصل ہوسکتی تھی۔ ان ہی چند لمحوں کو ان خواتین نے دنیا وما فیہا سے کہیں زیادہ قیمتی سمجھا اور اس پر دل سے راضی بھی رہیں، آخر کیوں؟

(۳) عام حالات میں اگر ایک شخص کی متعدد بیویاں ہوں تو ظاہر ہے اس کی محبت اور توجہ بٹ جائے گی اور یہ بات ان بیویوں پر گراں گزرے گی جنہیں اپنے شوہر سے محبت ہے ان میں سے ہر ایک یہی چاہے گی کہ اس کا محبوب شوہر اسی کو چاہے اور اسی کی طرف زیادہ سے زیادہ متوجہ رہے، البتہ اس بیوی کو زیادہ احساس نہیں ہوگا جسے خود بھی اپنے شوہر سے لگاؤ نہیں، اسے اس کا غم نہیں ہوگا کہ وہ کس کو اور کتنا چاہتا ہے۔

لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کا معاملہ یہ تھا کہ انھیں آپؐ سے بے پناہ محبت تھی اور آپؐ کے ساتھ چند ساعت گزارنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کردینے کے لیے تیار تھیں۔ اس شدید محبت کے باوجود انھوں نے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ آپ دوسری ازواج کو علحدہ کردیں، بلکہ انھیں جو لمحات بھی آپؐ کے ساتھ مل گئے انھیں ہی دنیا وما فیہا سے زیادہ قیمتی سمجھا۔

(۴) ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی عورت بعض مجبوریوں کی بنا پر اپنے شوہر کے ساتھ رہنا گوارا کرلیتی ہے اپنے ارمانوں اور خواہشات کو دبا لیتی ہے لیکن شوہر کے انتقال کے بعد وہ آزاد ہو جاتی ہے، دوسرا نکاح

کرسکتی ہے اور اس طرح اسے اپنی خواہشات کی تکمیل کا موقع مل جاتا ہے، اور اسی امید پر وہ سخت تکالیف کو برداشت کرلیتی ہے۔

ازواج مطہرات کے ساتھ معاملہ یہ تھا کہ دنیوی عیش و آرام تو درکنار ضروریات زندگی ہی پوری نہیں ہو پاتی تھیں۔ ہمیشہ تو یہ صورت نہیں تھی کہ کچھ ہوتا ہی نہ ہو، ان کو ملتا تھا لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہ کر ان کے اخلاق اتنے بلند ہو چکے تھے کہ خود بھوکی رہتیں اور آپؐ کے ساتھ فاقے برداشت کرتی تھیں اور غریبوں، محتاجوں، مسافروں اور ضرورت مندوں کو کھلا دیتی تھیں۔ یہ دور وہ اس امید پر نہیں گزار رہی تھیں کہ آئندہ کبھی انھیں عیش و آرام کی زندگی گزارنے کا موقع مل جائے گا، کیونکہ قرآن کریم نے انھیں عام عورتوں کی صف سے نکال کر ”امہات المومنین“ بنا دیا تھا، وہ امت کی مائیں بن گئیں تھیں اور اسی بنا پر اعلان کر دیا گیا تھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد وہ کبھی کسی بھی مرد سے نکاح نہیں کرسکیں گی۔ ارشاد ہے:

اور نبی کی بیویاں اُن کی (یعنی اہل ایمان کی) مائیں ہیں۔ (الاحزاب، ۳۳/۶)

آگے پھر اہل ایمان سے خطاب فرماتے ہوئے تاکید ہے،

تمہارے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ اللہ کے رسولؐ کو تکلیف دو، اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو، یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے (الضاً ۳۳/۵۳)

ازواج مطہرات یہ جانتی تھیں اور تاریخ شاہد ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ان میں سے کسی نے نکاح کیا اور نہ کبھی انھیں اس کا خیال بھی آیا اگرچہ ان میں اکثر کی عمر ایسی تھی کہ شادی کرسکتی تھیں۔

یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے اتنی بڑی قربانی آخر کیوں دی، آپؐ کی حیات میں بھی اور آپؐ کے وصال کے بعد بھی؟ آخر انھوں نے آپ کی ذات اقدس میں وہ کیا چیز دیکھی تھی کہ آپ کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا؟

اس اہم سوال کا یہی واحد جواب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتی تھیں اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر انھیں یقین محکم تھا اور اپنی آنکھوں سے انھوں نے رسالت کی ایسی ظاہری اور واضح علامات دیکھی تھیں کہ ان کے نزدیک آپؐ کی ذات اقدس سے وابستگی ہی دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمتی تھی۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ انھیں اس پر مجبور نہیں کیا گیا تھا بلکہ پوری آزادی دے دی گئی تھی کہ وہ

چاہیں تو آزادی حاصل کر کے دنیوی عیش و آرام کی زندگی بھی گزار سکتی ہیں اور چاہیں تو آپؐ کی رفاقت اختیار کر کے آخرت کی نعمتوں سے اپنے دامن بھر لیں انھوں نے آپؐ کی رفاقت اور آخرت کو ترجیح دی، اور اس پر خود قرآن شاہد ہے، ارشاد ہے:

اے نبی! اپنی بیویوں سے کہو اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمھیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دار آخرت کی طالب ہو تو جان لو کہ تم میں سے جو نیکوکار ہیں اللہ نے ان کے لیے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔ (الاحزاب، ۲۸-۲۹)

جب یہ معاملہ ازواج مطہرات کے سامنے پیش کیا گیا تو سب نے آپؐ کی رفاقت ہی کو اختیار کیا۔ اگر انھیں اللہ اور آخرت پر یقین نہ ہوتا اور آپؐ کی رسالت کی نشانیاں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھی ہوتیں تو وہ یہ فیصلہ ہرگز نہ کرتیں۔

اس قسم کے نکاح اللہ کے نبی کے سوا کوئی دوسرا شخص کر ہی نہیں سکتا

آپؐ کی ازدواجی زندگی اور کثرت ازواج کا ایک اور پہلو بھی خاص طور پر قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ جن مقدس خواتین سے آپؐ نے نکاح فرمایا ہے ان سے نکاح کرنا ہی آپؐ کی رسالت کا کھلا ثبوت ہے، کیونکہ ایسے نکاح اللہ کے رسول کے سوا کوئی دوسرا کر ہی نہیں سکتا۔ مثلاً

حضرت عائشہؓ ہی کو لے لیجئے۔ یہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معتمد ترین دوست کی صاحبزادی ہیں اور جب سے انھوں نے ہوش سنبھالا اس وقت سے برابر آپؐ کو اپنے گھر میں آتے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتے جلتے اور گفتگو فرماتے دیکھا اور سنا تھا۔ اس کے بعد جب آپ کے نکاح میں آئیں تو آپؐ کو سب سے زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ کم از کم پندرہ سال تک انھوں نے آپ کی زندگی کے ہر پہلو کو دیکھا اگر منکرین کے شبہات میں ذرا بھی جان ہوتی تو وہ ان کی نظر میں ضرور کھٹکتے ہمارا اشارہ اس الزام کی طرف ہے جو بعض منکرین نے یوں ہی چلتے ہوئے لگا دیا تھا کہ آپ کی مجلس میں کچھ لوگ تورات و انجیل وغیرہ پڑھتے اور لکھتے رہتے ہیں اور پھر یہی قصے آپؐ وحی کے نام سے سنا دیتے ہیں، قرآن میں اسی کی طرف اشارہ ہے:

جن لوگوں نے نبی کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ فرقان

ایک من گھڑت چیز ہے جسے اس شخص نے آپ ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے۔ بڑا ظلم اور سخت جھوٹ ہے جس پر یہ لوگ اتر آئے ہیں۔ کہتے ہیں یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنھیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ اسے صبح وشام سنائی جاتی ہیں۔ اے محمدؐ ان سے کہو کہ اسے نازل کیا ہے اس نے جو زمین اور آسمان کا بھید جانتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ (الفرقان، ۲۵: ۴-۶)

اب ذرا غور فرمایئے، منکرین کے بقول، مدد کرنے والے کچھ دوسرے لوگ کون ہوسکتے تھے، وہ جن پر آپؐ کو اعتماد تھا یا وہ جو آپؐ کے منکر اور دشمن تھے، نقل کرنے والے اگر تھے یا ہوسکتے تھے تو وہ حضرت صدیق اکبرؓ، عثمان غنیؓ، حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ یا ابولہب، ابوجہل، ابوسفیان یا ولید بن مغیرہ، اگر نقل کا یہ کام ہوتا تو دوستوں کے گھر میں ہوتا یا دشمنوں کے گھر میں؟ اگر اس الزام میں ذرا بھی صداقت ہوتی تو کیا حضرت ابوبکرؓ راز درانہ ہوتے، اور اگر ایسا ہوتا تو وہ خود بھی ایمان لے آتے، اپنی صاحبزادی کا نکاح بھی آپؐ سے کر دیتے اور کیا حضرت عائشہؓ "نقل" اور "مدد" سے بے خبر رہ سکتی تھیں؟

حضرت ام حبیبہؓ کے معاملے کو لیجیے۔ ان کے والد ابوسفیان ابتدا ہی سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کٹر مخالف تھے اسلام اور مسلمان دشمن تھے لیکن ان کی صاحبزادی حضرت ام حبیبہؓ انکے شوہر عبیداللہ بن جحش اسلام لائے اور حبشہ کی طرف ہجرت بھی کی۔ حضرت ام حبیبہؓ محض شوہر کی وجہ سے اسلام نہیں لائی تھیں بلکہ انھیں آپؐ کی رسالت پر یقین محکم تھا جب ہی تو اپنے اعزا واقربا اور وطن کو چھوڑ دیا اور پھر حبشہ میں ان کے شوہر نصرانی ہوگئے تو بھی یہ اسلام پر قائم رہیں اور پھر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں بھی داخل ہوگئیں۔

اس نکاح کا یہ پہلو بھی قابل توجہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سب سے بڑے دشمن کی بیٹی سے نکاح فرمایا تھا۔ کیا ایسے حالات میں کوئی شخص یہ ہمت کرسکتا ہے کہ اپنے سب سے بڑے دشمن کی بیٹی سے نکاح کرے اور اس کے سامنے اپنی زندگی کو ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح پیش بھی کر دے اور اسے اس کا اندیشہ بھی نہ ہو کہ بیٹی باپ کی محبت سے مغلوب ہوکر نقصان بھی پہنچا سکتی ہے؟ دنیا کے کسی انسان کو کامل اعتبار اسی وقت ہوسکتا ہے جب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے اطمینان دلایا جائے، اور آپؐ کے معاملے میں اس کے سوا کسی دوسری صورت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے بعد یہ بھی حقیقت ہے کہ نکاح میں آجانے کے بعد حضرت ام حبیبہؓ کو آپؐ کی نجی زندگی کو بہت قریب

سے دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ اگر آپؐ کی رسالت میں کسی بھی قسم کے شبہ کی گنجائش ہوتی تو حضرت ام حبیبہؓ کو ہو سکتا تھا۔ اگر قرآن کے بارے میں منکرین کے الزام میں سچائی کا ادنیٰ سا شائبہ بھی ہوتا تو ام حبیبہؓ کی نظر سے نہیں بچ سکتا تھا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ تورات و انجیل سے قصے نقل ہوتے اور حضرت ام حبیبہؓ کو علم نہ ہوتا اور یہ سب کچھ جاننے کے باوجود کیا وہ اپنے باپ سے وہ سلوک کرتیں جو اس روایت میں مذکور ہے۔

ابوسفیان صلح حدیبیہ کی تجدید کے سلسلے میں مکہ آئے اور اپنی بیٹی حضرت ام حبیبہؓ سے ملنے گئے۔ انھوں نے ان کو آتا دیکھ کر فرش اٹھا دیا۔ انھوں نے پوچھا، بیٹی تم نے فرش اٹھا دیا، فرش کو میرے قابل نہیں سمجھا یا مجھ کو فرش کے قابل نہیں سمجھا؟ حضرت ام حبیبہؓ نے جواب دیا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرش ہے اور تم مشرک اور نجس ہو اس لیے میں نے پسند نہیں کیا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرش پر بیٹھو۔[1]

اگر حضرت ام حبیبہؓ نے آپ کی رسالت کی روشن علامتیں خود مشاہدہ نہ کی ہوتیں تو اپنے والد سے یہ بات نہیں کہہ سکتی تھیں۔

ان کے علاوہ حضرت صفیہؓ کا واقعہ بھی بہت دل چسپ اور قابل توجہ ہے۔ ان کے نکاح کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اس کی مزید تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

ابن عمرؓ روایت فرماتے ہیں کہ حضرت صفیہؓ کی آنکھ پر کچھ نیلا سا نشان تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا تمہاری آنکھوں پر یہ سبز نشان کیسا ہے۔ انھوں نے کہا، میں نے اپنے شوہر سے ایک بار کہا کہ جیسا لوگ خواب دیکھا کرتے ہیں میں نے بھی ایک خواب دیکھا ہے، گویا چاند میری گود میں آگیا ہے۔ یہ سنتے ہی فوراً انھوں نے میرے منہ پر ایک تھپڑ مارا اور کہا کیا تیرا ارادہ اس شاہ یثرب سے نکاح کرنے کا ہے۔ وہ کہتی ہیں (بھلا میرا یہ ارادہ کیسے ہو سکتا تھا) میرے والد اور میرے شوہر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے قتل کئے گئے تھے اس لیے مجھے تو آپؐ کی طرف سے اس کی سخت ناگواری تھی لیکن جب آپؐ نے مجھ کو یہ سمجھایا کہ تمہارے والد ہی تمام عرب کو میرے مقابلے کے لیے چڑھا کر لائے تھے اور میرے ساتھ یہ عداوتیں کی تھیں تو پھر میرے دل سے یہ بات نکل گئی۔[2]

اب ذرا اس پر غور فرمایئے کہ یہودیوں کے دو قبیلے، بنو قینقاع اور بنی نضیر، مدینے سے نکال دیے گئے تھے اور بنو قریظہ کے کافی لوگ قتل کر دیے گئے تھے۔ بعد میں خیبر بھی فتح ہو گیا جہاں یہودیوں

---

[1] یہ اور دیگر روایات مشہور ہیں۔ ہم نے "اصح السیر" (مولانا ابو البرکات) اور سیرت النبیؐ (مولانا شبلی) سے لی ہیں۔ [2] الطبرانی۔ (ترجمان السنہ، ج ۳، صفحہ ۳۲۴)

کا بڑا اجتماع تھا اور حضرت صفیہؓ کے والد حی بن اخطب اور پھر ان کے شوہر کنانہ بن ابی الحقیق کو بھی قتل کر دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے ان کے جذبات کیا ہوں گے، دل کی صاف تھیں اس لیے انھوں نے اظہار بھی کر دیا۔

عام نظر میں ان کی طرف سے خدشات کا ہونا ایک فطری بات تھی کہ نہ جانے کیا کر بیٹھیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آجانے کے بعد انتقام کا موقع بھی میسر تھا اگرچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بالکل مطمئن تھے لیکن سب کی یہ کیفیت نہیں تھی چنانچہ ایک صحابی حضرت ابو ایوبؓ بغیر آپؐ کے علم میں لائے ہوئے تمام رات آپؐ کے خیمے کے گرد پہرا دیتے رہے۔ صبح کو جب آپؐ کے علم میں آیا تو آپؐ نے صحابی موصوف سے پہرے کا سبب دریافت فرمایا۔ انھوں نے جواب دیا کہ، یا رسول اللہ، صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اندیشہ تھا کہ اس عورت کے باپ شوہر اور قبیلے کے لوگ آپؐ ہی کے حکم سے قتل ہوئے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ (جذبۂ انتقام سے مغلوب ہو کر) آپؐ کے خلاف کوئی حرکت کر بیٹھے۔ اس پر آپؐ مسکرا دیے۔[1]

اس واقعے سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ آپؐ کو یقین تھا کہ ام المومنین حضرت صفیہؓ آپؐ کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گی اور یہ یقین سوائے تائید الٰہی کے اور کسی سبب سے نہیں ہو سکتا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اگر اللہ کی طرف سے اشارا نہ ہو تو کوئی شخص بھی یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ ایک ایسی یہودی عورت سے نکاح کرے جس کی قوم کے اتنی بڑی تعداد میں لوگ قتل ہوئے ہوں، اس کے باپ کو قتل کیا گیا ہو اور شوہر کو بھی قتل کر دیا گیا ہو جس سے نئی نئی شادی ہوئی تھی اور پھر نہایت اطمینان سے اس کے ساتھ رات بھی گزار دے۔

خلاصۂ کلام: یہاں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی کے صرف چند پہلوؤں کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ آپؐ نے متعدد شادیاں کیں اور یہ یقیناً بہت سی حکمتوں پر مبنی تھیں ان کے پیچھے بہت سے تکوینی راز تھے ان ہی میں ایک اعجازی پہلو بھی ہے یعنی یہ کہ آپؐ کی کثرتِ ازواج آپؐ کی رسالت کی علامت بھی ہے کیوں کہ ازدواجی زندگی انسانی زندگی کا نہایت اہم شعبہ ہے، اس میں اگر بگاڑ آ جائے تو پورا انسانی معاشرہ بگڑ جائے گا، اس کو خوش گوار، متوازن اور بہتر طور پر گزارنے کے لیے ایک نمونہ ناگزیر ہے اور وہ جب

[1] دیکھیے سیرت ابن ہشام (غزوۂ خیبر)

ہی ممکن ہے کہ کسی انسان کامل نے متعدد شادیاں کر کے ایک بہترین مثال قائم کی ہو تاکہ دنیا کا ہر انسان اسی سانچے میں اپنی ازدواجی زندگی کو ڈھال سکے، اور اس کے ساتھ ہی اس انسان کامل کی ازواج بھی اتنی بلند اور پاکیزہ سیرت ہوں کہ نسوانی دنیا کے لیے نمونہ بن سکیں۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے جس کا اعتراف ہر متعصب شخص کو بھی کرنا پڑے گا کہ دنیا کی تاریخ میں ایسی ہستی سوائے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی دوسری موجود نہیں۔ آپؐ کی ازدواجی زندگی ایک بہترین نمونہ ہے اور آپؐ کی رسالت کا ثبوت بھی کیونکہ کوئی بھی انسان ازدواجی زندگی کے لیے نمونہ نہیں بن سکتا، یہ بھی ایک معجزہ ہے جو اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا ہے۔

تحریک اسلامی کا فکری پس منظر

ڈاکٹر احمد سجاد رانچی

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

(البقرۃ ۲۸)

تم لوگ اللہ کے ساتھ کفر کا رویہ کیسے اختیار کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے اس نے تم کو زندگی عطا کی پھر وہی تم پر موت طاری کرے گا، پھر وہی تم پر دوبارہ زندگی عطا کرے گا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

(آل عمران : ۱۱)

تم (اے مسلمانو) وہ بہترین گروہ ہو جسے انسانوں کی ہدایت کے لیے برپا کیا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ اگر اہل کتاب (یہودی اور عیسائی) بھی ایمان لے آتے تو انہی کے حق میں بہتر تھا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ تو مومن بھی ہیں لیکن ان کی اکثریت نافرمانوں پر مشتمل ہے۔

اسی طرح آیت الذین جاھدوا فینا لھوسبنا (العنکبوت ۔ ۶۹)

چند احادیث رسول کریمؐ ۔

حضرت ابوسعیدؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

ان افضل الجھاد کلمۃ الحق عند سلطان جائر (ابن ماجہ، ترمذی، ابوداؤد)

بہترین جہاد وہ کلمہ حق ہے جو کوئی شخص کسی ظالم حکمراں کے سامنے کہتا ہے۔

حضرت نواس بن سمعان سے روایت ہے :

لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق (ترمذی)

خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔

یہ اور اس طرح کی آیات و احادیث اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ حیات و کائنات کی حقیقت حرکی ہے۔ یہ روز و شب کا سلسلہ، ماہ و سال کا تسلسل، موسموں کا تغیر، ابر و باد کی آمد، دریا کی روانی، چشموں کا ترنم، گود سے گور تک کے نشیب و فراز، قوموں کا عروج و زوال اور تاریخ کے الٹ پھیر (تلك الایام نداولها بین الناس) یہ سب حقائق حیات و کائنات کی اس ارتقا پذیری کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

اس تغیر پذیر کائنات میں اسلام چونکہ آخری دین اور قرآن پاک آخری کتاب کی حیثیت سے نازل ہوا ہے اس لیے اقبال کے لفظوں میں

"اسلامی ثقافت کا مفہوم اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ مشاہدات کے لیے زاویہ نظر بدلتے ہی تصورات کو نیا مفہوم مل جائے کیونکہ اسلام بذات خود تحریک ہے جو ہر دور کے تغیرات کو اپنے اندر جذب کر کے تجربے اور روایت کو نئے سرے سے منظم کرتی ہے۔"

قرآن حکیم میں ہم کو صاف طور پر اس کا اشارہ ملتا ہے کہ آدمی کی فرشتوں پر بزرگی اس میں ہے کہ وہ اشیاء کو نام دے سکتا ہے اور فرشتے اس کو نام نہیں دے سکتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی تعقلات (CONCEPTS) بنا سکتا ہے۔ اس کا علم تعقلی ہوتا ہے۔ وہ کلیات کو تشکیل دے سکتا ہے گو ان کلیات کی تشکیل بغیر مشاہدے کے ممکن نہیں۔ ایک مشہور حدیث ہے کہ

اذا اتیٰ علیّ یومٌ لا ازداد فیه	جب مجھ پر ایسا دن آئے کہ میں اس میں ایسے
علما یقربنی الی الله عزوجل	علم میں ترقی نہ کروں جو مجھ کو اللہ عزوجل کے قریب
فلا لی فی طلوع الشمس ذالك	کر دے تو اس روز کے طلوع میں میرے لیے کوئی
الیوم ۔	برکت نہ ہو۔

بالفاظ دیگر بحیثیت ایک ثقافتی تحریک اسلام کائنات کو جامد اور غیر متحرک نہیں مانتا۔ کائنات اس کی نظر میں تغیر اور حرکت سے عبارت ہے۔ لیکن اس کی اساس روحانی اور ابدی ہے۔ اس ابدیت کا زمانی اور تاریخی اظہار تغیر اور تنوع کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، گویا اسلام ثبات اور تغیر کا یکساں لحاظ رکھتا ہے۔ وہ ابدی اصولوں کی رہنمائی میں اجتماعی زندگی کو منظم کرتا ہے۔ یہ ابدی اصول تغیر کے منافی نہیں کیونکہ تغیر قرآن حکیم کی رو سے خدا کی آیات میں سے ایک زبردست آیت ہے۔

کل یوم ھو فی شان ؓ ع کہ آرہی ہے صدائے دمادم کن فیکون

اور جب ابدیت کے اصولوں کی تعبیر اس طرح کی جائے کہ تغیر خارج از امکان ہو جائے تو پھر زندگی جامد ہو جاتی ہے۔ اگر یورپ کی ناکامی کی وجہ ان ابدی اصولوں سے چشم پوشی ہے تو پچھلی صدیوں میں مسلمانوں کا جمود تغیر سے بے اعتنائی کا مرہون منت ہے لہٰذا اجتہاد سے اسلام کے اصول حرکت کا اظہار ہوتا ہے۔ مفکر اسلام علامہ اقبال نے ایک اور مقام پر اجتہاد کے اس حرکی نقطۂ نظر کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

> یہ خیال کہ اجتہاد کے دروازے بند ہو چکے ہیں بالکلیہ ایک افسانہ ہے۔ جو کچھ تو اسی لیے پیدا ہوا ہے کہ اسلامی افکار نے ایک معین صورت اختیار کر لی اور کچھ تو اس کا ذمہ دار وہ ذہنی تساہل ہے جو خاص طور پر روحانی انحطاط کے زمانے میں عظیم مفکرین کو بتوں کی حیثیت دیتا ہے۔ اسی لیے بعد کے فقہاء میں سے بعضوں نے اس کی تائید بھی کی ہو جب بھی موجودہ اسلام دیدہ و دانستہ اپنی آزادیٔ فکر کی قربانی کا پابند نہیں ہے۔
>
> (تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۸ء)

یہی وجہ ہے اسلام کی فکری اور سیاسی تاریخ میں جب کبھی جمود و تعطل یا انحراف و انتشار نے کوئی فتنہ برپا کرنا چاہا۔ مسلم مفکرین، مجاہدین نے ہر زمانے میں ان کے سدباب کے لیے سر دھڑ کی بازی لگادی ہے۔ اسلامی خلافت کو ملوکیت کے استبداد سے بچانے کے لیے حضرت حسن و حسین کی شہادت، حضرت عمر بن عبدالعزیز کی قربانی اور فتنۂ خلق قرآن کے لیے حضرت امام احمد بن حنبل کا سینہ سپر ہو جانا یا حضرت امام ابن تیمیہ کا اپنے عہد کے جمود و انحراف کے لیے سیف و قلم سے آمادۂ پیکار ہو جانا تاریخ کی کوئی ڈھکی چھپی حقیقت نہیں۔ اسی طرح تفلسف، مزدکیت، مسیحیت اور بودھی و ویدانتی تصورات و نظریات نے جب جب اسلامی صداقتوں کو مسخ کرنے کی کوشش کی انفرادی اور اجتماعی سطح سے ان چیلنجوں کا مقابلہ کیا گیا۔ چنانچہ اسلامی اقدار حیات نے تاریخ کے مختلف نشیب و فراز کے باوجود سولہویں صدی عیسوی تک انسانی تہذیب و تمدن کو عالمی پیمانے پر عدل و احسان کے ڈگر پر قائم رکھنے کی بہترین کوششیں کیں۔ ان تمام کوششوں کی بنیاد میں تحریکیت اور جہد مسلسل کی پوری داستان پوشیدہ ہے۔

مگر اہل اسلام کے قوائے فکر و عمل میں اضمحلال پیدا ہو گیا اور ان میں مندرجہ ذیل کمزوریاں پیدا ہو گئیں :

۱۔ بنیادی افکار و عقاید کے بارے میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے شکوک و شبہات۔

۲۔ تقلید جامد، مریضانہ مذہبیت اور گمراہ کن تصوف۔
۳۔ مذہب کو ایک پرائیوٹ معاملہ سمجھنا اور اسے انفرادی زندگی تک محدود رکھنا
۴۔ غیر تعلیم یافتہ مسلم عوام کی دین سے ناواقفیت جس کے نتیجہ میں وہ نام ونہاد مذہبی لوگوں کی تقلید کرتے ہیں۔ اور ملحدین کے ہتھکنڈوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ ان امراض اربعہ کی وجہ سے ملت اسلامیہ کا شیرازہ بتدریج بکھرنے لگا۔

اس کے برعکس مغربی دنیا بغداد و قرطبہ اور سمرقند و بخارا کے اسلامی علوم وفنون سے متاثر ہوکر نشاۃ ثانیہ سے ہمکنار ہوئی اور اس نے علم وادب فلسفہ وسیاست اور سائنس وٹکنولوجی کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ رابرٹ بریفائٹ کے لفظوں میں:

"یورپ کی نشاۃ ثانیہ پندرھویں صدی عیسوی ہی نہیں بلکہ عربوں کی احیائے ثقافت کے زیراثر وجود میں آئی۔ یورپ کی نئی پیدائش کا گہوارہ اٹلی نہیں ہسپانیہ تھا۔"

(تشکیل انسانیت۔ مترجمہ عبدالمجید ص ۲۹۲)

آبادی کے حیرت ناک اضافہ، خزانہ قدرت سے آخری ذرے اور آخری قطرے تک نچوڑ لینے کی مادہ پرستانہ سعی، صنعتی معاشرے کے جال اور کثرت پیداوار نے مغربی دنیا میں مختلف قسم کی تحریکوں کو مختلف سطح پر منظم کرنا شروع کیا۔ اسٹیم انجن، پریس اور جدید سیاسی واقتصادی تنظیموں کے ذریعہ مغرب پہلے تو خود نت نئے انقلابات سے دوچار ہوا۔ بعدہ امریکہ فرانس، انگلینڈ، یونان اٹلی، آئرلینڈ اور روس کے انقلابات نے خوست، جمہوریت، نازیت، فاشیت اور اشتراکیت کو جنم دیا اور پھر ان سب نے نئی قوتوں سے آراستہ ہوکر تقریباً پوری دنیا پر یلغار کر دیا۔ یہ یلغار سیاسی وجنگی اعتبار سے بھی تھی اور فکری وتہذیبی اعتبار سے بھی۔ اسلامی تمدنی مراکز اور مسلم علاقے چونکہ یورپ سے ملحق تھے بلکہ یوں کہیں کہ وہ مغرب سے اٹھے اس سیلاب کی راہ میں مزاحم تھے۔ یوں بھی اسلامی دنیا اور عیسائی دنیا کی باہمی آویزش صدیوں پرانی تھی اور تاریخ عالم کی ایک روایت بن گئی تھی اس لیے مسلمانوں کو اس سیلاب کی اولین اور سخت ترین ضربیں برداشت کرنی تھیں۔ یہ ایک عمل تھا جو اپنی پوری قوت سے کوئی ڈیڑھ دوسو برس تک جاری رہا۔ اور اب بھی جاری ہے۔

چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے برصغیر ہند میں اور یورپ کے کئی دوسرے عیسائی ملکوں نے اپنی منظم قوت کے ساتھ ترکی اور دیگر مسلم ممالک کے خلاف ہمہ گیر سازشوں اور جنگوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ مسلم ممالک دینی واخلاقی کمزوریوں کے نتیجہ میں علمی وسائنسی اعتبار سے بھی پسماندہ ہوکر رہ گئے

اسی لیے ان کی روایتی کاوشیں ناکام ہو کر رہ گئیں، ہندوستان کے جنوب میں ٹیپو سلطان اور شمال میں مغل حکمراں بیسویں صدی کے اواخر تک ناکام ہو گئے۔ بالآخر نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر پوری امت مسلم قومیت اور علاقائیت کے فساد میں مبتلا ہو کر پارہ پارہ ہو گئیں۔

مسلمانوں کی اس ناکامی اور عالم گیر ذلت ونکبت نے فکر اسلامی کو کچھ اور مہمیز کیا اور تقریباً پوری دنیا میں اسلامی اجتماعیت کی روح نے مختلف سطحوں پر امت کو مجتمع کر کے انھیں اقدام کرنے پر آمادہ کرنا شروع کیا۔ محمد بن عبدالوہابؒ، سید محمد ابن علی السنوسیؒ (پ الجزائر ۱۸۰۷) شاہ ولی اللہؒ، سید احمد شہیدؒ، شہزادہ سعید حلیم پاشاؒ، بدیع الزماں نورسیؒ، سید جمال الدین افغانیؒ، سید رشید رضاؒ، شیخ حسن البناؒ، شیخ الہند محمود حسنؒ ڈاکٹر اقبالؒ، محمد علی جوہرؒ مولانا محمد الیاسؒ وغیرہ نے عالمی پیمانے پر مختلف قسم کی تحریکات کا آغاز کر دیا۔ ان حضرات کی کاوشوں کے نتیجہ میں دو حقائق بالکل نکھر کر سامنے آئے

اولاً یہ کہ ملت اسلامیہ کو بحیثیت مجموعی اسباب زوال پر غور و فکر اور ان کے سد باب پر آمادہ کیا جائے۔ ثانیاً مغربی فکر کی خام کاریوں پر دینی واخلاقی نقطۂ نظر سے ضرب کلیمی کی جائے۔ ان دونوں جہتوں سے ہر جگہ کم و بیش اچھا خاصا کام بھی شروع ہو گیا۔ مگر مغرب کے ہمہ جہت قسم کے مادی وسائنسی انقلاب نے جس سرعت کے ساتھ پہلے خود کو جس طرح تبدیل کیا مسلم دنیا کے اکابر کی ایک حد تک یک رخی کوششوں نے مسلم ملکوں کو کہیں از خود تبدیل نہیں کیا۔ ان کی روایت پرستی۔ مریضانہ تصوف، علوم جدیدہ سے چشم پوشی اور باہمی انتشار نے مغرب کو ان کے استحصال پر آمادہ کر دیا۔ اور گذشتہ ایک صدی کے اندر اندر تقریباً پوری مسلم دنیا مغرب کی نوآبادیات میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔ سیاسی غلبہ کے ساتھ ہی ساتھ مغرب نے مشرق کو ذہنی غلامی میں بھی بتدریج جکڑنا شروع کر دیا۔ منصوبہ بند انداز میں مسلم ممالک کی ایک پوری نسل کو نہ صرف مغربی علوم وفنون بلکہ مغربی تہذیب وسیاست سے آراستہ کر کے ان کے ملکوں میں برآمد کر دیا۔ یہی لوگ سیادت وقیادت کے مقام پر ہر جگہ فائز تھے۔ اس لیے ان کے ذریعہ مسلم ممالک میں آزادی کی جو دوسری لہر شروع ہوئی اس کے نتیجہ میں حکمرانی کرنے والے بیرونی ہاتھ تو ضرور بدل گئے مگر اس کاروبار سیاست اور نام نہاد آزادی کا سارا منافع دوبارہ مغربی قوتوں ہی کے خزانے میں جمع ہو گیا۔ اور ملت اسلامیہ کی بدنصیبی عالمی پیمانے پر جیسی کی تیسی رہ گئی۔ ترکی شاعر محمد عاکف کے لفظوں میں:-

"لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تم نے مشرق کی اتنے عرصہ تک سیاحت کی آخر تم نے کیا دیکھا؟"

میں کیا بتاؤں کیا دیکھا۔ میں نے اس سرے سے اس سرے تک ویران بستیاں بے سری قومیں، ٹوٹے پھوٹے پل۔ بند نہریں، سنسان سڑکیں دیکھیں میں نے جھریاں پڑے چہرے۔ جھکی ہوئی کمریں، خالی دماغ۔ بے حس دل الٹی عقلیں دیکھیں۔

میں نے ظلم، غلامی، خستہ حالی، ریاکاری، قابل نفرت برائیاں طرح طرح کی بیماریاں جلے ہوئے جنگل۔ ٹھنڈے چولہے۔ بنجر کھیت، میلی عورتیں، ننگے ہاتھ پاؤں دیکھے۔ میں نے جماعت کے امام دیکھے۔ بھائی کو بھائی کا دشمن دیکھا۔ دن دیکھا جن کا کوئی مقصد نہیں، راتیں دیکھیں جن کی کوئی صبح نہیں۔"

اس عالمی تناظر میں ملت اسلامیہ ہند کی حالت دوسری جگہوں سے مختلف نہ تھی۔ کیونکہ یہاں بھی مغربی دانشوری اور احیاپرستی کے زیر اثر، آزادی، وطنیت، قومیت اور لادینی جمہوریت کی بانسری اوائل بیسویں صدی ہی سے بجنا شروع ہوگئی تھی۔ یہاں کے دانشور پیدا تو ہندوستان میں ضرور ہوئے تھے مگر ان کا دماغ انگلستان میں بنا تھا۔ اور اس پر روس کی ایک نئی دانش تازہ تازہ چڑھی تھی۔

مغربی احیاپرستی کے زیر اثر یہاں جب مشرقی احیاپرستی کی لہر نے زور پکڑا اس کے نتیجہ میں ملک کے ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے درمیان نت نئی مذہبی اور سیاسی تحریکوں کا زور شروع ہوا مثلاً برہمو سماج، آریہ سماج، رام کرشن مشن، تھیوسوفیکل سوسائٹی، شدھی سنگٹھن اور انڈین نیشنل کانگریس اور تحریک ترک موالات وغیرہ نے ہندوؤں کے درمیان زور پکڑا تو علی گڑھ تحریک، ندوالفنی تحریک، مسلم لیگ، خلافت تحریک، جمعیۃ العلماء امارت شرعیہ، خاکسار تحریک اور تحریک پاکستان اسی طرح ادب میں ترقی پسند اور روحانی تحریک نے مسلمانوں کو اپنی طرف کھینچا۔ مگر ہندوستان میں مسلمان چونکہ اقلیت میں تھے اس لیے وہ یہاں عذاب دوگونہ میں مبتلا تھے۔ اور معاملہ تاڑ سے گر کر کھجور میں اٹکنے کا تھا۔ جدوجہد آزادی کے دوران مسلم قیادت کو یہ خوف کھائے جاتا تھا کہ حصول آزادی کے بعد اکثریت ہمیں اپنا محکوم بنالے گی کیونکہ دنیا کے دوسرے جمہوری ملکوں کی جو تازہ روایت سامنے آئی تھی وہ بلا استثنیٰ مندرجہ ذیل تین حقائق پر لازماً مشتمل تھی۔

۱۔ مذہبی رواداری کا نام نہاد اعلان و اظہار

۲۔ ایک خاص عقیدہ و مسلک کی طرف نظر عنایت اور

۳۔ دوسرے تمام عقاید و مسلک کے ساتھ سنگدلانہ سرد مہری بلکہ پامالی۔

چنانچہ ہندوستانی سیاست کے اکابر علی الاعلان یہ کہنے لگے تھے کہ

"جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہوگیا ہے۔" (میری کہانی جلد دو پنڈت جواہر لال نہرو صفحہ ۱۹۱)

"جب ہندو مسلم تہذیبیں مٹ جائیں گی تب ہی ہندوستانی تہذیب زندہ رہ سکے گی۔"

(اقتباس تقریر سمپورنانند وزیر تعلیم یوپی ٹریبون ۱۵ اپریل ۱۹۴۵ء)

وار دھا و دھیا مندر اسکیم، ہندوستانی زبان، ہریجنوں کے فروغ اور ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے جو نتائج سامنے آئے اس نے برصغیر کے مسلمانوں کو متوحش کردیا۔ متحدہ قومیت کے بلند و بانگ دعووں کے باوجود ادھر فرقہ وارانہ فسادات اور شدھی نے بھی شدت اختیار کرنی شروع کردی تھی چنانچہ تحریک خلافت کی بالکل وقتی بہار جیسے ہی ختم ہوئی ۱۹۲۱ء سے ہندو مسلم تعصبات کی خلیج بڑھنے لگی، ادھر مسلم قیادت کی جذباتیت، نفاق اور ناعاقبت اندیشی کا یہ حال تھا کہ بلا سوچے سمجھے اور منظم منصوبہ بندی کے انگریزی مظالم کے خلاف افغانستان کی طرف ہجرت کی تحریک شروع کرادی گئی ملک کے علمائے کبار ملک کی آزادی اور اسلام کی فتح مندی کو لازم و ملزوم سمجھنے لگ گئے تھے۔ بعض علماء کی اس تشویشناک بے رصیرتی پر اقبال کو بھی ضرب کلیمی کرنی پڑی۔

؎ ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اور

؏ عجم ہنوز نہ داند رموز دیں ورنہ

؎ بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

رضائے الٰہی کے لیے قرآن و سنت کی روشنی میں اقامت دین کا بنیادی فریضہ بڑے بڑوں کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ کیونکہ ہنگامی سیاست کے سیلاب میں بہہ کر حصول آزادی اور تقسیم ملک ہی کو دکھوں کا علاج سمجھا جانے لگا تھا۔

فکر و سیاست کے اس عالمی اور ملکی تناظر میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شخصیت سامنے آئی ہے (پیدائش ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء) موصوف نے اوائل بیسویں صدی کی سیاست، صحافت اور ملک کے بحران کا بچشم خود مطالعہ کیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ

" حالات بہت نازک ہو چکے ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ جو سیلاب آنے والا ہے

وہ ۱۸۵۷ء کے انگریزی اقتدار کے سیلاب سے بھی کہیں زیادہ مہلک اور تباہ کن ہوگا۔"

اب وقت نہیں ضائع کرنے کا موقع نہیں رہا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میری آواز میں خلوص ہوا تو میرا جذبہ ناکام نہیں جائے گا۔"

اور حیدرآباد سے ترجمان القرآن کے ذریعہ ۱۹۳۳ء سے قوم کے اندر تعمیر افکار اور اصلاح کردار کا کام شروع کر دیا۔ بالآخر طویل غور و فکر اور ملک گیر پیمانے پر وقت کے اکابر نے تبادلہ خیال اور مسلسل تجربات کے بعد ۲۵، ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو مولانا کی تحریک پر جماعت اسلامی کی تشکیل عمل میں آئی۔

اس دوران انھیں نہایت جاں گسل اور صبر آزما حالات سے بھی دوچار ہونا پڑا لیکن وہ پوری جرأت اور صبر و توکل کے ساتھ اپنے مشن کو لے کر آگے بڑھتے رہے۔

سب سے پہلے ایک طویل عرصے تک انھوں نے بالکل نئے پیدا کردہ نظام فکر اور آں حاضر موجود پر سخت ترین تنقیدیں کر کے اس کا کھوکھلا پن نمایاں کیا۔ جو لوگ اس نظام فکر پر مطمئن تھے انھیں غیر مطمئن کیا۔ جو غیر مطمئن تھے ان کے سامنے مومن کی زندگی کا ایک مثبت لائحہ عمل رکھ کر انھیں اصلاح احوال اور تبدیلی حالات پر آمادہ و تیار کیا، اور جو آمادہ ہو گئے انھیں ایک نظم و ضبط کے تحت سلیقے اور تندہی سے دینی بنیادوں پر منظم کرتے رہے اور اجتماعی نتائج پیدا کرنے کا ڈھنگ سکھایا۔ ان کے سامنے گویا ایک ہی پروگرام تھا کہ "قرآن و سنت کو ہاتھ میں لو۔ اپنی زندگی پر آزماؤ اور ساری دنیا پر چھا جاؤ۔"

یہ وہ وقت ہوگا

جب تم ابتلاء و آزمائش کے دور میں داخل ہوگے۔ تمہاری گرفتاریاں ہوں گی، تبادلے کئے جائیں گے، دور دراز علاقوں میں پھینک دیئے جاؤ گے، گھروں کی تلاشیاں لی جائیں گی، دار و رسن کی دھمکیاں دی جائیں گی، اور ممکن ہے کہ ابتلا و آزمائش کی یہ مدت کافی دراز ہو۔ دعوت حق کے علمبرداروں کی راہ میں اس منزل کا آنا ناگزیر ہے۔ اس سے ہو کر ہمیشہ انھیں گذرنا پڑا ہے۔ مجاہدین اور انبیائے سابقین کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ بالآخر مجاہدین کی مدد فرمائے گا۔"

(حسن البنا شہیدؒ)

عقلی فیصلوں کی مخالفت کے اسباب

محمد مسعود عالم قاسمی

ضابطہ کی بات تو یہ ہے کہ انسان کوئی بھی کام عقل کے خلاف نہ کرے اور کوئی بھی قدم عقل کی رہنمائی کے بغیر نہ اٹھائے۔ عقل جس چیز کو درست کہے وہ اسے کرگزرے اور جس چیز کے غلط ہونے کا فیصلہ کرے وہ اس سے باز رہے۔ مگر واقعات اور تجربات یہ بتاتے ہیں کہ انسان ہمیشہ عقل کے ضابطوں کی پابندی نہیں کرتا اگر عقل کسی بات پر مطمئن ہو جائے یا کسی چیز کے خلاف فیصلہ کرے تو ضروری نہیں ہے کہ وہ اسے عملاً قبول بھی کر لے اور فیصلہ کی خلاف ورزی نہ کرے، کسی چیز کے عقل کے مطابق ہونے یا غیر عقلی قرار دیے جانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان ہر حالت میں اسے اختیار بھی کرے گا اور اس کے خلاف کچھ نہ کرے گا۔ اس کو یوں سمجھا جائے کہ ایک شخص کسی بلند عمارت کی چھت سے زمین پر چھلانگ لگاتا ہے تو ایسا نہیں ہے کہ وہ اس کے انجام سے ناواقف ہوتا ہے اور عقل اس معاملہ میں اس کی رہنمائی نہیں کرتی، بلکہ وہ قطعی طور پر واقف ہوتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں وہ اپنی جان کھو دے گا یا کم از کم اس کے ہاتھ پاؤں درست نہیں رہیں گے مگر عقل کے اس فیصلہ کے خلاف وہ یہ حرکت کرتا ہے۔ خودکشی کی جتنی واردات ہوتی ہیں وہ عقل کے خلاف ہوتی ہیں اور اسے معمولی عقل کا انسان بخوبی سمجھتا ہے۔ اسی طرح دنیا میں بہت سے ایسے کام ہوتے ہیں جن کی عقل تائید نہیں کرتی مگر عقل و فہم رکھنے والا انسان ان کو کرنے سے باز نہیں رہتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دوسرے عوامل بھی ہیں جو عقل پر غالب آجاتے ہیں اور انسان کو اپنے ہی عقلی فیصلوں کا پابند رہنے نہیں دیتے یا خلاف عقل اقدامات کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں سوال یہ ہے کہ وہ عوامل کیا ہیں جن کی وجہ سے انسان یہ حرکت کرتا ہے۔ انسان کے جذبات حالات۔ اور اس کی دلچسپیوں کو پیش نظر رکھا جائے تو حسب ذیل پانچ چیزیں عقل کے حجابات کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔

(۱) نفس (۲) مفاد (۳) معاشرہ (۴) تقلید جامد (۵) توہم

یہ پانچ چیزیں گویا آہنی قید خانے ہیں جب انسان ان میں سے کسی بھی قید خانہ میں بند ہوجاتا ہے تو عقل اسے آزادی اور نجات کا راستہ دکھلانے میں ناکام رہتی ہے اور انسان عقل رکھتے ہوئے بھی بے عقل جانور کی سی زندگی گذارنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

پہلی چیز نفس پرستی ہے جب انسان نفس پرستی میں مبتلا ہوتا ہے، تو عقل کی آنکھ بے نور ہو جاتی ہے۔ آدمی کے سوچنے سمجھنے اور کرنے کا رخ بدل جاتا ہے نفس کا جو حکم ہوتا ہے اس پر وہ آنکھ بند کرکے عمل کرتا ہے اور عقل کا جو فیصلہ ہوتا ہے اس کی ذرا بھی پروا نہیں کرتا، چونکہ انسان کی بے شمار خواہشات اور تمنائیں ہیں اور نفس ان خواہشات کی آماجگاہ ہے، اس لیے اگر انسان اپنے نفس کو عقل کی لگام نہ دے تو نفس انسان کو بے لگام بنا دیتا ہے۔ اور ہر خواہش کی تکمیل پر دوسری خواہش کی فہرست اس کے سامنے لاکر رکھ دیتا ہے۔ اور اسی لغو عمل میں اس کی زندگی تمام ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم اپنے مخصوص اسلوب میں اسی بات کو یوں کہتا ہے۔

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهٗ هَوَاهُ، أَفَأَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا (الفرقان: ۴۳)

کبھی تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہو؟ کیا تم ایسے شخص کو راہ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہو؟

پھر یہ نفس انسان کو ہمیشہ سفلی اور گھٹیا چیزوں کی طرف ہانکتا ہے، روحانی اور اخلاقی پستی کی طرف لے جاتا ہے۔ رفعت اور بلندی کے اقدار کو نگاہوں سے اوجھل کر دیتا ہے اسی لیے حضرت یوسفؑ نے فرمایا:

وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِيْ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ (یوسف: ۵۳)

میں اپنے نفس کی برات نہیں کرتا نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے الا یہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو۔

برائیں بنا انسان کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس کا نفس اس کے قابو میں ہے یا وہ خود نفس کے قابو میں ہے، جو نفس کو قابو میں نہیں رکھتا وہ عقل سے دشمنی کرتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی حکیمانہ انداز میں اس صورت حال کی ترجمانی فرمائی ہے۔

الكيس من دان نفسه وعمل لما بعد الموت والعاجز من اتبع نفسه هواه وتمنى على الله الاماني (مسلم)

عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھتا ہے اور آخرت کے لیے عمل کرتا ہے اور بے وقوف وہ ہے جو اپنے نفس کی باگ خواہش کے حوالہ کر دیتا ہے اور اللہ پر تمنائیں باندھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جنت بھی اپنی عقل مند انسانوں کے لیے بنائی ہے جو اپنے نفس کے غلام نہیں ہیں قرآن کہتا ہے :

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ	اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا
وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ	اور نفس کو بُری خواہشات سے باز رکھا جنت اس کا
الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (النزعت: ۴۰-۴۱)	ٹھکانا ہوگی۔

نفس پرستی کا دوسرا نام خواہشات کی پیروی ہے۔ خواہش اچھی بھی ہوتی ہے اور بری بھی یہ فیصلہ انسان کی عقل وضمیر پر منحصر ہے کہ کونسی خواہش قابلِ عمل ہے اور کونسی ناقابلِ عمل جس شخص کی باگ نفس کے ہاتھ میں ہو وہ اس بصیرت اور امتیاز سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور بغیر تمیز کے خواہش کے پیچھے سرپٹ دوڑنے لگتا ہے۔ اللہ نے اس شخص کو ان لوگوں سے بالکل الگ کر دیا ہے جو عقل و برہان کی روشنی میں سفرِ حیات طے کرتے ہیں۔ یعنی جن کی عقل آزاد اور بصیرت زندہ ہے۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ	جو اپنے رب کی طرف سے ایک صاف صریح ہدایت
رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ	پر ہو وہ ان لوگوں کی طرح ہو جائے جن کے لیے ان کا برا عمل
اتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ (محمد: ۱۴)	خوش نما بنا دیا گیا ہے اور وہ اپنی خواہشات کے پیرو بن گئے'
	بتا ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟

انسان کو عقلی فیصلوں کی پابندی سے روکنے والی دوسری چیز مفاد پرستی ہے۔ مفاد پرست انسان عقل کی تادیب اور اس کے تقاضوں کا پابند نہیں ہوتا مفاد پرستی اس کو بہائم صفت بنا دیتی ہے۔ اور وہ نور بصیرت سے عاری ہو جاتا ہے۔ کوئی بات اپنی جگہ خواہ کتنی ہی معقول کیوں نہ ہو مفاد پرست انسان کو اسی وقت اپیل کر سکتی ہے جبکہ اس کے مفادات ٹکراتی نہ ہو اور جیسے ہی وہ انسان اور اس کے مفاد کے درمیان حائل ہوئی ناقابل برداشت بن جاتی ہے اور یہ معقول بات مبغوض بن جاتی ہے۔

یہودیوں کا ایک گروہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپؐ نے توریت کے ممتاز عالم اور یہودیوں کے بڑ دل عزیز رہنما عبداللہ بن سلامؓ کے بارے میں پوچھا کہ وہ کیسے ہیں؟ یہودیوں کے نمائندہ گروہ نے متفقہ طور پر کہا" خیرنا ابن خیرنا" وہ ہم سب سے بہتر ہیں اور بہتر باپ کے بیٹے ہیں۔ یہ گویا عبداللہ بن سلام کے بارے میں آخری بات تھی جو یہود کہہ سکتے تھے۔ اور یہی سوچ کر انھوں نے کہا تھی کہ وہ تو ہمارے سردار ہیں اور ہم اپنے سردار کی تعریف و توصیف کر رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ تو ایمان لے آئے، تب ان لوگوں نے برملا کہا" شرنا ابن شرنا" وہ ہم میں بُرے آدمی

ہیں اور برے باپ کے بیٹے ہیں۔ ابھی ان لوگوں نے عبداللہ بن سلامؓ کو بہترین انسان ہونے کی سند دی تھی مگر دوسرے لمحہ میں انھوں نے اپنے آپ کو جھٹلا کر صحابی مذکور کو بدترین انسان ثابت کرنا شروع کردیا، محض اس بنا پر کہ عبداللہ بن سلامؓ کے ایمان لے آنے سے یہودیوں کی مذہبی ٹھیکہ داری میں رخنہ پڑ گیا تھا۔ ان کے حلقہ کا یہ کارواں دشمنوں سے جا ملا تھا، اور یہ ان کے مفاد کے خلاف تھا کیونکہ وہ اب اپنی دنیا پرستی پر مذہب کا غلاف ڈالنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ عقل و دانش کی بات وہ تھی جو انھوں نے بطور اظہار واقعہ پہلے مرحلہ میں کہی اور مفاد پرستی کا تقاضا وہ تھا جس کا مظاہرہ انھوں نے دوسرے لمحہ میں کیا۔

عبداللہ ترجمان ایک عیسائی تھا اس نے توریت اور انجیل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پیشین گوئیاں دیکھیں تو اپنے استاذ سے جو اس زمانہ کا بہت بڑا پادری تھا اس حقیقت سے مزید واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ پادری نے کہا بلاشبہ یہ پیشین گوئیاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ہیں لیکن میں دنیاوی منافع کی بنا پر ان کو ظاہر نہیں کر سکتا، تم کو خدا توفیق دے تو تم مسلمان ہو جاؤ۔ چنانچہ عبداللہ مسلمان ہو گیا، مسلمان ہونے کے بعد انھوں نے "تحفۃ الاریب" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں یہ سارے حالات لکھے۔ مذکورہ پادری پر روز روشن کی طرح عیاں تھا کہ محمدؐ نبی برحق ہیں، اور حضرت عیسیٰ پر ایمان لانے کا تقاضا یہ ہے کہ نبی آخر الزماں کی پیروی کی جائے، مگر مفاد اور دنیا کی محبت اس کے لیے زنجیر پا بن گئی، اس نے اپنے شاگرد کو تو حق پر چلنے کا مشورہ دیا مگر خود اس سے محروم رہ گیا۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفا کی پہاڑی پر چڑھے اور مکہ کے لوگوں کو "انا النذیر العریان" کہکر اپنے پاس بلایا۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے فرمایا کہ میں پہاڑ کی بلندی پر ہوں جہاں سے میں اس طرف بھی دیکھتا ہوں جہاں تم ہو اور دوسری جانب بھی دیکھتا جو تمہاری نظروں سے اوجھل ہے، اگر میں یہ کہوں کہ پہاڑی کے پیچھے ایک لشکر ہے جو تم پر حملہ آور ہوا چاہتا ہے تو کیا تم میری بات مان لوگے؟ حاضرین نے بیک آواز کہا "ماجربنا علیک الاصدقا" نہ ماننے کی کیا وجہ ہے، ہم نے کبھی سچ کے علاوہ آپ سے کچھ نہیں سنا، آپ تو امین و صادق ہیں۔ تب آنحضورؐ نے فرمایا سنو! میں تم کو اللہ کی پرستش کی دعوت دیتا ہوں اور قیامت کی تباہی سے ڈراتا ہوں جو عنقریب آنے والی ہے، یعنی میں نبوت کی بلندی پر کھڑا ہو کر تمہاری زندگی کو بھی دیکھتا ہوں اور قیامت کو بھی۔ تمہارے اعمال پر بھی میری نظر ہے اور ان کے نتائج پر بھی تو تم اپنے انجام

کار سے خبردار ہو جاؤ۔

یہ ایک معقول بات تھی جس کی آنجنابؐ نے دعوت دی، اس میں کسی قسم کے وقتی جوش اور جدت ترازی کا جذبہ شامل نہ تھا، مگر امین و صادق کا خطاب دینے والوں نے فوراً کہا تیرا ناس ہو کیا تم نے ہمیں اسی لیے بلایا تھا؟ گویا وہ یہ کہہ رہے تھے کہ تم نے ہمیں دھوکہ دیا اور بے وقوف بنایا۔ یہ تضاد مشرکین کے اندر یک وقت کیسے رونما ہوا صرف اس وجہ سے کہ جب تک بات ان کے حق میں تھی اور ان کے مفاد کے مطابق تھی تب وہ سب کچھ ماننے کے لیے تیار تھے مگر جب انھوں نے دیکھا یہ چیز ہمارے مفاد کے خلاف جا رہی ہے تو فوراً برا بھلا بکنا شروع کر دیا، اور اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ وہ ابھی ابھی اُن کو امین و صادق کہہ چکے ہیں ان کو نازیبا کلمات سے نوازنے لگے۔ مفاد پرستی عقلی رویوں سے کس قدر مزاحم ہوتی ہے اس کا مشاہدہ روزمرہ کی زندگی میں باسانی کیا جا سکتا ہے۔

انسان کو خلاف عقل حرکتوں پر اکسانے والا تیسرا عامل معاشرہ ہے، انسان چونکہ سماجی جانور ہے اس لیے اپنے بہت سے اعمال، رویوں اور افکار کی بنیاد اس معاشرہ کے رجحانات پر رکھتا ہے جس میں وہ زندگی گذارتا ہے انسان کی ضروریات معاشرہ کے افراد سے باہم وابستہ ہوتی ہیں اس لیے وہ ضرورتوں کی تکمیل کے ساتھ اپنے خیالات کے لیے بھی سماج کی طرف دیکھنے لگتا ہے، سماج میں جہاں اچھی اور مفید چیزیں ہوتی ہیں جن کو اختیار کئے بغیر انسان مکمل زندگی نہیں گذار سکتا وہاں کچھ خرابیاں اور برائیاں بھی ہوتی ہیں جو انسان کی دین و دنیا کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ مگر عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ عقل کی میزان میں نفع و نقصان کو تولے بغیر انسان سماج کے ضابطوں اور رویوں کو اپنا لیتا ہے، وہ کوئی غلاف حرکت کرے تو اس کے لیے بھی سماج کو بطور دلیل پیش کر دیتا ہے، سماجی رویوں کی مخالفت وہ اس سبب نہیں کر پاتا کہ سماج کی نگاہوں میں وہ اجنبی بن جائے گا، لوگوں کے طعن و تشنیع اور مذاق کا نشانہ بن جائے گا اور اپنے ہی ماحول میں وہ تنکو ہو کر رہ جائے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب اس بات پر مطمئن ہو چکے تھے کہ محمدؐ جو پیغام لے کر آئے ہیں وہ حق ہے، اور عقل کا تقاضا ہے کہ اسے مان لیا جائے، اگرچہ اس پیغام کے سلسلہ میں بعض مواقع پر ابو طالب نے اپنے مقدس بھتیجے کی مدد بھی کی مگر خود اس کو اختیار نہ کر سکے اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ کفار قریش کی نگاہوں اور ملامت کے تیر کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لوگ کہتے کہ ابو طالب نے اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ دیا ہے۔ موجودہ معاشرہ میں نہ جانے ایسی کتنی برائیاں ہیں جو ہر عقل مند اور بیدار ضمیر انسان کو کچھ کے

لگاتی ہیں مگر ان میں سے اکثر حضرات کسی ردعمل کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہیں کرپاتے۔ صرف اس وجہ سے کہ سماج کے خود ساختہ ضابطوں کی پیروی میں عافیت محسوس کرتے ہیں اور ان کی خلاف ورزی میں اجنبیت کا خوف پیدا ہونے لگتا ہے۔ اس کو بہت چھوٹی سطح پر اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ شادی بیاہ کی رسموں میں پیسوں کا بے جا استعمال، نام ونمود اور شہرت کا خیال، دوسروں کی بے نور سفال پوش جھونپڑیوں سے نظر بچا کر اپنے کوٹھوں کو نخلستان جنت بناڈالنے کا خبط کس عقل مند انسان کو برا نہیں لگتا اور کون اس کی تباہ کاری سے واقف نہیں، مگر جب ہمارا اپنا معاملہ آتا ہے تو ہمارے سامنے بھی سماج کے دیوقامت رسوم کھڑے ہوجاتے ہیں اور ان کے سامنے عقل و دانش اور بیداری کے تقاضے پژمردہ اور افسردہ ہو جاتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ سماجی رویوں میں قوت نافذہ یا ایسی کوئی طاقت نہیں ہوتی جو خود کو منوانے پر انسان کو مجبور کرے مگر اس کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ ان کی خلاف ورزی آسان بھی نہیں ہوتی۔ اگر فرد کو معاشرہ میں جینا ہے، تو اس کو معاشرہ کی سطح اور اس کا تیور دیکھ کر زندگی گزارنی ہے ورنہ معاشرہ اسے سکڑ جانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ تاہم عقل و دانش کا تقاضا ہے کہ سماج کو اپنے اصولوں کی بنیاد پر قبول کیا جائے نہ کہ اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دیا جائے۔ دانائی کی یہ بات قرآن میں اس طرح کہی گئی ہے:

اَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللّٰهُ اَحَقُّ　　کیا تم لوگوں سے ڈرتے ہو اللہ اس کا زیادہ حق
اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ　　دار ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔ اگر تم مومن ہو۔

(التوبہ: ۱۳)

مسلمانوں کے لیے اس سے بڑی بات کیا ہوسکتی ہے کہ جس چیز پر اس کی عقل ایمان لاچکی ہے وہ اس کے لیے اجنبی بن جاتا ہے، وہ اپنے عقل کا فیصلہ سماج سے منواتا ہے نہ کہ سماج کے لیے اپنا فیصلہ بدل دیتا ہے؟

عقل انسانی کو غیر موثر بنا دینے والا دوسرا عامل تقلید اور عصبیت ہے۔ نفس تقلید ہر حال میں بری نہیں ہوتی، کیونکہ سماجی زندگی میں جہاں عقل و دانش کا مرتبہ ہے وہاں بڑوں کی پیروی کو بھی اہمیت حاصل ہے، البتہ اس تقلید میں قباحت اس وقت پیدا ہو جاتی ہے جب وہ نگاہ و بصیرت اور دلوں سے جذبہ حریت کو چھین لیتی ہے۔ آدمی آنکھ بند کرکے اپنے پرکھوں اور پیشواؤں کی پیروی کرنے لگتا ہے وہ اگر کسی چیز کو درست کہیں تو یہ بھی بغیر سوچے سمجھے اسے درست کہنے لگتا ہے اور وہ کسی چیز کو اگر غلط ٹھہرائیں تو یہ بھی آنکھ بند کرکے اس کے غلط ہونے کا اعلان کرنے لگتا ہے، یہی تقلید جامد ہے، یہی اندھی عقیدت ہے اور یہی عصبیت ہے۔ جو عقل انسانی

کی دشمن ہے۔ ہونا یہ چاہئے کہ عقل کی روشنی میں انسان اپنے بڑوں اور پرکھوں کی بات کو دیکھے اور اس کے حق و ناحق پر اطمینان کرنے کے بعد اس پر عمل کرے مگر ہوتا یہ ہے کہ انسان عقل کی ایک نہیں سنتا اور اپنے پرکھوں کی سب کچھ سنتا ہے۔ قرآن ایسے ہی اندھے مقلدوں کی بابت کہتا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (البقرہ: ۱۷۰)

ان سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کئے ہیں ان کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقہ کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا ہو اور راہ راست نہ پائی ہو تو کیا پھر بھی یہ انہی کی پیروی کیے چلے جائیں گے؟

یعنی یہ لوگ اپنے پرکھوں کی پیروی بے عقلی کی باتوں میں بھی کرتے ہیں اور جب ان کو عقل و دانش کی راہ دکھائی جاتی ہے تو وہ اس کی مخالفت پر اتر آتے ہیں۔ اندھے مقلدوں کی ایک نفسیاتی کمزوری یہ ہوتی ہے کہ جب ان کے سامنے عقل کے دلائل پیش کے جائیں تو وہ جذبات کا سہارا لیتے ہیں اور ہوتا یہ ہے کہ انسان عقل کے مقابلہ میں جذبات کی زبان نسبتاً زیادہ سمجھتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جب فرعون کو دلائل اور براہین کے ساتھ حق کی دعوت دی تو اس نے محسوس کر لیا کہ وہ اس علمی استدلال کا مقابلہ نہ کر سکے گا اور موسیٰؑ سے بحث کرنے کے نتیجہ میں حاضرین کا اعتماد کھو بیٹھے گا، اس لیے اس نے موسیٰؑ کو ایک جذباتی مسئلہ میں الجھا کر شکست دینے کی کوشش کی۔ اس نے کہا اگر تم واقعی اپنے دعوی میں سچے ہو تو یہ بتاؤ کہ ہمارے اگلے جو اسی راہ پر چلتے ہوئے مر گئے ان کا کیا حشر ہوا۔ منشا یہ تھا کہ جس طرح موسیٰؑ ہماری گمراہی کو باعث ہلاکت قرار دیتے ہیں اسی طرح ان پرکھوں کو بھی قرار دیں گے۔ اور جب وہ اس بات کا اظہار کریں گے تو حاضرین کے جذبات بھڑک اٹھیں گے اور موسیٰؑ کے درپے آزار ہو جائیں گے۔ مگر موسیٰؑ نے اس سوال کا جواب نفی یا اثبات میں دینے کے بجائے کہا کہ "علمها عند ربي في كتاب" اس کا علم تو ہمارے رب کے پاس اس کی کتاب میں ہے"۔ یہ راہ فرار نہ تھی بلکہ اس استدلال کا ایک پہلو تھا جو موسیٰ نے فرعون کے لیے اختیار کیا تھا، تاکہ فرعون کے لیے کوئی ایسا موقع نہ چھوڑا جائے جو اس پورے استدلال پر پانی پھیر دے، اور نتیجہ میں دین کی دعوت انجام حجت کے بجائے ایک غیر ضروری چھڑپ پر ختم ہو جائے۔

اس سلسلہ کی پانچویں چیز توہم یعنی وہم و گمان کی پیروی ہے جب انسان وہم کا شکار رہتا ہے تو اس کی عقل بے کار ہو جاتی ہے اور اس کے پاس اس سکہ کی طرح رہتی ہے جو کسی بخیل کی جیب میں

موجود ہو مگر اس کی پریشانیاں دور کرنے سے عاجز ہو. امام غزالی نے توہم کو اس طرح سمجھایا ہے" سانپ کا ڈسا ہوا انسان جب سانپ کے رنگ کی رسی کو دیکھتا ہے تو اس کو سانپ سمجھ کر ڈرنے لگتا ہے، جبکہ درحقیقت وہ سانپ نہیں، رسی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے سانپ کو رسی کے رنگ وروپ میں دیکھا تھا اور اب وہ رسی کو دیکھتا ہے تو سانپ سمجھ کر ڈرنے لگتا ہے حالانکہ عقل اس کی تکذیب کرتی ہے مگر قوت واہمہ کے سبب وہ عقل کی نہیں سنتا"

گمان اگرچہ درست بھی ہوسکتا ہے مگر چونکہ اس کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی اس لیے اکثر حالات میں وہ غلط ہوتا ہے۔ اسی لیے گمان کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرنا عقل کے فیصلوں کی تکذیب کرنا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث (بخاری)   گمان سے بچو کیونکہ گمان سب سے جھوٹی بات ہے۔

توہم گمان کی انتہائی شکل ہوتی ہے جب انسان اپنے اندر گماں کی پرورش کرتا ہے اور پھر اس کو رہنما بنا کر مسائل کے سلسلہ میں سوچنے لگتا ہے اس وقت وہ گویا گمان کی پرستش شروع کر دیتا ہے. یہی وہ چیز ہے جس کی طرف قرآن میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے:

وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (یونس: ۳۶)   ان میں سے اکثر لوگ محض گمان کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ گمان حق کی ضرورت کو کچھ بھی پوری نہیں کرتا۔

تقویٰ اور احسان

احسان دراصل اللہ اور اس کے رسول اور دین کے ساتھ اس قلبی لگاؤ، اس گہری محبت اور اس پر جی وفاداری اور فدویت و جاں نثاری کا نام ہے جو مسلمان کو فنا فی الاسلام کردے. تقویٰ کا اساسی تصور خدا کا خوف ہے جو انسان کو اس کی ناراضی سے بچنے پر آمادہ کرے اور احسان کا اساسی تصور خدا کی محبت ہے جو آدمی کو اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ابھارے۔

(تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں ص۴۲)

تراجم واقتباسات



انسانیت کے خلاف یہودیوں کی سازش

پروٹوکولز (سیاسی دستاویزات) کا تعارف

(ترجمہ) جناب احمد علی صاحب

"ہم یہود دنیا کے سردار ہیں اور اس کے مفسد، فتنہ پرداز اور جلاد بھی" یہودی رہنما ڈاکٹر اوسکار لیفی کا یہ اعلان عالم انسانیت کے خلاف یہودیوں کی منظم سازش کا عنوان ہے، اس سازش کا منصوبہ یہودی لیڈروں نے تیس کانفرنسوں کے انعقاد کے نتیجہ میں انتہائی راز دارانہ طریقہ پر تیار کیا تھا، تاکہ وہ عالمی اقتصادیات پر اجارہ داری قائم کریں اور عالمی سیاست کی زمام کار پر قبضہ جما سکیں۔ یہ مقصد خواہ بربریت وسفاکی سے حاصل ہوں یا لاقانونیت اور انارکی سے، خواہ نفاق وافتراق اور تصادم سے حاصل ہوں یا اخلاق باختگی اور جسم فروشی سے یا اباحیت اور مفسدانہ نظریات کی اشاعت سے، اس بھیانک منصوبہ دستاویز پروٹوکولز کو خفیہ رکھنے کی یہودیوں نے ہر ممکن کوشش کی مگر اس کے بعض حصے آشکارا ہوگئے اور یہودیوں کے مکروہ چہرے بے نقاب ہوگئے۔ اس پروٹوکولز کا عربی ترجمہ پروفیسر محمد خلیفہ تونسی نے کیا اور اس کا مکمل تعارف کرایا۔ ذیل میں اس تعارف کا اردو ترجمہ پیش خدمت ہے (م)

زعماء یہود نے ۱۸۹۷ء سے ۱۹۵۱ء تک تیئس ۲۳ کانفرنسیں منعقد کیں۔ آخری کانفرنس پہلی مرتبہ ۱۴ اگست ۱۹۵۱ء کو القدس میں ہوئی تاکہ اسرائیل کی جانب مسئلہ ہجرت اور اسرائیل کی حدود اربعہ کا تعین جیسے مسائل طے کئے جا سکیں

ان کی پہلی کانفرنس سوئزرلینڈ کے شہر تال میں ان کے لیڈر ہرتزل کی صدارت میں ۱۸۹۷ء میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں تین سو سربرآوردہ حکماء صیہون نے پچاس

یہودی جماعتوں کی نمائندگی کی تھی، اسی میں انھوں نے ایک خفیہ پروگرام طے کیا تھا جس کے تحت یہودی دنیا کو ایک نسل داود کی طرف لانا تھا۔ ان کے فیصلہ تمام حیلہ وتدابیر مخفی رکھے گئے۔ سوائے شرکار کانفرنس یا باہر کے معتمد افراد کے کسی کو ان کی ہوا نہ لگنے دی گئی۔ اس خیال سے کہ مبادا ان کے راز غیر یہودیوں پر کھل جائیں۔ لیکن اللہ کی مشیت یہ ہوئی کہ وہ سب مخفی نہ رہیں بلکہ بعض سے دنیا باخبر ہو جائے۔ اب جب کہ ان کی کچھ باتیں ظاہر ہو چکی ہیں وہ بھی پوری قوت و وضاحت سے ان باتوں کو منکشف نہیں کر پاتیں جواب بھی پردۂ خفا میں ہیں۔

ایک فرانسی خاتون کی ان کے بڑے لیڈر سے فرانس کی فری میسن تحریک کے ایک نہاں خانہ میں ملاقات ہوئی۔ دوران ملاقات وہ اس بات ہو سکی کہ ان وثیقوں میں سے بعض کو چرا کر فرار ہو جائے۔ یہ وہی مسروقہ وثیقے ہیں جو پروٹوکولز کی شکل میں ہمارے پاس ہیں۔

یہ وثیقے ایلکسن نکولا ینچ، مشرقی روس کے اعیان حکومت کی تنظیم کے صدر کے ہاتھ لگے۔ بادشاہت کا دور تھا، اس نے ان کی خطرناکی اور یہود کی شرارت آمیز نیتوں کا اندازہ لگایا جو پوری دنیائے انسانی بشمول روس کے خلاف تھیں۔ پھر اس نے انھیں ایسے امانت دار ہاتھ میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا جو خود اس کی بہ نسبت ان سے مستفید ہونے اور انھیں شائع کرنے کا زیادہ اہل تھا۔ اس نے انھیں ایک روسی عالم جلیل ترجی نیلوس کے سپرد کیا۔ علامہ نیلوس نے ان کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور اس کے سیاسی حوادث پر ان کا انطباق کرکے دیکھا اور ان میں مضمر خطرات کا مکمل ادراک کر لیا، اس آگاہی کے طفیل انھوں نے ان عظیم حادثات کے بارے میں قبل از وقت خبر دی جو سالہا سال بعد وقوع پذیر ہوئے سارے حادثے ان کے اندازوں کے مطابق واقع ہوتے رہے۔ اور ان کی خوفناک گونج پوری دنیا میں سنائی دی، نیلوس کی پیش گوئیوں میں سے ایک عثمانی خلافت اسلامی کا زوال تھا۔ انھیں پیش گوئیوں میں یہ بھی ہے کے یہودی ارض فلسطین میں واپس آجائیں گے اور ان کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ یورپی بادشاہوں کا زوال ہو جائے گا۔ اس زمانے میں جرمنی اسٹریا، رومانیا، ہسپانیہ اور اٹلی میں بادشاہتیں بالفعل قائم تھیں۔ یہ بھی کے دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ عالمی جنگیں برپا ہوں گی۔ ان جنگوں میں غالب ومغلوب دونوں طرح کی قومیں یکساں خسارہ میں رہیں گی۔ اور مال غنیمت سے سوائے یہود کے کوئی اور بہرہ مند نہ ہو سکے گا۔ اس پیش گوئی کے مطابق دو عالمی جنگیں واقع ہو چکی ہیں اور اب یہود تیسری عالمی جنگ برپا کرنے کی

تدابیر کر رہے ہیں۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ امریکہ میں یہود کا نفوذ و اثر کسی دوسری اقلیت کے نفوذ جیسا نہیں ہے۔ وہ روس کی حکومت میں بھی اپنے خونیں پنجے گاڑے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں ملک دو عظیم طاقتیں ہیں اور یہود میدان جنگ کی طرف گھسیٹے لیے جا رہے ہیں تاکہ دونوں ایک ساتھ تباہ ہو جائیں۔ جب یہ مقصد حاصل ہو جائے گا تو یہود علی الاعلان عالمی حکومت کے مالک ہو جائیں گے۔ بجائے اس پس پردہ حکمرانی کے جو آج بھی انھیں عالم انسانی پر حاصل ہے۔ ایک پیش گوئی یہ بھی ہے کہ دنیا فتنہ و فساد سے بھر جائے گی، عالمی اقتصادی بحران پیدا ہو جائے گا اور اقتصادیات کی بنیاد اس سونے پر استوار ہو جائے گی جو یہود کے قبضہ و تصرف میں ہے وغیرہ۔ یہ ساری باتیں ایک شخص واحد کی حوادث عالم سے مکمل باخبری، اس کے پروٹوکولز کے عمیق و دقیق مطالعہ، اس کی سیاسی سوجھ بوجھ اور اجتماعیات کے فقیہانہ فہم و فراست پر دلالت کرتی ہیں۔

یہ کتاب (پروٹوکولز) ۱۹۰۱ء میں علامہ نیلوس کے ہاتھ لگی۔ اور ۱۹۱۲ء میں اس کے چند نسخے روسی زبان میں شائع ہوئے۔ یہود کی مجرمانہ نیتیں عالم پر آشکارا ہوگئیں اور خوف و دہشت سے ان پر جنونی کیفیت طاری ہوگئی۔ روس میں ان کے لیے مذبح خانے کھل گئے۔ ان میں سے صرف ایک مذبح میں دس ہزار یہودی قتل کیے گئے اور باقی اپنے محلوں میں محصور کر دیے گئے۔ بحران کا ایک بڑا لیڈر تھیوڈور ہرٹزل بابائے صہیونیت اٹھا، وہ اس فضیحت و رسوائی پر اپنا سر پیٹتا پھرتا تھا۔ اس نے بہت سے کتابچے شائع کیے اور ان کے ذریعہ اعلان کیا کہ قدس اقدس سے بعض خفیہ دستاویزات چرالی گئی ہیں، ان اہم دستاویزات کو غیر یہود، یہودی عوام اور یہودی اکابر تک سے مخفی رکھا جاتا تھا۔ اُن کے قبل از وقت شائع ہو جانے سے یہود دنیا بھر میں بدترین بدبختی کا شکار ہوگئے ہیں۔ بخلاف اس کے ہر جگہ یہودیوں نے یہ اعلان کرنا شروع کر دیے کہ پروٹوکولز سے ان کا کوئی علاقہ نہیں ہے بلکہ وہ شرارتاً ان کے سر منڈھ دیے گئے ہیں۔ لیکن اہل دنیا نے ان کے اس دعوے کی تصدیق نہیں کی وجہ یہ تھی کہ پروٹوکولز کے منصوبے اور اس وقت دنیا میں جاری و ساری حوادث میں یک رنگی و ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ ممکن نہیں کہ یہ واقعات اتفاقاً تنہا مصلحت یہود سے ہم آہنگ ہوگئے ہوں۔ یہ وہ بین دلائل اور واضح قرائن ہیں جن سے انکار کی گنجائش ہے نہ شک و شبہ کی۔ اہل دنیا نے یہودیوں کے دعووں کو نہیں مانا، اور اس بات پر مضبوط یقین کے ساتھ جم گئے کہ پروٹوکولز یہودیوں کے کرتوت ہیں۔ پروٹوکولز کی بھی عام اشاعت ہوئی اور روس کی مختلف زبانوں میں ان کے تراجم بھی اور ساتھ یہود کی

قتل گاہیں اور مظالم کی داستانیں پوری سلطنت روس میں عام ہوگئیں، اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ایک ہی مذبح میں دس ہزار یہودی قتل کئے گئے اور باقی اپنے محلوں میں محصور کر دیے گئے۔

یہود نے اپنی جانیں بچانے اور بدنامی کے داغ دھونے کے لیے کوشش بلیغ کی۔ بازاروں سے کتابوں کے نسخے بہ قیمت خریدنا شروع کیے حتیٰ کہ عاجز آگئے۔ پھر انھوں نے اپنا سونا، اپنی عورتیں، اپنی دھمکیاں، اپنے علماء اور اپنی تنظیمیں یورپ کے جملہ ممالک بشمول برطانیہ میں پھیلا دیے۔ تاکہ روس پر سیاسی دباؤ ڈلوائیں، قتل گاہیں موقوف ہوں، پروٹوکولز کی اشاعت رکے، یہ مقصد بڑی سخت جد و جہد کے بعد ہی انھیں حاصل ہو سکا۔

لیکن نیلوس نے ۱۹۰۵ء میں پھر اسے اپنے مقدمہ اور حاشیوں کے ساتھ شائع کیا۔ یہ طباعت بھی عجیب سرعت اور خفیہ ذرائع سے غائب ہوگئی۔ یہود نے اس کے نسخے خرید خرید کر جلا دیے۔ پھر یہ ۱۹۱۱ء میں طبع ہوئی، اس مرتبہ بھی سب ہی نسخے غائب ہوگئے پھر ۱۹۱۷ء میں چھپی تو اس پر بالشیوک اشتراکیوں نے قبضہ کر لیا، تحریک (بالشیوک کمیونزم) کے قائد کھلے یا چھپے یہودی تھے یا پھر ان کے ساختہ پرداختہ لوگ، تب ہی سے سرزمین روس سے پروٹوکولز غائب ہیں اور اب تک غائب ہیں۔

روسی طباعت کا ایک نسخہ برطانوی عجائب خانہ میں لندن پہونچا۔ اس پر عجائب خانہ کی مہر لگا دی گئی اور اس کے حصول کی تاریخ ۱۰ اگست ۱۹۰۶ء اس پر ثبت کر دی گئی، یہ نسخہ روس کے کمیونسٹ انقلاب ۱۹۱۷ء تک بے مصرف پڑا رہا، ازاں بعد اخبار مارننگ پوسٹ Morning Post شائع ہونے لگا۔ مارسڈن اس کے نیوز رپورٹر مقرر ہوئے تاکہ اشتراکی انقلاب روس کی خبریں فراہم کریں، اپنے سفر روس سے پہلے انھوں نے بہت سی روسی کتابوں کا مطالعہ کیا انھیں میں پروٹوکولز کا وہ نسخہ بھی تھا جو برطانوی میوزیم کی زینت بنا ہوا تھا۔ اسے انھوں نے بغور پڑھا اور اس کے خطرہ کو محسوس کیا۔ انھوں نے ۱۹۱۷ء کی بابت اس کتاب کے روسی ناشر علامہ نیلوس کی اس انقلاب کے متعلق ۱۹۰۵ء کی پیشگوئی کو بھی دیکھا جو وقوع انقلاب سے بارہ سال قبل کی گئی تھی۔ نیوز رپورٹر موصوف میوزیم میں اس کتاب کے انگریزی ترجمہ اور اشاعت کے لیے معتکف ہوگئے۔ پھر تو اس کی طباعت و اشاعت بار رہا ہوئی۔ اس کی پانچویں اشاعت آخری بار ۱۹۲۱ء میں ہوئی۔ موجودہ ترجمہ اسی نسخہ کا ہے۔ لیکن اس کے بعد امریکہ یا برطانیہ کے کسی ناشر نے اس کی طباعت و اشاعت کی جرأت نہیں کی۔ جیسا کہ انگریز معاصر مورخ علامہ

ڈگلس ریڈ نے اپنی کتاب معاصر خفیہ تحریکیں' میں کہا ہے کہ ناشرین کی ہر پُرفریب خاموشی کے پیچھے یہود کی انگلیوں کے اشارے صاف دکھائی دیتے ہیں۔

۱۹۱۹ء میں کتاب جرمن زبان میں طبع ہوئی، برلن سے اس کی اشاعت ہوئی جب اس کے بیشتر نسخے جمع کر کے غائب کر دیئے گئے تو اس کی اشاعت روک دی گئی۔ یہ گویا مظاہرہ تھا جنگ عظیم اول کے پہلے جرمنی میں یہود کے اثر و نفوذ کا ۱۰اس کے بعد تو انھیں جرمنی پر مکمل فتح حاصل ہوگی۔ جنگ کے دوران ہی ان کی فتح کا دور شروع ہو رہا تھا، ان کے ہتھکنڈے اور دسیسہ کاریاں جنگ کے زمانے ہی میں سیاسی لیڈروں سے تجاوز کر کے جرمنی کے فوجی کمانڈروں اور بحری بیڑوں تک میں سرایت کر گئی تھیں۔ یہی اس خوفناک جنگ میں جرمنی کی شکست کا باعث ہوئی اس شکست کی کھلی ہوئی علامت تھی معرکۂ جتلینڈ Jut land (۱) میں جرمن بحری بیڑے کی پسپائی جب کہ بظاہر وہ انگریزی بیڑے کے مقابلے میں کامیاب نظر آتا تھا۔ برطانیہ نے اس کتاب کی پانچویں اشاعت کے مقدمہ میں معرکۂ جتلینڈ اور اس کے نتائج کے ذکر میں اس بات کی شہادت دی ہے کہ پروٹوکولز کی یہود سے نسبت اور ان کے پروگراموں کی ان سے مطابقت صحیح ہے۔ اگرچہ انھوں نے عالمی جنگ عظیم اول کی ذمہ داری، روس کا زوال، جرمنی کی شکست اور جنگ کے بعد کے بدترین حالات جو اتحتی سیارچہ کے چپے چپے پر پھیل گئے تھے۔ سب کی ذمہ داری روس کے سر ڈال دینے میں مبالغہ سے کام لیا ہے۔

یہودیوں کی پروٹوکولز کے معاملہ کو نگاہ عالم سے اخفاء کے سلسلے میں سخت ترین کوششوں کے باوجود اس کے تراجم مختلف زبانوں اور ملکوں میں جنگ عظیم کے بعد شائع ہو گئے۔ اس معاملہ میں فرانس، اٹلی، پولینڈ اور امریکہ سرفہرست ہیں، ان جملہ ممالک میں ان کی اشاعت

---

(۱) جنگ عظیم اول میں معرکۂ جتلینڈ سب سے بڑا بحری معرکہ تھا جو برطانوی بحری بیڑے زیر کمان امیرالبحار فلیکو، اور جرمن بحری بیڑے زیر کمان امیرالبحار شیر، کے مابین واقع ہوا اور جرمنی کی شکست پر منتج ہوا جب کہ جرمن بیڑا موقعہ جنگ سے اپنے ہیڈ کوارٹر کی طرف پسپا ہو گیا جبکہ وہ برطانوی بیڑے کے دو بڑے جہازوں کو ڈبو چکا تھا۔ اس فریب کارانہ شکست میں یہود کی سازشوں کو بڑا دخل تھا۔ اس لیے کہ وہ جرمنی سے اس ذلت کا انتقام لینا چاہتے تھے جو انھیں جرمنی میں اٹھانی پڑی تھی جرمنوں نے انھیں جلاوطن کر دیا تھا اور سامی یا یہودی عداوت سے جرمنی کو جو خطرات لاحق تھے انھیں منظر عام پر لے آئے۔

اور اشتعال انگیزی عام ہوگئی۔ لیکن بہت تیزی سے اور محیر العقول ترکیبوں سے جیسے ہی یہ کتابی صورت میں منظر عام پر آتے اس کے نسخوں کو چھپا دیا جاتا۔ فرانس کے ایک قدیم جریدے نے موامرۃ الیہود کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی اور اس کے ساتھ کتاب پروٹوکولز بھی تھی لہٰذا یہودیوں نے مختلف طریقوں سے اس کے ممنوع قرار دے جانے کی کوشش کی لیکن یہ تدبیر ناکام ہوگئی تو انھوں نے اس کا مطبع ہی جلا ڈالا۔

ہم اس کتاب کی ایک سے دوسرے ملک کو رحلت اور اس کے ظہور و اخفا کے واقعات کا احاطہ نہیں کرسکتے۔ البتہ یہاں ہم اس کے متعلق بعض وہ واقعات جو برطانیہ میں گذر کی طرف اشارہ کریں گے۔ ہمارے لیے یہی کافی ہے کہ ان قطرہ ہائے خون کی تصویر کشی کریں جو جنگ عظیم کے بعد لکھنے والوں کے قلم سے ٹپکے ہیں۔ جنگ عظیم جس کے شعلوں نے عظیم قوموں کو بلا لحاظ اس کے وہ چھوٹی ہوں یا بڑی جھلس کے رکھ دیا ہے۔ اس جہنم کے شعلوں نے ان کے جوان خون کے خزانے ان کے اخلاق، ان کے عقائد، ان کے روابط اور ان کے اموال سب کچھ کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ اس جہنم سے اگر کوئی صحیح سلامت مال غنیمت کے ساتھ لوٹ سکا تو وہ صرف یہود تھے۔ ایک برطانوی اہل قلم لکھتا ہے کہ اس وقت صرف ایک آواز فضا میں گونج رہی ہے: یہودیت سب پر فائق ہے۔ جرمنی کا یہ نعرہ کہ جرمنی سب پر فوقیت رکھتا ہے، ذہنی خوردگی کی ایک علامت تھا۔ جرمنی نے یہ نعرہ اس وقت لگایا تھا جب ۱۸۷۱ء کی جنگ میں اسے فرانس پر فتح حاصل ہوئی تھی اور جرمن بادشاہ ملک بروسیا کی شہنشاہی کا اعلان جو اس کی رسم تاج پوشی کے جشن کے موقعہ پر قصر ورسائی (VERSAILLES) میں کیا گیا تھا۔ یہ شہر مملکت فرانس کے دل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے بعد جرمنی نے اس نعرہ کو اپنے قومی ترانے کا عنوان بنا لیا تھا۔ یہ عنوان اس وقت تک قائم رہا جب تک جنگ عظیم میں جرمنی شکست سے دوچار نہ ہوگیا۔

ایک برطانوی اہل قلم نے اپنی قوم کو یہ خبر بد سنائی کہ اس وقت اس کا مقابلہ یہودی خطرہ کے علاوہ جرمن خطرہ سے ہے جو ان پر اس جنگ میں غالب آ گیا تھا۔ یہودی خطرہ اگرچہ خفیہ اور بڑا تھا لیکن وہ جرمن خطرہ کو بڑھنے کی مہلت دئے ہوئے تھا۔ اس وقت اس اہل قلم کی قوم کے پیش نظر اس تعلق کی نوعیت پر تھی جو صیہونی پروٹوکولز اور روس کے بالشیوک نظام کے آگے سقوط کے مابین تھا۔ بالشیوک تحریک کی اکثریت یہود پر مشتمل تھی جو شاہی نظام کے خاتمہ کے بعد ۱۹۱۷ء میں غالب آگئے تھے۔ سقوط روس کے حادثہ سے لوگوں کے کان

گونج رہے تھے اور ان کے دلوں پر ایسا خوف طاری ہوگیا تھا جیسا کہ اس وقت کا منظر پیدا کرتا ہے جب ایک بڑا پہاڑ ٹوٹ کر اس بحر ذخار میں جا گرا ہو اور اس کے بعد سمندر کی خوفناک موجیں جھاگ اڑاتی اور شور مچاتی ہوئی اٹھ اور گر رہی ہوں۔ روس میں بالشویک یہودی مظالم کے ابتدائی واقعات سے اپنی مسکین و دردمند قوم کے غم میں آزاد قوموں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ وہ قومیں جو شاہی نظام کی اذیت ناک دھوپ میں تلملا رہی تھیں۔ اور نجات پانے کے لیے بے چین تھیں۔ یہودی اشتراکی جہنم میں جا گریں۔ اور پروٹوکولز کے ظہور کے بعد ابھریں اور اپنی قربانیوں سے اس جہنم کو بھڑکانے میں لگ گئیں۔ ان پروٹوکولز کے منصوبوں کی وحشیانہ تکمیل انھیں مسکین قوموں سے ہوئی۔ ان کی زبانیں کھلے یا چھپے۔ جملہ یورپی اقوام بشمول ان قوموں کے جو روس کے کیمپ سے وابستہ ہوگئی تھیں یا مشرقی اور وسطی یورپ میں روس کی سرحدوں سے قریب آباد تھیں کھل گئیں۔ ان کا طریق کار تھا احتجاج، فتنہ و فساد، ہڑتالیں اور پر فریب قتل۔ اور مقصد تھا کسی ملک کی وطنی اور انسانی قوت کو اس طرح ختم کر دینا کہ وہ ذلیل ہو کر بالشویک یہود کے قدموں میں جا گرے۔

اسی طرح بعض ان اہل قلم کو تنبیہ ہوئی جنھوں نے بالشویک ہیئت اور صیہونی پروٹوکولز کو ہم زاد قرار دیا۔ انھوں نے پروٹوکولز کو بالشویک انجیل کا نام دیا۔ اس لیے کہ بالشویک اور پروٹوکولز میں انھیں عجیب سی ہم رنگی و ہم آہنگی محسوس ہوئی۔ اسی انگریز اہل قلم نے یہود کی مشکلات و حرکات و اعمال کو بھی بغور دیکھا تھا۔ جو انھوں نے پروٹوکولز کی ان کی طرف نسبت کے معاملہ میں اختیار کی تھیں، ان کے مزعومات کو متعدد دلائل سے جھٹلایا تھا۔ پروٹوکولز کی ۱۹۰۱ء کی پیش گوئیوں اور عذاب کے ان تیروں میں جو یہود نے پوری دنیا پر برسائے مثلاً بالشویک یہودی فتنہ ــ روس اور اس کے بعد جملہ اقوام یورپ میں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے فتنے ۔ اس اہل قلم نے اپنے ہم وطنوں اور جملہ عیسائی قوموں کو اس شیطانی، وحشی، اندھے فتنوں کی درد انگیز باقیات سے آگاہ کیا۔ جو انھوں نے روس سمیت پوری قوموں میں اٹھا رکھے تھے۔ لیکن یہودی بالشویک خطرہ، اس کی دسیسہ کاریاں، اس کی شدت، اس کا فریب اور اس کا سوتا ایسے ذرائع تھے جنھوں نے انھیں ان کے گھونسلوں میں مضبوطی سے جمائے رکھا۔

اس وقت بعض سیاست دانوں نے بڑی کوتاہ نظری سے کام لیا۔ انھوں نے گمان کیا کہ روس بہت

دور ہے۔ ہمارے ملک کو اس سے کوئی خطرہ نہیں۔ بعض دوسرے سیاست دانوں نے خطرہ کی کمین گاہ کا اندازہ کرلیا اور روس کی دوری سے انھوں نے دھوکا نہیں کھایا۔ لیکن آزاد قوموں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ اور اپنے بچے کھچے کپڑے اپنی آنکھوں پر لپیٹ لئے تاکہ جنگ کی آوازیں سنیں نہ میدان جنگ کو دیکھیں۔ انھیں جنگ عظیم اول میں فتح حاصل ہوچکی تھی جو پانچ برس جاری رہی تھی اور جس نے جنگ قوموں کو مضمحل کردیا تھا۔ خواہ غالب رہی ہوں یا مغلوب۔

یہ ایک انگریز اہل قلم کے مضمون کے اقتباس کا ترجمہ ہے۔ ہمارے خیال میں اس نے اس موقف کے مکمل تصور کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ مئی ۱۹۲۰ء میں جریدہ ٹائمز (Times) نے ایک مقالہ یہودی خطرہ کے متعلق زیر عنوان بے چینی کا پیغام دعوت تحقیق شائع کیا۔ اس کے بعد جریدہ مارننگ پوسٹ (Morning Post) نے اپنی ۱۲ر جولائی کی اشاعت میں ایک نہایت کمزور سی تحقیق زیر عنوان " سرخ پردوں کے پیچھے ایک مضطرب دنیا' شائع کی۔ اسی صحافی نے پروٹوکولز کا نام بالشیویک انجیل' رکھا۔ یہ اسی کا رکھا ہوا نام ہے اور بیش قیمت ہے۔

رہے یہود سو وہ قدامت پسند (orthodox) ہوں یا تجدد پسند (unorthodox) اپنی مصلحت اور ضرورت کے تحت پروٹوکولز کی ان کی طرف نسبت سے انکار ہی کرتے رہے اور جعلی بتاتے رہے

ٹائمز (Times) کے صحافی کے بقول ممکن نہیں کہ کوئی پروٹوکولز کے آئینہ میں سوویت روس کو دیکھ نہ سکے بالکل اس طرح کوئی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ سوویت روس کے سارے کے سارے کمشنر یہودی ہیں۔ صحافی مذکور آگے رقم طراز ہے "ان پیشگوئیوں کو کیونکر چھپایا جاسکتا ہے جن کا ایک حصہ پورا ہوچکا ہے جبکہ دوسرے حصے تکمیل کے مرحلے میں ہیں؟ کیا ہم اس المناک مدت میں اس لیے جنگ کرتے رہے ہیں(۱) کہ اس خفیہ تنظیم کو مکمل

---

(۱) انگریز صحافی کی مراد ہے: برطانیہ اور جرمنی کی جنگ — عالمی جنگ عظیم اول — تاکہ جرمنی کے سارے عالم انسانی پر تسلط کے تصور سے نجات پائے برطانیہ نے جرمنی کے حریصانہ اقدام سے نجات پالی لیکن سارے دنیا کو یہود کے چنگل میں دے دیا اور خود بھی اسی میں پھنس گئے۔ یہ لوگ بہر حال جرمنی کی بہ نسبت زیادہ طاقتور

دیں اور فنا کر دیں جو جرمنی کے دنیا پر تسلط کے لیے سرگرم عمل ہے؛ ہمارا ہدف اس کے سوا کچھ اور ہے کہ ہم نے اپنے وطن عزیز کی رگ رگ کا خون اس لیے نچوڑ دیا ہے کہ سلامتی بر جرمنی کے خطرہ سے مامون ہو جائیں اور وہ بھی صرف اس لیے کہ سلامتی بر یہود، کے بھنور میں پھنس جائیں؟

پروٹوکولز کی بنیاد پر مستقل معرکے پروٹوکولز نے جو معرکے برپا کیے وہ ختم نہیں ہوئے بلکہ مستقل جاری ہیں کبھی سست روی سے اور کبھی تیز گامی سے۔ جب کبھی یہودیوں کی فتنہ پردازی برطانیہ کی مصلحتوں سے ٹکراتی ہے عالمی ہیجانات مثلاً بغاوتیں انقلابات، قحط، اقتصادی، سیاسی، اجتماعی اور فکری بحران وغیرہ کی صورت میں دیگر نیا معرکہ برپا ہو جاتا ہے۔ وہ جرائد جن پر قابو پانے میں یہودی کامیاب نہیں ہو سکے ہیں ان میں سر فہرست مارننگ پوسٹ اور ٹائمز ہیں جو پروٹوکولز کے متعلق معرکوں کو دہراتے رہتے ہیں ان کی آ گونج دوسرے جرائد میں بھی سنائی دیتی ہے۔ ان میں لکھنے والے سوچنے والے اور بانی اس معاملہ کو نظر انداز نہیں کرتے بلکہ وہ ان معرکوں میں اپنی کتابوں اور مقالوں کے ذریعہ برابر کے شریک ہو جاتے ہیں اس بات کی اطلاع ہمیں ایک جری انگریز مورخ ڈگلس ریڈ، مصنف کتاب "من الدخان الی الخنق" (دھوئیں سے دم گھٹنے تک) نے معاصر خفیہ تحریکوں پر بحث کرتے ہوئے دی ہے۔

پروٹوکولز سے متعلق معرکوں میں عالمی جنگ عظیم ثانی کے دوران شدت سے اضافہ ہوا جب کہ یہودیوں نے یہ تدبیر کی کہ برطانوی حکومت کو دولت اسرائیل کے قیام، عربوں کی فلسطین سے جلاوطنی اور سرزمین مصر کے مشرقی علاقہ سینائی میں فوجی کیمپ قائم کرنے کے حق میں مسخر کریں، اور اس طرح برطانیہ کی مصلحت، نیک نامی اور ہیبت کو بے اثر کر دیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اسرائیلی تنظیموں نے اس مقدس سرزمین میں فسادات برپا کیے۔ ان برطانوی فوجوں کو قتل کیا جو ان کی حامی تھیں اور اسرائیلی حکومت کے قیام کے لیے عراقوں اور دیگر ملکوں کے علی الرغم راہیں ہموار کر رہی تھیں۔ اپنی دشمنی کے جذبہ سے مغلوب ہو کر انھوں نے انگریزوں اور

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) اور زیادہ خطرناک ہیں۔ اس جگہ ہم اضافہ کرنا چاہیں گے کہ برطانیہ نے نے غلطی کی، جنگ عظیم ثانی کے بعد انھوں نے بڑی طاقتوں روس، امریکہ، فرانس کے ساتھ مل کر یہود کی ایک حکومت بنام اسرائیل قائم کر کے انھیں اور مستحکم کر دیا اور ان کے دنیا کو غلام بنا لینے کے عزائم کو اور بڑھا دیا۔

میں ذرا فرق روا نہ رکھا۔ بلکہ ہر اس برطانوی کو قتل کیا جس نے ان کی مجرمانہ سیاست میں ان کا ساتھ دینے سے گریز کیا، اس طرح کے واقعات کے پس پشت دہشت پسندوں کی قتل و غارت گری کی وارداتیں ہیں اور مصر میں برطانوی وزیر توین کا قتل ہے اس لیے کہ وہ ان تنظیموں سے ان کی بدنام زمانہ اور باغیانہ مطالبات کی مہم میں غیر جانبدار رہا تھا۔ اس قتل کی وجہ سے مصر بڑی بدبختی کا شکار ہو گیا۔

اسرائیلی جماعتوں کے ہاتھوں برطانوی۔ فوجی ہوں یا شہری۔ کے قتل کی وارداتوں، ان کے پیداواری مرکزوں کو اجاڑنے اور ان کے اسلحہ خانوں اور گوداموں پر دست درازیوں کے واقعات نے برطانوی حکومت کے با اختیار سیاستدانوں، وزراء، ارکان پارلیمنٹ وغیرہ کے غیظ و غضب کو بھڑکا دیا۔ لیکن عالمی صہیونیت کے یورپ اور امریکہ میں اثر و نفوذ کے آگے نہ صرف صہیونی تنظیموں سے قصاص لینے اور ان کی تباہ کن حرکات پر روک لگانے میں ناکام رہے، جو عرب اور برطانیہ دونوں کے خلاف تھیں، بلکہ اس میں بھی ناکام رہے کہ اپنی حکومت کو ان جماعتوں کی مسلسل دست گیری و پشت پناہی سے روک سکیں بغیر اس مساعدت کے ناممکن تھا کہ وہ اپنی دشمنی کو خود برطانیہ اور عرب کے خلاف جاری رکھ سکیں۔ یہی وہ مسلسل دستگیری تھی جس نے ان کی سرکشی کو قوت بخشی حتیٰ کہ حکومت اسرائیل قائم ہو گئی۔ جو اسی وقت سے اب تک قائم چلی آتی ہے۔

اس سب کے باوجود سیاست دانوں، صحافیوں، فلسفیوں اور ادیبوں میں سے جرأتمند لوگ برطانیہ میں اپنے ملک و دین کے خلاف صہیونی سازشوں کی بات ظاہر کرتے اور دہراتے رہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح یورپ اور امریکہ اور مشرق ادنیٰ میں یکساں طور پر اٹھنے والے عالمی فتنے اور یہودی لیڈروں کے بیانات ان سازشوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ وہ مسلسل ان سازشوں کی ظاہری صورت میں جو ان فتنوں اور بیانات میں نمایاں ہوتی ہے، اور اس صورت میں جو خفیہ دستاویزات مع پروٹوکولز سے ملتی ہے موازنہ کرتے رہتے ہیں۔ اور اپنی اس دیدہ ریزی سے بڑے مبسوط نتائج نکالتے رہتے ہیں۔

یہ بات عام طور سے مشہور ہے کہ جس کسی نے پروٹوکولز کا ترجمہ کر کے یا کسی اور طرح شائع کیا اس کا چراغ زندگی گل کر دیا گیا۔ خواہ قتل کر کے یا بظاہر طبعی موت کی نیند سلا کر۔

میں نے کتاب کا مطالعہ شروع کیا تو میں نے دیکھا کہ وہ سب لوگ جنہوں نے اس کے تراجم انگریزی فرانسیسی، ہسپانوی اور اطالوی زبانوں میں کیا تھا قتل کر دئیے گئے تھے اور وہ

سب جریدے جن کے ذریعہ اس کی اشاعت کی گئی تھی برباد کر دیئے گئے تھے۔ اس لیے یہود اس بات کی بڑی تمنا رکھتے ہیں کہ پروٹوکولز نایاب ہی رہیں۔

کتاب پروٹوکولز کی نایابی یہود کی اس کی اشاعت کو روکنے کے وسائل

مندرجہ بالا وجوہ سے اس کتاب کے نسخے بہت کمیاب بلکہ نایاب ہیں، شاذ ہی کہیں ایک آدھ نسخہ مل جائے۔ اس کے متعلق یہ جان لینا ہی کافی ہے کہ اس کے صفحات سو سے کچھ اوپر درمیانی سائز کے ہیں اور اس کے ٹائپ شدہ نسخے انگلی گنی میں فروخت ہوتے ہیں۔

جیسا کہ جب بھی کوئی اس کتاب کو چھاپنے کی جرأت کرتا ہے صیہونیوں اور ان کے چیلوں کے حملوں کا نشانہ بن جاتا ہے۔ جب میں نے یہ کام شروع کیا اور جریدہ الشرق میں اسے قسطوار چھاپنا شروع کیا تو فرانسیسی زبان میں شائع ہونے والے دو جریدے مجھ پر مختلف تہمتوں کے ساتھ حملہ آور ہوئے۔ یہ حملے میری توقع کے عین مطابق تھے میں تو ان کا منتظر ہی تھا۔ میں نے انھیں اہمیت دی نہ جواب ہی دیا نہ مجھے کوئی پریشانی لاحق ہوئی یہودی اپنی طرف اس کتاب کی نسبت سے برابر برات کرتے رہے ہیں اور جب بھی یہ شائع ہوئی اس کے نسخے بازاروں سے غائب کر دیتے رہے۔ یہی اس وقت ہوا جب نیلوس نے پہلی مرتبہ سے روس میں شائع کیا، جب یہ انگلینڈ میں انگریزی میں شائع ہوئی اور رسائل جرائد نے اس کا چرچا شروع کیا تو یہودیوں نے مجلس عوام (House of commons) میں اپنے مددگاروں کے ذریعہ کوشش کی کہ وزیر داخلہ اس کی اشاعت پر پابندی لگا دیں۔ لیکن وزیر داخلہ نے انکار کر دیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ انھیں ایسی پابندی لگانے کا اختیار نہیں ہے۔ یہ کتاب چونکہ یہود کے خلاف ہے اس لیے انھیں کی یہ ذمہ داری ہے کہ عدالت سے رجوع کریں اس جواب سے یہودیوں کے ہمدرد خاموش ہو گئے۔ جب مجلس عوام میں ان کے وکلا کی اس طرح شکست ہو گئی تو یہود کے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ کتاب کے نسخوں کو خرید لیں پھر اہل قلم کا ضمیر مال اور عورتوں کے عوض خریدیں تاکہ ان پر جو پے در پے حملے ہو رہے تھے موقوف ہوں۔ پھر انھوں نے سب وشتم کے گندے ہتھیار استعمال کرنا شروع کئے۔ یہی عمل انھوں نے میرے معاملہ میں دہرایا۔

اسی طرح فرانس میں جب یہ شائع ہوئی تو انھوں نے فرانس کی حکومت پر دباؤ ڈالا کہ اس اشاعت کو روکیں لیکن ناکام رہے۔ یہاں بھی انھیں معاملہ کو عدالت میں لے جانے کا مشورہ دیا گیا۔ لیکن سوئٹزرلینڈ کے علاوہ انھوں نے کہیں بھی عدالت میں جانے سے احتراز کیا اس لئے کہ عدالت کا فیصلہ پروٹوکولز

کے فضیحت آمیز رسوا کن مندرجات کو انھیں کے سر ڈال دیتا۔ لہٰذا عدالت میں جانے سے تو انکار ہی کرتے رہے البتہ عورت مال و دولت کے علاوہ بھی بہت سے ذرائع تھے جنھیں یہود نے کتاب کی اشاعت اور اثر اندازی کو روکنے کے لیے اختیار کئے۔ اور انھیں بس ایک محدود دائرے میں محصور رکھنے پر مصر رہے۔ وہ دیگر ذرائع خود پروٹوکولز اور ان کی مقدس کتابوں نے تجویز کر رکھے تھے مثلاً دہشت گردی، تخویف، مجرمانہ قتل وغیرہ کے حربے ہر خطرناک دشمن سے خلاصی پانے کے استعمال کئے گئے۔ اس کام میں ان کے امام حضرت موسیٰؑ کی وہ تصویر تھی جو توراۃ نے بنائی تھی۔ جب موسیٰ نے دیکھا تھا کہ ایک قبطی اور ایک اسرائیلی آپس میں لڑ رہے ہیں تو انھوں نے ادھر ادھر دیکھا جب دیکھا کہ کوئی دیکھ نہیں رہا ہے تو اس مصری کو قتل کر کے ریت میں دبا دیا۔ یہ کہانی ان کی مقدس کتاب شریعت میں درج ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ طریقہ جسے اختیار کرکے وہ ہر دشمن سے خلاصی پا سکتے ہیں تو اسی خوفناک طریقہ کو اختیار کرکے انھوں نے بیشتر آزاد اہل قلم کو غائب یا قتل کر دیا۔ یا وہ بظاہر طبعی موت مرے یا مارے گئے لیکن عجیب حالات میں اور عجیب تر طریقوں سے جن کا سمجھنا امر محال ہے۔

۷۔ کتاب (پروٹوکولز) کی قسمیں اور عنوانات:

استاذ نیلوس نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ دستاویزوں کی قسموں میں منطقی ربط و تسلسل نہیں پایا جاتا ہم کہتے ہیں کہ اس کے موضوعات بعد میں داخل کئے گئے ہیں۔ اس کے مصنفوں نے ہر موضوع پر ایک یا زیادہ پروٹوکولز میں مسلسل بحث نہیں کی ہے اور نہ انھیں ایک عنوان کے تحت رکھا ہے۔ بلکہ ایک ہی موضوع پر مختلف مواقع پر الگ الگ انداز سے بحث کی ہے۔ کبھی کسی مناسبت کے سبب اور کبھی مناسبت کے بغیر ہی۔

مجھے پروٹوکولز کے لیے کوئی الگ مستقل عنوان نہیں ملا جو اس کے موضوع و مضمون کی طرف راہنمائی کرتا ہو۔ اپنی کتاب میں منقولہ دستاویزوں کے لیے ہم نے دو عنوان تجویز کئے ہیں پروٹوکولات حکماء صیہونی یہی مشہور عنوان ہے جو مختلف لغات والے تراجم میں اختیار کیا گیا ہے۔ خود یہ عنوان بھی محل نظر ہے کبھی تو اس کے معنی ہوتے ہیں کسی جلسہ میں پیش کیا ہوا لکچر۔ استاد نیلوس نے چونکہ یہی نام تجویز کیا ہے اسی لیے بعض مترجمین کو دھوکا ہوا کہ شاید فری میسن تحریک کے صیہونی زعماء نے متعدد جلسے کئے ہوں گے اور بحث و تمحیص کے

بعد بہت سی قرار دادیں منظور کی ہوں گی لہٰذا ان کے مجموعہ کا نام پروٹوکولز ہی مناسب ہے یہیں سے اس کا عربی ترجمہ قرارات اور مقررات کیا گیا۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے اس لیے دستاویزوں میں کہیں اس جانب اشارہ تک نہیں ہے۔ اور نہ مطالعہ ہی میں کوئی ایسی بات ملتی ہے جو اس طرف اشارہ کرتی ہو۔ استاد نیلوس نے خود ہی اس کی وضاحت کر دی ہے کہ یہ مجموعہ جلسوں کے رجسٹر کارروائی (MINUTES OF MEETINGS) جیسا نہیں ہے۔ بلکہ اس کی حیثیت ایک ذی اثر شخص کی تقریریں ہیں، اسی نے انھیں مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، اور ان میں منطقی ربط و تسلسل نہیں پایا جاتا۔ دراصل یہ دستاویزات ایک طویل لکچر کے اجزاء ہیں جنھیں ایک با اثر لیڈر نے مختلف مواقع پر اہل رائے کے جلسوں میں دیا ہے کہ ان مضامین کو تقریروں کے ذریعے لوگوں کے ذہن نشین کرے۔ اور لوگ متنفر ہو جائیں ان حالات سے جو آگے آنے والے ہیں حتیٰ کہ مملکت اسرائیل پوری انسانی دنیا پر تسلط حاصل کرے۔

ہمارا دوسرا عنوان الخطر الیہودی ہے جسے جریدہ مارننگ پوسٹ کے مراسلہ نگار استاذ فیکٹر مارسڈن نے اختیار کیا ہے۔ انھیں نے اس مجموعہ کا ترجمہ روسی زبان سے انگریزی میں کیا تھا۔ ہم نے بھی اس عنوان کو اختیار کیا ہے۔

فاضل مراسلہ نگار اپنے اجتہاد و اختیار میں صحیح نتیجہ پر پہونچا ہے۔ اس نے عالمی صیہونی تحریک کو جملہ یہود کی حمایت و تائید سے اس طرح الگ کر کے نہیں دیکھا جس طرح اس بھنور میں پھنسے ہوئے ان مسخروں کو دیکھا اور دیکھ رہا ہے جو انھیں ظالموں سے سیاست، نظام اجتماعی اور حرکات تاریخی کا درس لینا چاہتے ہیں۔ بغیر اس کے مہ فلسفۂ تاریخ کو سمجھیں اور ملکی یا عالمی حالات کے پس پشت کارفرما اسباب کو تلاش کریں۔ سارے یہودی صیہونیوں کی عالمی حکومت کے حصول کی کوششوں میں شریک کی حیثیت سے خواہ برائت کریں پھر بھی صیہونی تحریک کے برضا و رغبت ہاتھ مضبوط کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ ایسی کامیابی اور مساعدت کے خواہاں ہیں جو انھیں ان لوگوں کی دشمنی اور ان حکومتوں کی انتقامی کارروائی سے محفوظ رکھ سکے جس کے اقتدار و اختیار کے آگے وہ سرنگوں رہتے ہیں۔ بلاشبہ صیہونی تحریک دنیا بھر کے یہودیوں سے براہ راست استفادہ کرتی ہے۔ ان کی اور اپنی خواہشات کی تکمیل کی خاطر کوئی یہودی صیہونی پالیسیوں اور ان پر عمل درآمد کے مناسب وقت کے معاملہ میں کھلے چھپے اختلاف بھی کرتا ہے۔ لیکن مقصد سے ہرگز مخالفت نہیں کرتا نہ کر سکتا ہے اس لیے مقصد تو وہی ہے جو شریعت موسوی نے اس کے سامنے

اس وقت رکھا جب صیہونیوں کا کہیں وجود بھی نہ تھا۔ نہ اس کے وہم گمان ہی میں یہ بات تھی کہ کبھی وہ سخت آزمائشی حالات میں تحریک سے کنارہ کش ہو جائے گا۔ نہ ہی اس کے اعمال اور کوششوں کے محرکات تحریک کے اعمال کے اسباب سے مختلف ہیں۔ یہ اسباب و محرکات ہمارے لیے مقصد اور ذریعہ سے اہم تر ہیں۔ اس لیے کہ یہی اسباب تو ہیں جو ذرائع اور مقاصد کی حدود متعین کرتے ہیں، اور اسے قوت پہونچانے کے لیے ضروری غور و تدبر سے کام لینے پر آمادہ کرتے ہیں۔

کوئی یہودی یہ سب کچھ صیہونی تحریک پر ایمان کے تقاضے سے کرتا ہے نہ شریعت موسوی پر ایمان کے تقاضے سے بلکہ غیرت قومی کے تقاضے سے کرتا ہے جو کسی بھی یہودی کے دل سے تاریک سے تاریک یا روشن سے روشن حالات تک میں جدا نہیں ہوتی ہم نے دیکھا کہ یہودی ملحد نہ صرف ہر دین کے ہیں بلکہ حیات انسانی میں ہر دینی اساس کے بھی منکر ہیں اور ساتھ ہی صیہونی تحریک کے غالی علم بردار بھی ہیں۔ انھیں میں سے ایک علامہ دمہ تارکس بھی تھا۔ کھلا ہوا ملحد اور دین و اخلاق کی ہر غیبی اصل و بنیاد کا منکر۔ اس کے باوجود صیہونی تحریک کے بانیوں میں سے تھا، اور اپنی زبان و قلم کے ذریعہ اس کا زبردست داعی، اپنی تحریر و تقریر سب میں ظاہراً بھی اور باطناً بھی صیہونیت کا علم بردار خواہ قصداً خواہ بلا قصد۔ محض اپنے یہودی رجحان کے تقاضے سے جس کی جڑیں اس کے دل کی گہرائیوں میں جمی ہوئی تھیں، اور اس کے موزونی عقائد و رجحانات اور اسلوب زندگی سب میں پیوست۔ اس کے جملہ آثار و قرائن میں یہی چیز نمایاں ہیں

تنقید وتبصرہ

مضامین القرآن، مولف سید محمد جعفر فرید سلفی، صفحات، ۱۴۳،
قیمت، درج نہیں، ناشر سلفی اکیڈمی لہریا سرائے دربھنگہ (بہار)

لیتھو پریس سے چھپی ہوئی خوبصورت سرورق کے ساتھ یہ کتاب، مضامین القرآن، مصنف کی محنت وصلاحیت اور قرآن حکیم سے ان کی وابستگی کی طرف اشارہ کرتی ہے، کتاب کے نام سے بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اس میں قرآن کریم کے مضامین وموضوعات پر گفتگو کی گئی ہوگی اور ان کا احاطہ کیا گیا ہوگا، مگر ایسا نہیں ہے۔ بلکہ موصوف نے ایک خاص نقطہ نظر سے قرآن کریم کی آیات کا اشاریہ تیار کیا ہے، اور اسے مضامین القرآن کا نام دیا ہے۔ مقصد تالیف پر روشنی ڈالتے ہوئے مولف نے لکھا ہے" قرآن حکیم کے پھیلے ہوئے مختلف قسم کے مضامین کو خود سورۂ فاتحہ سے اخذ کردہ ابواب اور اس کی قائم کردہ فصلوں کے تحت جمع کرنے کا خیال پیدا ہوا، اس لئے کہ سورہ فاتحہ کو پورے قرآن میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور اسے ام القرآن، اساس القرآن، فاتحہ الکتاب الکنز، الکافیہ اور سورۃ الصلوۃ کہا جاتا ہے اور پورے قرآن حکیم سے اس کا تعلق اجمال وتفصیل کا ہے"

سورہ فاتحہ سے مصنف نے چار ابواب اخذ کئے ہیں اور ہر باب کی دو فصلیں قائم کی ہیں۔ پہلا باب، خالق انسان۔ اس کی دو فصلیں ربوبیت ورحمت ہیں، دوسرا باب" مقصد تخلیق انسان" اس کی دو فصلیں آخرت اور عبادت ہیں۔ تیسرا باب" مہتدین اور منعم علیہ انسان" اس کی دو فصلیں ہدایت ومنعمیت ہیں، چوتھا باب مغضوب وضالین انسان، اس میں صرف ایک فصل مغضوبیت ہے۔

قرآن کے بنیادی تصورات کو سمجھنے کے لیے مولف کا یہ اشاریہ قابل قدر کوشش ہے، اللہ ان کو جزائے خیر دے۔ اشاریہ میں صرف آیتوں اور سورتوں کے حوالہ پر اکتفا نہ کرکے اگر مولف ذیلی عنوانات بھی قائم کرتے تو کتاب کی افادیت بڑھ جاتی، اسی طرح سورہ فاتحہ ہی سے اخذ کرتے ہوئے کچھ اور اہم مضامین کو شامل کیا جاتا تو اچھا تھا۔ زبان وبیان میں بھی کچھ چیزیں قابل توجہ ہیں۔ نامانوس الفاظ کا استعمال مثلاً پورے قرآن کے بارے میں جانکاری ہوجائے گی ص۔ اس وقت کے سب سے مہان، نیک اور صالح بندے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ص۔ ہدایت" منعمیت ص۔ وغیرہ اسی طرح نبی اور اوتار کو ایک ہی حیثیت دینا" خدا کے ان منتخب بندوں کو مذہبی اصطلاح میں نبی اوتار اور پروفٹ کہا جاتا ہے ص۔ اوتار کا تصور یہ ہے کہ بھگوان انسان کے روپ میں آتا ہے جبکہ نبوت کا تصور یہ ہے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے کسی خاص فرد کو انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنا نبی بناتا ہے ـــــ کتاب کے آغاز واختتام پر مقدمہ اور تاثرات ہیں۔ امید ہے کہ کتاب سے فایدہ پہونچے گا۔

(محمد مسعود عالم قاسمی)

MONTHLY
ZINDGI-E-NAU
1525, SUIWALAN
NEW DELHI-110002

Regd. No. D.NO. (DN)-34
R.N. NO. 42893/84
DECEMBER 87

صرف ٹائیٹل دہلی آرٹ پریس میں چھپا